تصانیف احمدیہ

حصہ اوّل

جلد چہارم

مشتملبر

کتب و رسائل مذہبی

تفسیر القرآن

جلد اوّل

تفسیر سورۃ الفاتحۃ تفسیر سورۃ البقرہ

سنہ ۱۳۲۱ھ مطابق سنہ ۱۹۰۳ء

بفرمایش آنریری منیجر ڈپوٹی بک ڈپو مدرستہ العلوم علی گڈھ بتصحیح مولوی سید جلال الدین حیدر صاحب

در مطبع مفید عام آگرہ باہتمام محمد قادر علیخان صوفی طبع شد

فہرست مضامین لطیف

هو المستعان

تفسير القرآن

وهو

الهدى والفرقان

در مطبع مفید عام آگره باهتمام محمد قادر علیخان بخاری صورت طبع شد

سنہ ۱۳۲۱ھ

سورۃ الفاتحہ

(سورۃ فاتحہ) قرآن مجید کی سورتوں کو جو سورۃ کہتے ہیں، اسکی وجہ تسمیہ میں متعدد اقوال ہیں، سب سے صاف یہ ہے کہ سورۃ شہر کی فصیل کو کہتے ہیں جس سے شہر محدود ہوجاتا ہے، اُسی مناسبت سے قرآن مجید کی آیات معینہ محدودہ پر سورۃ کا اطلاق کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں بھی آٹھ جگہہ سورۃ کا لفظ آیا ہے، اگرچہ وہاں لفظ سورۃ سے قرآن مجید کی سورتیں جو سورتوں کے نام سے مشہور ہیں مراد نہیں ہے، بلکہ اُن سے قرآن مجید کا ایسا حِصّہ مراد ہے، جن میں کوئی پورا مطلب او رمنشا ربیان کیا گیا ہو، مگر جبکہ کوئی حِصّہ تعین کیا جاوے گا تو ضرور ہے کہ وہ بھی معین و محدود ہوگا، اسی مناسبت سے قرآن مجید میں اُسپر سورۃ کا اطلاق ہوا ہے، پس اُسی کی پیروی سے، اُن مجموعہ آیات پر، جو درحقیقت معین و محدود اور اپنے ماقبل و مابعد سے علحدہ ہیں، سورہ کا اطلاق کرنا، نہایت درست و صحیح ہے۔

قرآن مجید میں ایکسو چودہ سورتیں ہیں، اُن میں سے بجز اُنتیس کے جنکے ابتدا میں حروف مقطعات ہیں اور کسی کو خدا تعالیٰ نے کسی نام سے موسوم نہیں کیا۔ جسقدر نام سورتوں کے ہیں وہ سب بعد کے رکھے ہوئے ہیں، کیا عجب ہے کہ صحابہ یا تابعین یا تبع تابعین کے زمانہ ہی میں یہ نام مشہور ہوگئے ہوں، مگر ان میں سے کسی بات کا کچھ ثبوت نہیں ہے۔ حدیثوں میں جو ان سورتوں میں سے بعض کے نام آئے ہیں اگرچہ وہ حدیثیں ثابت نہیں ہیں، تاہم اگر اُن کو ثابت بھی مانا جاوے، تو اُس سے بجز اِس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، کہ راوی اخیر کے زمانہ میں وہ سورۃ اُس نام سے مشہور تھی۔

یہودیوں کا دستور تھا، کہ توریت کی سورتوں کو یا اُسکے شروع کے لفظ سے موسوم کرتے تھے، یا جس معاملہ یا مطلب پر وہ سورۃ دلالت کرتی تھی، اُسی میں سے کوئی لفظ لیکر اُسکا نام رکھدیتے تھے۔ مثلاً توریت کی پہلی سورۃ کے شروع میں لفظ "براشیث" בראשית آیا ہے، اُسکا نام اُنھوں نے "سورۃ براشیث" פרשה בראשית رکھا ہے، اور دوسری سورۃ میں حضرت نوح کا قصہ ہے، اُسکا نام "سورہ نوح" פרשה נח رکھا ہے۔ اُسی قاعدہ کے مطابق اہل اسلام نے بھی قرآن مجید کی سورتوں کے نام رکھے ہیں، اس سورۃ کا نام جو سورہ فاتحہ رکھا ہے، اِس لحاظ سے رکھا ہے کہ قرآن مجید اِس سے شروع ہوتا ہے، مگر یہ نام اُن ناموں میں سے نہیں ہے جو وحی سے ٹھیرائے گئے ہیں۔

سورہ فاتحہ

(اختلاف قرأت) جب قرآن نازل ہوتا تھا، تو متفرق ٹکڑوں پر لکھ لیا جاتا تھا، اور لوگ جو سنتے تھے اُسکو برزبان یاد بھی کر لیا کرتے تھے، مگر جیسا کہ عام قاعدہ فطرت انسانی کا ہے، برزبان یاد کرنے والوں کو پیش آتا تھا، یعنی جسکا حافظہ قوی تھا اُسکو نہایت صحت و ضبط کے ساتھ یاد رہتا تھا جسکا حافظہ قوی نہ تھا اُسکو ایسے ضبط سے یاد نہ رہتا تھا اور اس وجہ سے اختلاف قرأت پیدا ہو گئے تھے۔ کسی کو واو کی جگہ نے یاد رہگئی، کسی کو زیر کی جگہہ زبر، کسی کو سکون کی جگہہ تشدید، اور کچھ شبہہ نہیں کہ ایسا بھی ہوتا تھا، کہ کوئی شخص برزبان یاد رکھنے میں کوئی کلمہ یا آیت بھول گیا، یا کوئی غیر کلمہ اُسکی زبان پر چڑھ گیا، جو درحقیقت اُس میں نہ تھا، غرضکہ زبانی یاد رکھنے میں جو امور کہ مطابق فطرت انسانی پیش آسکتے ہیں اُس زمانہ کے لوگوں کو بھی پیش آتے تھے، مگر جو لغزشیں اس طرح واقع ہوتی تھیں اُن کے درست کرنے والے، یا تو وہ لوگ تھے جو نہایت صحت و ضبط سے یاد رکھتے تھے، یا وہ متفرق لکھے ہوئے پرچے تھے، جو قرآن نازل ہونے کے وقت لکھ لئے جاتے تھے، غرض کہ زبانی غلطیاں یا تو بخوبی یاد رکھنے والوں سے، یا متفرق لکھے ہوئے پرچوں سے، جو لوگوں کے پاس تھے صحیح ہو جاتی تھیں۔

یہ اختلاف روز بروز جیسا کہ عام قاعدہ ہے بڑھتا جاتا تھا، اس لئے حضرت ابوبکر کی خلافت میں صحابہ نے اس پر اتفاق کیا، کہ اُن متفرق پرچوں کو جمع کر کر تمام قرآن مجید کو ایک جگہہ لکھ لینا چاہیئے، تاکہ اختلاف نہ پڑے، پس زید ابن ثابت نے وہ تمام متفرق پرچے جمع کئے، اور اپنے ہم عصروں سے جو قرآن کو بخوبی یاد رکھتے تھے، اور جن کے پاس متفرق پرچے لکھے ہوئے تھے مدد لی، اور اوّل سے آخر تک قرآن مجید لکھ لیا۔

حضرت عثمان کے وقت تک بلاد دوردست میں اسلام پھیل گیا تھا، اور صرف ایک قرآن کا مدینہ میں ہونا کافی نہ تھا، اس لئے انہوں نے اُس قرآن کی جس کو زید ابن ثابت نے لکھا تھا متعدد نقلیں کیں، اور دور دور کے ملکوں میں بھیجدیا۔ یہ کارروائی نہایت مفید ہوئی، اور سب سے بڑا یہ کام ہوا، کہ اس زمانہ سے پہلے کسی کو کوئی سورۃ یاد تھی، اور کسی کو کوئی سورۃ یاد تھی، کسی کو دو یاد تھیں، کسی کو دس یاد تھیں، کسی کو آدھی یاد تھی کسی کو پاؤ، اب سینکڑوں ایسے لوگ پیدا ہو گئے جن کو بہ ترتیب من اولہ الی آخرہ تمام قرآن یاد تھا۔

اگرچہ اب وہ غلطیاں جو نسبت اسقاط یا اضافہ کلمات کے زبانی یاد رکھنے والوں کو پڑتی تھیں بالکل جاتی رہیں مگر پھر بھی کسی قدر اختلاف قرأت باقی رہا، اس لئے کہ یہ سب قرآن جو لکھے گئے تھے قدیم کوفی خط میں تھے، جس میں نہ نقطے ہوتے تھے نہ اعراب۔ اور اگرچہ عرب اس سبب سے کہ اُن کی زبان تھی اُسکو بخوبی بلا تکلف بصحت پڑھتے تھے، مگر پھر بھی بعضے ایسے لفظ تھے، کہ بلحاظ قواعد صرف ونحو زبان عرب کے، یا یوں کہو کہ مطابق بول چال اہل عرب کے، اگر اُسکو یے سے پڑہو تو بھی معنی ٹھیک ہوتے ہیں، اور اگر تے سے پڑہو تو بھی معنی ٹھیک ہوتے ہیں، اگر سکون سے پڑہو تو بھی صحیح ہے اور اگر تشدید سے پڑہو تو بھی صحیح ہے، چنانچہ اِس قسم کے اختلاف قرأت مگر بہت کم باقی رہ گئے۔

تھوڑے دنوں بعد، جب کہ بعض صحابہ اور بہت سے تابعین زندہ تھے، اور ہزاروں شخص قرآن مجید کو بہ ترتیب من اولہ الی آخرہ یاد رکھنے والے موجود تھے، اس اختلاف کے رفع کرنے پر بھی کوشش کی گئی، اور قرآن مجید میں اعراب، اور نقاط بالکل لگا دیے کتابوں میں تو بلاشبہ اُن پہلے اختلافوں کا ذکر ہوتا ہے مگر فی الواقع اختلاف قرأت بالکل جاتا رہا، اور ہزارہا آدمی ہر زمانہ میں ایسے موجود ہو گئے، جن کو بہ ترتیب، من اولہ الی آخرہ قرآن حفظ یاد تھا اور کسی کی قرأت میں ایک حرف یا ایک اعراب کا بھی فرق نہ تھا اور آج کے دن بھی جو یکم شوال ۱۳۰۰ نبوی مطابق ۱۲۹۴ ہجری موافق نویں اکتوبر ۱۸۷۷ عیسوی کی ہے ہزاروں حافظ ہر ملک میں اسی قسم کے موجود ہیں۔ درحقیقت یہ شرف سوائے قرآن مجید کے اور کسی کتاب کو حاصل نہیں ہے، کہ اگر تمام دنیا سے قرآن کے قلمی اور چھاپہ کے نسخے معدوم کر دیے جاویں، تو حافظ کے سینہ سے پھر قرآن مجید ایسا ہی نقل ہو سکتا ہے، جیسا کہ ہے، اور جس میں ایک لفظ اور ایک شوشہ ایک اعراب کا بھی فرق نہوگا۔

اسکے سوا ایک اور قسم کا اختلاف قرأت ہے جو عرب کی مختلف قوموں کے لہجہ اور محاورہ زبان سے علاقہ رکھتا ہے یا جو اختلاف گنواروں اور اشرافوں یا اور پڑھے لکھوں اور جاہلوں کی زبان میں ہوتا ہے، اُسکو اختلاف قرأت پر منسوب کرنا بیجا ہے، کیونکہ وہ اختلاف قرأت نہیں ہے، بلکہ اختلاف تلفظ ہے جسکو انگریزی زبان میں "پرونسی ایشن" کہتے ہیں۔

توریت اور صحف انبیاء اور انجیل کے قلمی نسخے جو اب دنیا میں موجود ہیں وہ آپس میں نہایت مختلف ہیں، اگرچہ میں اس بات کا قائل نہیں ہوں، کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی کتب مقدسہ میں تحریف لفظی کی ہے، اور نہ علمائے متقدمین و محققین اِس بات کے قایل تھے، مگر علمائے متاخرین اِس بات کے قائل ہیں کہ یہودیوں اور

عیسائیوں نے اپنی کتب مقدسہ میں تحریف وتبدیل کی ہے، اُس پر عیسائی مصنفوں نے اِس امرمحال کے اثبات پر کوشش کی ہے، کہ قرآن میں بھی تحریف ثابت کریں، اور انھوں نے اپنی اس ناشدنی سعی میں کامیاب ہونے کو تین امر پر استدلال کیا ہے، اول اختلاف قرأت پر جسکا بالتفصیل اوپر مذکور ہوا، دوم شیعہ مذہب کی ایسی روایتوں پر جنکو خود شیعہ بھی تسلیم نہیں کرتے، جن میں کذاب اور ایک گروہ کے طرفدار راویوں نے بیان کیا ہے کہ قرآن میں اور بھی آیتیں یا سورتیں حضرت علی اور اہل بیت کی شان میں ہیں، جو جامعین قرآن نے داخل نہیں کیں، سوم اُن لغو اور بیہودہ روایتوں پر جن میں بعض آیات متروک التلاوۃ یا منسوخ التلاوۃ کا ہونا بیان کیا گیا ہے، اور جنکو شریر و بد مذہب آدمیوں نے شہرت دیا ہے۔

قرآن مجید کے اختلاف قرأت کو اور توریت وصحف انبیا وزبور وانجیل کی اختلاف عبارت کو یکسان قرار دینا دیدہ و دانستہ ایک غلطی کرنا ہے، ریورنڈ مسٹر ہارن مختلف عبارتوں کا ذکر لکھتے وقت لکھتے ہیں کہ دو یا زیادہ مختلف عبارتوں میں صرف ایک عبارت صحیح ہوسکتی ہے، باقی خواہ تو دیدہ و دانستہ تبدیل کی گئی ہونگی یا وہ نقل کرنے والوں کی غلطیاں ہونگی، پھر وہ یہودی اور عیسائی کتب مقدسہ میں اختلاف عبارت ہونے کے چار سبب لکھتے ہیں، اوّل لکھنے والے کی غفلت یا غلطی، دوم جن نسخوں سے نقل کی گئی ہو اُن کا غلط یا ناقص ہونا، سوم نقل کرنے والے کا بلا کافی و معتبر سند کے اصل عبارت میں اصلاح دینا، چہارم دیدہ و دانستہ کسی خاص فریق کی تائید کے لئے عبارت کا بگاڑ دینا۔ پس قرآن مجید کا کوئی بھی اختلاف قرأت ان حالتوں میں سے کسی حالت کے ساتھ بھی مناسبت نہیں رکھتا۔

علاوہ اس کے قرآن مجید کی تحریف ثابت کرنے کو عیسائی مصنفوں نے جن مذکورۂ بالا مخرجوں پر استدلال کیا ہے اور جو مخرج فی نفسہ غلط ہیں، اُن کی غلطی ثابت کرنے پر ایک طولانی بحث کرنے سے زیادہ تر یہ مختصر بات بیان کرنی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ جس بنا پر عیسائیوں نے تحریف قرآن کا دعویٰ کیا ہے اُس طرح پر دعویٰ کرنا بمقابل ان مسلمانوں کے جو دعویٰ تحریف لفظی کا کتب مقدسہ یہودیوں اور عیسائیوں میں کرتے ہیں صحیح نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ اُن مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ جسطرح پر کہ ابتدا میں توریت وصحف انبیا وزبور و انجیل لکھی گئی تھی، بعد اسکی تحریر کے یہودیوں اور عیسائیون نے اُس میں تحریف لفظی کی ہے، اور جملے اور کلمے اور آیتیں نکال دی ہیں، اور اپنی طرف سے آیتیں اور جملے اور کلمے، بلکہ کتابیں کی کتابیں، لکھ کر داخل کردی ہیں۔

پس اگر کوئی عیسائی اس کے مقابلہ میں قرآن کی تحریف کا دعویٰ کرنا چاہے تو اُسکو اختلاف قرأت، یا روایات
غیر مسلمہ اہل مذہب کا پیش کرنا کافی نہیں ہے، بلکہ وہ اُن کے مقابل جب ہو سکتا ہے، جب وہ یہ
دعویٰ کرے، کہ جو قرآن زید ابن ثابت نے ابتدا میں لکھا تھا اُسکی تحریر کے بعد یہ آیت یا یہ سورۃ اُس میں
سے نکال ڈالی گئی ہے، اور یہ آیت یا یہ کلمات اُس میں بڑھا دیے گئے ہیں، یا یہ صیغے یا یہ اعراب تبدیل کر دیے
گئے ہیں، اور اگر وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تو بالفرض زید ابن ثابت نے جو کچھ کیا ہو، کیا ہو، مگر قرآن پر تحریف کا
دعویٰ نہیں ہو سکتا، کیونکہ جیسا وہ جب لکھا گیا تھا ویسا ہی اب تک موجود ہے۔

زید ابن ثابت نے جب قرآن لکھا تھا، اور جس کی نقل حضرت عثمان نے کی تھی، اُس زمانہ میں قواعد
رسم خط کے بخوبی منضبط نہیں ہوئے تھے، اور اس سبب سے بہت سے الفاظ زید ابن ثابت نے اسطرح
لکھے ہیں جو اُن قواعد رسم خط سے جو بعد کو منضبط ہوئے مختلف ہیں مگر صرف اس خیال سے کہ جو کچھ زید
ابن ثابت نے لکھا ہے اُسمیں تبدیلی نہ واقع ہونے پاوے، حضرت عثمان نے بھی وہی رسم خط رہنے دی
تھی، اور اُسکے بعد تمام مسلمانوں نے صرف قرآن کی تحریر میں اُسی رسم خط کو رہنے دیا، اور یہاں تک اُسمیں غلو کیا
کہ اُسکے برخلاف رسم خط تحریر قرآن میں اختیار کرنے کو گناہ اور کفر قرار دیدیا۔

قاری مصطفےٰ تفسیر بحر العلوم کے مصنف نے لکھا ہے کہ "مطابقت خط مصحف عثمانی بر کاتب قرآن از واجبات
دینی است کہ اجماع صحابہ بداں واقع شدہ است و مخالفت اجماع حرام باشد و جمہور علما و ائمہ مذاہب اربعہ سنیہ بریں اند
و در مقنع آمدہ، سئل مالک ھل یکتب ما احدثہ الناس من الھجا فقال لا الا علی کتبۃ الاولی۔

اور اتقان فی علوم القرآن میں لکھا ہے کہ "کان احمد یحرم مخالفۃ خط عثمان رضی اللہ عنہ فی واو او یاء
او الف او غیر ذالک۔

اور ابن مہران کا قول ہے کہ "اتباع المصحف فی ھجاۂ واجب ومن طعن فی شیء من ھجاۂ فھو کالطاعن
فی تلاوتہ لانہ بالھجاء یتلی۔

اور حدیقۃ البیان میں لکھا ہے کہ "اگر کسے اعتقاد کند کہ بر موافق امام یعنی مصحف عثمانی نباید نوشت نسبت
خطا بر قلم اولیں کردہ باشد زیرا کہ در لوح محفوظ بہماں طور نوشتہ شدہ است و نیز بجناب صحابہ رضی اللہ عنہ بلکہ
بجناب رسالت معلم صحابہ و بجبرئیل معلم رسول نسبت خطا واقع میشود و زیادتی و کمی در قرآن حاصل می آید و
این ہمہ قریب کفر است۔

اور کتاب صحاح میں ابی عبداللہ محمد کا یہ قول ہے کہ "من خالف الامام صار فاسقا و دخل تحت وعید من کذب علی متعمدا فلیتبوء مقعدہ من النار۔

اور ایضاح میں لکھا ہے کہ "یکرہ قرأۃ القرآن من المصحف الذی یخالف ما خطہ ابن ثابت"

یہ تشددات صرف اسی مطلب سے ہیں، کہ جو کچھ زید ابن ثابت نے لکھا اور جسکی بعینہٖ نقل حضرت عثمان نے کی، اُسمیں ذرہ بھی فرق نہ پڑنے پاوے، چنانچہ آج تک قرآن مجید اُسی طرح محفوظ ہے، پس ہر شخص یہ بات کہہ سکے گا اور قبول کر سکے گا کہ دنیا میں کوئی قلمی کتاب بجز قرآن مجید کے ایسی موجود نہیں ہے، کہ تیرہ سو برس کے بعد بھی ایسی ہی موجود ہو، جیسی کہ پہلے دن لکھی گئی تھی، جسمیں ایک شوشہ تک کا فرق نہیں، اور باوجودیکہ لاکھا قلمی نسخے اُسکے چھپنے مگر سب یکساں ہیں، پھر ایسی کتاب کی نسبت یہ کہنا، کہ اُسمیں بھی اس قسم کی تحریف ہوئی ہے، جیسی کہ مسلمان توریت و انجیل میں بیان کرتے ہیں، ایسی بات ہے جسکو کوئی شخص، نہ بت پرست نہ یہودی، نہ عیسائی، نہ سیاہ کافر، غرض کہ کوئی بھی تسلیم نہیں کر سکتا، سرولیم میور صاحب بھی اپنی کتاب مسمی لیف آف محمد میں تسلیم کرتے ہیں کہ "دنیا میں غالباً کوئی اور کتاب ایسی نہیں ہے جسکی عبارت بارہ سو برس تک ایسی خالص رہی ہو"۔

(آیات) علاوہ اعراب کے قرآن کے نسخوں میں اور بھی نشان پائے جاتے ہیں جو آیات وغیرہ کے نشان کہلاتے ہیں (گول چھوٹا سا دایرہ) آیت پوری ہونے کی نشانی ہے۔

(م) یہ نشان اسلئے ہے کہ اُس کلمہ پر ٹھیر جانا اور اُسکو آیندہ کے کلمہ سے نہ ملانا نہایت ضرور ہے۔

(ط) یہ نشان اس لئے ہے کہ اُس کلمہ پر ٹھیر جانا اور اگلے کلمہ کو جدا شروع کرنا بہتر ہے۔

(ج) یہ نشان اسلئے ہے کہ وہاں ٹھیر جانا جائز ہے۔

(ز) یہ نشان اس لئے ہے کہ یہاں ٹھیر جانا تجویز کیا گیا ہے مگر ملانا بہتر ہے۔

(ص) یہ نشانی اس لئے ہے کہ یہاں ٹھیر جانے کی رخصت دی گئی ہے۔

یہ پانچ نشانیاں تو وہ تھیں جو متقدمین نے اختیار کی تھیں مگر متاخرین نے سات اور بڑھائیں۔

(وقف) گویا ٹھیرنے کا حکم ہے۔

(ق) یعنی بعضوں نے یہاں ٹھیر جانا کہا ہے۔

(صلی) اس کلمہ کو اگلے کلمے سے ملا ہوا پڑھنا بہتر ہے۔

(لا) یعنی یہاں ٹھیرنا جائز نہیں بلکہ ملا ہوا پڑھنا بہتر ہے۔

(سکتہ) یعنی ٹھیرلو مگر دم نلو۔

(ک) یعنی کذلک ہے یعنی اوپر کا نشان ہے۔

(قلا) یعنی بعضوں نے کہا ہے کہ یہاں ٹھیرنا نہیں چاہئیے۔

بہرحال یہ سب نشان علمار نے قرآن کا مطلب سمجھانے کو بنائے ہیں، وحی سے نہیں لگائے گئے ہیں۔

قرآن مجید جب نازل ہوا تو عرب اُسکو اپنے لہجہ میں پڑھتے تھے جیساکہ اہل زبان کا دستور ہے، اور علاوہ اداے مخارج حروف کے جو اُنکی زبان تھی، وہ کسی لفظ کو زور دیکر پڑھتے تھے، اور کسی جگہہ وقفہ کرکر کسی کو مد دیکر، اور کسیکو قصر کرکر، پچھلے عالموں نے اُسی خیال سے آیات اور وقف مقرر کئے ہیں، مگر جب قرآن لکھا گیا تھا تو وہ ان اشاروں سے معرا تھا، پس یہ نشان آیتوں کے کسیکو اُنکے تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کرتے، قرآن مجید کا طرز کلام اور اُس کا مضمون خود بتاتا ہے، اور ہر ایک محقق اور عالم بلکہ ہر ذی عقل و فہم اُس کے معنی دریافت کرکر سمجھہ سکتا ہے، کہ کہاں مطلب ختم ہوا، اور کہاں سے دوسرا مطلب شروع ہوا اور یہی سبب ہے کہ بعض علمار نے ایک ہی فقرہ کو دو یا زیادہ ٹکڑوں میں منقسم سمجھا ہے، اور اُسکی دو یا تین آیتیں قرار دی ہیں، اور بعضوں نے کل فقرہ کو ایک ہی آیت سمجھا ہے، اور اس سبب سے ایک عالم اُسی ایک فقرہ میں دو یا تین آیتیں کہتا ہے، اور ایک عالم ایک ہی، اور اب بھی ہر ایک مفسر مجاز ہے، کہ بلحاظ ربط کلام کے جہاں وہ چاہے آیت قرار دے۔ میں اپنی تفسیر میں مطالب کے بیان میں اسی طریقہ کو اختیار کرونگا، مگر میں نے شمار آیتوں کا اُسکے مطابق رہنے دیا ہے، جو مولف نجوم الفرقان نے اختیار کیا ہے۔ اس لئے کہ اُس کتاب کے مولف نے نہایت خوبی سے قرآن مجید کے ہر ایک لفظ کو بتایا ہے کہ کس کس آیت میں ہے، اور وہی شمار قائم رکھنے سے مجھکو اپنی تفسیر میں الفاظ وارده قرآن کا نشان دینے کو جہاں کہیں اُنکے نشان دینے کی ضرورت ہو نہایت آسانی ہوگی۔

یہی سبب ہے کہ باوجودیکہ میرے نزدیک ہر ایک سورۃ پر جو بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھی ہوئی ہے وہ اُس سورۃ کی آیتوں میں سے ایک آیت ہے، مگر میں نے اُسپر شمار آیت کا نہیں لگایا، کیونکہ مولف نجوم الفرقان نے ہر ایک سورۃ میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کو شمار آیتوں سے خارج رکھا ہے اگر میں اُسکو شمار آیتوں میں داخل کردیتا تو بالکل شمار مختلف ہوجاتا اور الفاظ وارده قرآن کا پتا و نشان درست نہ رہتا۔

(مضامین قرآن) قرآن مجید کے بعض مضامین اور احکام ایسے ہیں جو توریت یا انجیل کے مضامین سے، یا یہودیوں کی روایت سے مطابقت رکھتے ہیں، اور اُسکا طرز کلام ایسا ہے جو زمانہ جاہلیت کے طرز کلام سے مناسبت رکھتا ہے، اور بعض احکام ایسے ہیں جو زمانہ جاہلیت میں بھی رائج تھے، اور بعض جگہہ طریقہ نظم قرآن ایسا ہے جو اور مشرک قوموں کی مقدس کتابوں میں بھی جنکو وہ الہامی سمجھتے تھے موجود ہے، اور اس سبب سے مخالفین اسلام نے قرآن مجید پر اعتراض کئے ہیں، اور کہا ہے کہ یہ باتیں وہاں سے لی گئی ہیں۔

مگر معترضوں کی یہ ایک علانیہ غلطی ہے، اس لئے کہ پیغمبر درحقیقت اُس قوم کے لئے یا اُس زمانہ کے لوگوں کیلئے جسمیں وہ پیدا ہوئے برائیوں کی اصلاح کرنیوالے اور اچھی باتوں کو قائم کرنیوالے اور سچ بات کو تسلیم کرنیوالے اور حق بات کو بیان کرنے والے ہوتے ہیں اور ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ بات ناممکن ہے کہ کسی پیغمبر کے زمانہ سے پہلے جو باتیں مروج ہوں، یا جو باتیں بطور مذہب کے جاری ہوں، یا بطور تواریخی واقعات کے مشہور ہوں، یا بطور مقدس کلام کے سمجھی جاتی ہوں، یا اگلے ادیان حقہ کا بقیہ ہوں وہ سب غلط وجھوٹ اور خراب اور ناواجب ہوں، بلکہ بالضرور سچ میں جھوٹ اور اچھی میں بُری ملی ہوتی ہیں، اور اس لئے جو شخص کہ اصلاح کے منصب پر ہو، اُسکو اُن اچھی باتوں کو قایم رکھنا اور سچ بات کو تسلیم کرنا اور نیک کاموں کو بحال رکھنا ضرور و لازم ہوتا ہے اور ایسا کرنا علانیہ نیکی اور بے ریائی اور اُس اصلاح کرنیوالے کی سچائی پر دلالت کرتا ہے، پس اگر قرآن مجید میں بھی ایسا ہے تو یہ وجہ اُسپر کچھہ اعتراض کی نہیں ہے، بلکہ اُسکی سچائی کی دلیل ہے۔

بلاشبہہ آتش پرستوں میں یہ رواج تھا کہ اُنکے مقدس صحیفوں کے سروں پر جنکو وہ الہامی سمجھتے تھے ایک ایسا فقرہ لکھا ہوا ہوتا تھا جو مماثل بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ہے اور وہ فقرہ یہ ہے۔

بہ نام ایزد بخشایندہ بخشایشگر مہربان دادگر

ترجمہ بنام ایزد بخشایندہ بخشایشگر مہربان دادگر

مگر یہ فقرہ (کیا عجب ہے کہ الہامی ہو) ایسا عمدہ ہے، کہ جو شخص خدا پر ایمان لانے کا حامی ہو اور اُسی کی لوگوں کو ہدایت کرتا ہو، وہ ضرور اُس کو تسلیم کرے گا اور اُسکا مؤید ہوگا پس قرآن مجید میں ہر سورۃ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم ہونے پر اعتراض کرنا اور اُسکو ایک سرقہ قرار دینا، ایک ناانصافی اور محض مکابرہ ہے، کون شخص ہے جو خدا کو مانتا ہو اور لوگوں کو بھی منوانا چاہتا ہو اور اس فقرہ کو مٹا دے، اور نہ خدا ایسا کر سکتا ہے کہ جو کلام اُس کی مرضی کے مطابق ہے اُسکے برعکس کوئی کلام نازل کرے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۵ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝۶ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷

اِس سورۃ میں کچھہ تو خدا کی تعریف ہے، اور کچھہ اپنی عاجزی، اور کچھہ دعا، پس گویا بندوں کی زبان سے کہی گئی ہے، اور بلا شبہہ بندوں کو خدا سے اسی طرح التجا کرنی زیبا ہے۔

دعا جب دل سے کی جاتی ہے ہمیشہ مستجاب ہوتی ہے، مگر لوگ دعا کے مقصد اور استجابت کا مطلب سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ جس مطلب کے لئے ہم دعا کرتے ہیں دعا کرنے سے وہ مطلب حاصل ہو جاویگا، اور استجابت کے معنی اُس مطلب کا حاصل ہو جانا سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ غلطی ہے، حصول مطلب کے جو اسباب خدا نے مقرر کئے ہیں، وہ مطلب تو انہی اسباب کے جمع ہونے سے حاصل ہوتا ہے، مگر دعا نہ اُس مطلب کے اسباب میں سے ہے، اور نہ اُس مطلب کے اسباب کو جمع کرنیوالی ہے، بلکہ وہ اُس قوت کو تحریک کرنیوالی ہے، جس سے اُس رنج و مصیبت اور اضطرار میں جو مطلب نہ حاصل ہونے سے ہوتا ہے تسکین دیتی ہے، اور جبکہ دعا دل سے اور اپنے تمام فطرتی قوا کو متوجہ کر کر کی جاتی ہے، اور خدا کی عظمت اور اُسکی بے انتہا قدرت کا خیال اپنے دل میں جمایا جاتا ہے، تو وہ قوت تحریک میں آتی ہے، اور اُن تمام قوتوں پر جنسے اضطرار پیدا ہوا ہے، اور اُس مصیبت کا رنج برانگیختہ ہوا ہے اُن سب پر غالب ہو جاتی ہے، اور انسان کو صبر و استقلال پیدا ہو جاتا ہے، اور اسی کیفیت کا دل میں پیدا ہونا دعا کا مستجاب ہونا ہے۔

اسی امر کا اشارہ آنحضرت صلعم نے اِن لفظوں میں فرمایا کہ "الدعاء مخ العبادة" یعنی دعا خالص عبادت ہے اور اس سے بھی واضح کر کر فرمایا کہ "الدعاء هو العبادة"

خدا کے نام سے جو بڑا رحم والا ہے بڑا مہربان

سب بڑائیاں خدا ہی کے لئے ہیں جو تمام عالموں کا پالنے والا ہے (۱) بڑا مہربان ہے اور بڑا رحم والا (۲) حاکم ہے انصاف کے دن کا (۳) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے ہم مدد چاہتے ہیں (۴) ہمکو سیدھی راہ پر چلا (۵) اُن لوگوں کی راہ پر جنپر تو نے بخشش کی ہے (۶) نہ اُنکی راہ پر جن پر تیرا غصہ ہوا ہے اور نہ، بھٹکنے والوں کی راہ پر (۷)

یعنی دعا عبادت ہی ہے اور پھر فرمایا کہ تمھارا پروردگار کہتا ہے کہ "ادعونی استجب لکم" یعنی مجھ کو پکارو یعنی میری عبادت کرو میں تمھارے لئے اُس عبادت کو قبول کرونگا۔ (مشکواۃ)

پس دعا سے مطلب کا حاصل ہونا موعود نہیں ہے، بلکہ عبادت کا جو نتیجہ ہے، وہ موعود ہے دعا کے ساتھ کبھی مطلب کا حاصل ہوجانا اتفاقیہ بات ہے جو اُسکے اسباب جمع ہونے سے حاصل ہوجاتا ہے۔

(۳) (مالک یوم الدین) یعنی اُس دن کا جس دن کہ اُس نور فطرت کے کام میں لانے یا نہ لانے کا جو خدا نے ہر ایک انسان میں موافق اُسکی حالت کے رکھا ہے نتیجہ ظاہر ہوگا۔

(۴) (انعمت علیہم) جن پر انعام ہوا وہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے خدا کی نشانیوں میں غور کیا ہے، اور جو نور فطرت خدا نے اُن میں رکھا ہے، اُس کو کام میں لائے ہیں، اور قومی اور ملکی و تمدنی و آبائی امور کی الفت و موانست اور خلقی اُمور کی قوت پر اُس کو غالب کیا ہے، یا غالب کرنے کی کوشش کی ہے، اور سب چیزوں کو چھوڑ کر وہ راہ اختیار کی ہے جو خدا نے بتائی ہے۔

(۵) (غیر المغضوب) جن پر غصہ ہوا، وہ لوگ ہیں جو اُس نور فطرت کو کام میں نہیں لائے، اور نہ کام میں لانے کی کوشش کی اور آبائی اور ملکی و تمدنی امور کے بوجھ میں دبے، اور خلقی امور کی قوت میں مغلوب رہے، اور جو راہ خدا نے بتائی تھی اُس کو اختیار نہیں کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الٓمّٓ ۔ ذٰلک الکتاب

(الٓمّٓ) یہ سورۃ انہی انتیس سورتوں میں سے ہے، جنکو خود خدا نے انکے نام سے موسوم کیا ہے، یہ حروف مقطعات اُن سورتوں کے نام ہیں جنکے ابتدا میں آئے ہیں، اور جو سورتیں باہم کسی قسم کی مناسبت رکھتی ہیں اُنکے ایک ہی سے نام مقرر کئے ہیں، اب یہاں تین باتیں غور طلب ہیں۔ ایک یہ کہ انھی انتیس سورتوں کے نام مقرر کرنیکا کیا سبب ہے۔ دوسری یہ کہ حروف مقطعات سے کیوں انکے نام مقرر کئے ہیں۔ تیسری یہ کہ جن حروف مقطعات سے ان سورتوں کے نام مقرر کئے ہیں اُنہی حروف سے انکا نام مقرر کرنیکا کیا سبب ہے۔

قرآن مجید پر غور کرنے سے علانیہ پایا جاتا ہے، کہ جس سورت کو خدا تعالیٰ نے قسمیہ طور پر، یا اس طرز کلام پر شروع کیا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے، یا یہ خدا کی کتاب ہے، اُس مقام پر خدا نے اُس سورۃ کو کسی اسم سے موسوم کیا ہے تاکہ اُسکا نام لینے سے اُسکے مسمیٰ پر اس امر کا اطلاق ہو، جسکا اطلاق کرنا مقصود ہے، اور جن سورتوں کو اس طرز کلام سے شروع نہیں کیا اُنکا نام رکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

مثلاً اس سورۃ کا نام جسکی ہم تفسیر کر رہے ہیں، آلم ہے، اب خدا تعالیٰ نے طرز کلام اسطرح پر شروع کیا ہے کہ یہ سورۃ خدا کی کتاب ہے، تو اُسنے اس سورۃ کا نام لیکر کہدیا کہ الم یعنی اُسکا مسمیٰ وہ کتاب ہے، پس الم جو اس سورۃ کا نام ہے مبتدا ہے، اور ذالک مبتدا ثانی ہے، اور الکتاب اُسکی خبر ہے، اور یہ مبتدا و خبر ملکر پہلے مبتدا کی خبر ہیں، اور الم یعنی الم کا مسمیٰ ذالک الکتاب پر محمول ہے۔

یہ بات بھی صاف ہے، کہ اگر ان سورتوں کے نام الفاظ با معنی سے مرکب ہوتے، تو اُن معنیوں کا جن پر وہ الفاظ دلالت کرتے، ذالک الکتاب، پر حمل ہونیکا شبہہ پڑتا، اور معنی سے قطع نظر کر کر اُسکے مسمیٰ کا محمول ہونا بہت کم خیال میں جاتا، پس خدا تعالیٰ نے حروف مفردہ کو جو ترکیب کلام کے اصول بھی ہیں، اور معانی سے مبرا بھی ہیں اسما سور اختیار کیا، تاکہ بجز مسمیٰ کے محمول ہونے کے اور کوئی احتمال ہی نہ رہے۔

البتہ اِس بات کا تصفیہ کہ ان حروف کو اس سورۃ کے نام کے لئے کیوں مخصوص کیا مشکل ہے، دنیا میں بھی جو شخص کسی کا کچھ نام رکھتا ہے، اور جو مناسبت یا

خدا کے نام سے جو بڑا رحم والا ہے بڑا مہربان

الم، وہ کتاب ہے،

علت اُس نام رکھنے کی اُسکے دل میں ہوتی ہے، اُسکا سمجھنا مشکل ہوتا ہے پس یہ قرار دینا کہ خدا نے اس مناسبت سے اُن حروف مقطعات سے اس سورۃ کو موسوم کیا ہے ایک مشکل بات ہے، اور ضرور ہے کہ باہم علما کے اسمیں اختلاف ہو چنانچہ بہت سا اختلاف ہوا بھی ہے، یہاں تک کہ بعضوں نے کہا کہ اِس مناسبت کا علم خدا ہی کو ہے، مگر ہر شخص بقدر اپنی فہم کے اُس مناسبت کے بیان کرنیکا بلا شبہہ مجاز ہے۔

میری سمجھ یہ ہے کہ بعضی دفعہ اہل عرب حروف مقطعات بولتے تھے اور اُس سے اشارہ کسی مطلب کی طرف ہوتا تھا، جیسے کہ اِس شعر میں ہے۔

	لا تحسبی انا نسینا الایجاف		قلت لھا قفی فقالت لی ق

یعنی میں نے اُس سانڈھنی سوار عورت سے کہا کہ ٹھیر جا یہ مت خیال کر کہ میں سانڈھنی ھنکانا بھول گیا ہوں اُس نے کہا کہ قاف یعنی وقفت ٹھیر گئی میں پس حرف قاف سے پورا کلام "وقفت" کا مراد ہے۔

سورہ بقر اور سورہ آل عمران اور سورہ عنکبوت اور سورہ روم اور سورہ لقمان اور سورہ سجدہ ان سب کے سر پر الم ہے جو اُن سورتوں کا نام ہے، اِن تمام سورتوں میں خدا تعالیٰ نے احکام الٰہی کی تعمیل اور امر بالمعروف کی تاکید، اور لیل و نہار کے اختلاف اور عالم میں جو آیات قدرت کردگار ہیں اُن سے خدائے واحد کے وجود پر استدلال کیا ہے، اور موت کا اور اُسکے بعد کے حالات کا بیان فرمایا ہے، اور اسی سبب سے الم سے اُن سورتوں کو موسوم کیا ہے، تاکہ اُن تینوں حرفوں سے اُن تین مطالب عظیمہ کی طرف اشارہ ہو، اور انھی مطالب عظیمہ کا ذکر ان سب سورتوں میں تھا، اسلیئے اُن سب کو ایک ہی نام سے موسوم کیا۔

علمائے اسلام نے رفع التباس کے لئے اُن سورتوں کے نام کے ساتھ جنکے متحد نام ... مقطعات زیادہ تھے، یا کسی سورۃ کے اہم مضمون پر زیادہ وضاحت سے اشارہ کرنیکے لئے جو کسی نام سے موسوم نہ تھیں، اُسی یہودی قاعدہ کے مطابق، اُسی سورۃ میں ... کوئی ... طرف اشارہ کرنے کے لئے منتخب کیا، جو رفتہ رفتہ بطور اُن سورتوں کے نام کے متصور ہونے ... وہ الفاظ ہیں جو علما نے ان سورتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اختیار کئے ہیں۔

(الکتاب) خدا اپنے رسول سے فرماتا ہے کہ الم یعنی اُس کا مسمیٰ وہ کتاب ہے

لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِلْمُتَّقِينَ ① الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلوٰةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ ② وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ③ أُولٰئِكَ عَلٰى هُدًى مِنْ رَبِّهِمْ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ④

یعنی وہ کتاب جو ہم تجھ پر نازل کرتے ہیں - عام بول چال کا محاورہ ہے کہ جب کوئی شخص کوئی کتاب تصنیف کرنی یا لکھنی شروع کرے، یا شروع کرنی چاہے، تو قبل اس کے کہ وہ لکھی جا چکے یا تصنیف ہو چکے اُسے کتاب کا لفظ بولتا ہے، اس خیال سے کہ وہ تصنیف ہو چکنے اور لکھے جا چکنے کے بعد کتاب ہو گی، اسی طرح خدا تعالیٰ نے بھی قرآن مجید پر قبل اُسکے لکھے جانے کے کتاب کا اطلاق کیا ہے، جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خدا کی مرضی تھی کہ لکھی جاوے، اور اس میں بھی کچھ شبہہ نہیں کہ جسقدر قرآن نازل ہوتا تھا اُسیوقت آنحضرت ہی کے وقت میں لکھ لیا جاتا تھا -

(لا ریب فیہ) کے معنی اگلے مفسروں نے یہ بیان کئے ہیں کہ اُسکے خدا کی طرف سے ہونے میں کچھ شبہہ نہیں، گویا یہ خطاب ہے اُن لوگوں کی طرف جو قرآن کے خدا کی طرف سے ہونے میں جبکہ وہ نازل ہوتا تھا شک کرتے تھے، اور بطور یقین کے بلا دلیل بیان کرنا اس بات پر اشارہ ہے کہ یہ دعویٰ ایسے دلائل سے ثابت ہے یا ثابت ہو گا کہ جو بمنزلہ بدیہی کے ہیں، جیسے کہ عام بول چال میں دستور ہے کہ جو بات یقینی ہوتی ہے اُسکی دلیلیں بیان کرنے سے پہلے کہہ دیتے ہیں کہ اس بات میں کچھ شک نہیں اور پھر اُس کی دلیل بیان کی جاتی ہے -

مگر میری سمجھ میں اس مقام میں ان معنوں کے اختیار کرنے سے دوسرے معنی اختیار کرنے بہتر ہیں، خدا تعالیٰ نے اس جگہ تین فرقوں کا حال بیان کیا ہے - ایمان والوں کا، کافروں کا - منافقوں کا - جو دل میں کافر ہیں اور جھوٹ موٹ ظاہر میں اپنے تئیں مسلمان کہتے ہیں، پس لاریب فیہ کے ایسے معنی لینے زیادہ مناسب ہیں جو اِن فرقوں میں سے کسی کے حال کے مناسب ہوں، اور وہ یہ معنی ہیں کہ، اِس کتاب کے

پرہیزگاروں کے لیٔے اسکے رہنما ہونے میں کچھ شک نہیں (۱) جو آنکھ سے اوجھل پر ایمان لاتے ہیں، اور درستی سے نماز کو ادا کرتے ہیں، اور جو کچھ ہمنے اُنکو دیا ہے اُس میں سے دیتے ہیں (۲) اور جو لوگ اُسپر ایمان لاتے ہیں جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے اور جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا تھا اور آخرۃ پر بھی وہ یقین رکھتے ہیں (۳) وہی اپنے پروردگار کی مہربانی سے سیدھی راہ پر ہیں اور وہی مراد کو پہونچے ہیں (۴)

پرہیزگاروں یعنی ایمان والوں کے لئے ہادی ہونے میں کچھ شک نہیں جو اس کتاب کو مانتے ہیں اور اُسکی ہدایتوں پر چلتے ہیں، جن میں سے سب سے بڑا حکم خدا پر ایمان لانا اور نماز کا ادا کرنا اور خیرات کا دینا ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ جو لوگ اِس کتاب کو مانتے ہیں وہی اِس کتاب سے ہدایت پاوینگے، اور جو نہیں مانتے وہ ہدایت نہیں پا سکتے گو کہ فی نفسہ سب کے لیے ہدایت ہو، اِس کی مثال ایسی ہے کہ مثلاً ایک دوا جو فی نفسہ کسی مرض سے شفا دینے والی ہے تو وہ فی نفسہ تو اُس مرض کے سب مریضوں کے لئے شفا ہے الا شفا وہی پاوینگے جو اُسکا استعمال کرینگے، اسی طرح قرآن بھی سب کے لئے ہدایت ہے، مگر ہدایت وہی پاوینگے جو پرہیزگار ہیں یعنی وہ جو اُسکی ہدایتوں پر چلتے ہیں۔

اگر یہ معنی تسلیم کئے جاویں تو "ھدی" کا لفظ بدل ہے ضمیر مجرور سے جو "فیہ" میں ہے اور جار مجرور ثابت یا کائن سے متعلق ہو کر لا نفی جنس کی خبر ہے یعنی "لاریب فی کونہ ہادیا للمتقین"، جسکے معنی یہ ہوئے کہ پرہیزگاروں کے لئے قرآن کے ہادی ہونے میں کچھ شک نہیں۔

(۲) (غیب) اُسے کہتے ہیں جو آنکھ سے اوجھل ہو، مگر یہاں اُس ذات پاک سے مراد ہے جو باوجود ہونے کے نہ آنکھ سے اور نہ کسی اور حواس سے محسوس ہوتی ہے نہ ہو سکتی ہے، اور بجز اِسکے کہ عقل یہ کہتی ہے کہ ہے، اور کچھ نہیں بتا سکتی اُس تفسیر میں جو عبداللہ بن عباس کی طرف منسوب ہے یہ لکھا ہے "ویقال الغیب ھو اللہ" پس معنی یہ ہوئے کہ پرہیزگار وہ ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا

(۵) (ان الذین کفروا) جو لوگ کفر میں پڑے ہیں اُنکی نسبت خدا نے فرمایا "ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ" مگر کسی مفسر نے اسکے حقیقی معنی مراد نہیں لئے کیونکہ کسی انسان کے دل پر اور نہ کان پر سچ مچ کی مہر لگی ہوئی ہے اور نہ کسی کی آنکھوں پر سچ مچ کا پردہ پڑا ہوا ہے، بلکہ سچ بات کے نہ سمجھنے اور حق بات کے نہ سننے اور ٹھیک بات پر نہ غور کرنے کو بطور استعارہ دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دینے اور آنکھوں پر پردہ ڈالنے سے بیان کیا ہے۔

بلا تشبیہ یہ ایسا ہی کلام ہے جیسیکہ ایک ناصح شفیق کسی کو افعال ذمیمہ چھوڑنے اور اخلاق حمیدہ اختیار کرنیکی نصیحت کرتا ہو مگر وہ شخص اسکی نصیحت پر کان نہ دھرتا ہو، اور ایک شخص فصیح و بلیغ اس حالت کو دیکھکر کہے کہ، بدذاتوں نااہلوں کو تم نصیحت کرو یا نہ کرو وہ کبھی نہیں ماننے کے، اُنکے دل تحجر کے ہیں اور آنکھیں اندھی اور کان بہرے خدا نے اُنکے دلوں پر مہر لگا دی ہے، اور اُنکی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے، پس جس محاورہ میں انسان آپس میں بات چیت کرتے ہیں اُسی انسانی محاورہ پر خدا نے بھی کلام کیا ہے۔

(مسلہ جبر و اختیار) ان آیتوں سے یا اور آیتوں سے جو اُسکی مثل ہیں جبر و اختیار کے مسلہ پر بحث کرنا قرآن مجید کے سیاق کلام کے منافی ہے، قرآن مجید کی کسی آیت سے نہ انسان کے اپنے افعال میں مجبور ہونے پر استدلال ہو سکتا ہے نہ مختار ہونے پر نہ بین الجبر و الاختیار ہونے پر مگر افسوس ہے کہ علماء متقدمین نے اس پر بحث کی ہے، اور غلطی سے اُس کو ایک ایسا مسئلہ سمجھا ہے جو مسائل اسلام میں داخل ہے اور جو وحی یا قرآن سے ثابت ہے۔ اور پھر آپس میں مختلف رائیں قرار دی ہیں، ایک گروہ انسان کے اپنے افعال میں مجبور ہونے کا قایل ہے دوسرا گروہ مختار ہونے کا اور تیسرا بین الجبر و الاختیار کا جو بالفعل مذہب اہل سنت وجماعت کا ہے۔

انسان اپنے افعال میں مجبور ہو یا مختار یا بین الجبر و الاختیار یہ ایک جدا مسئلہ ہے، جو انسان کی فطرت کی تحقیقات پر منحصر ہے، اور اُس کی فطرت پر مباحثہ کرنے کے بعد جو ثابت ہو، ہو، ہمارا مقصد اس مقام پر صرف اسقدر کہنا ہے کہ قرآن مجید سے ان باتوں میں سے کسی پر استدلال کرنا، اور اُسکو ایک مسئلہ اسلام منزل من اللہ سمجھنا غلطی ہے۔ قرآن مجید میں خدا تعالیٰ نے جابجا بندوں کے افعال کو بلکہ ہر ایک چیز کو اپنی طرف منسوب کیا ہے، جو کام بندوں سے ہوتے ہیں اُن کی نسبت فرماتا ہے،

ہاں جو کفر میں پڑے ہیں

کہ ہمنے کیا، یا جو چیزیں کہ اور اسباب سے پیدا ہوتی ہیں اُن اسباب کو بیچ میں سے نکال کر فرماتا ہی کہ ہمنے کیا، ہمنے مینھہ برسایا، ہمنے درخت اُگائے، ہمنے دریا بہائے، ہمنے سمندر میں جہاز تیرائے، ہمنے اوڑتے جانور ہوا میں تھامے، پس اس تمام طرز کلام سے واسطون کا درحقیقت درمیان میں نہونا یا اُس شے کا اُن افعال میں مجبور یا مختار ثابت کرنا مقصود نہین ہوتا، بلکہ اپنی عظمت وشان اور اپنے علۃ العلل یعنی تمام چیزون کی اخیر علت یا خالق ہونے کا بندون پر اظہار مقصود ہوتا ہے، اور اسلئے اس قسم کے کلام سے انسان کا اپنے افعال میں مجبور یا مختار ہونے کا استنباط واستدلال کرنا صحیح نہیں ہوسکتا، بلکہ ایسا کرنا داخل تفسیر القول بما لا یرضی قائلہ کے ہے، کیونکہ اس کلام سے اس بات کی حقیقت کا بیان کرنا کہ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے یا مختار یا بین الجبر والاختیار مقصود ہی نہین ہے۔

خدا اپنے تئین علۃ العلل جمیع کائنات کا بتاتا ہے، پس اگر تمام حوادث وافعال کو جو عالم میں تمام مخلوقات انسان، حیوان، عناصر، قوی وغیرہ سے ہوتے ہیں اپنی طرف نسبت کرے، اور ہر چیز کی نسبت یہہ کہے کہ ہمنے کیا، تو یہہ نسبت صحیح ودرست ہوگی۔ علاوہ اسکے مصری اور یونانی حکماء کا یہہ خیال تھا کہ دو چیزیں ازلی اور ابدی ہیں، ایک خدا، اور ایک مادہ، خدا نے اُس قدیم ازلی اور ابدی مادے سے تمام دنیا کو بنایا اور رچایا ہی، اور ایک گروہ زردشتیون کا یہہ عقیدہ تھا کہ دو مقابل کے وجود ہیں، ایک یزدان یعنی خدا، دوسرا اہرمن یعنی شیطان، نیک کام خدا کرتا ہے اور بد کام شیطان، اور یہہ مذہب اُس ریگستان میں بھی پھیل گیا تھا جہان ان غلطیون کا اصلاح کرنے والا پیدا ہوا تھا، خدا تعالی کو قرآن مجید میں ان دونوں عقیدون کا مٹانا اور اپنی ذات واحد کو خالق جمیع کائنات بتانا اور اپنے تئیں وحدہ لاشریک لہ جتانا مقصود تھا۔

پس سب سے عمدہ طریقہ اس باریک مسئلہ کے سمجھانیکا یہی تھا کہ تمام افعال کو اُنکے تمام واسطون کو دور کر کر خاص اپنی طرف منسوب کرے، اور کبھی اُن واسطون کیطرف، تاکہ لوگ سمجھہ لیں کہ علۃ العلل صرف ایک ذات وحدہ لاشریک ہی اور جو واسطے ہمکو دکھائی دیتے ہیں بلاشبہہ وہ واسطے ہین مگر علۃ العلل ان سب کی وہی ایک ذات وحدہ لاشریک ہی، پس جس کلام کا یہہ موضوع ہو اُس سے اس مطلب کو نکالنا کہ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے یا مختار یا بین الجبر والاختیار، اُس کلام کو غیر ما وضع لہ میں استعمال کرنا ہی۔ ہان یہہ ایک تمدنی اور طبعی اور عقلی مسئلہ ہے

سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۝۵

بہ پہر انسان کی خلقت کے لحاظ سے بحث اور غور ہو سکتی ہے جس کو ہم مختصراً بیان کرتے ہیں۔

اُن علما اور حکما نے جنھوں نے انسانی فطرت پر غور کی ہے دو طرح پر انسان کو اپنے افعال میں مجبور پایا ہے، ایک امور خارجیہ کے سبب سے جیسکہ قومی و ملکی و تمدنی امور کی الفت و موانست کا، اور بچپن سے کسی امر کی ممارست و تربیت و صحبت کا، اُسپر ایسا قوی اثر ہوتا ہے کہ وہ اُنھی افعال کو مستحسن سمجھتا ہے، اور اُنھی کے کرنے پر اُسکا دل اُسکو مجبور کر دیتا ہے، گو یہہ مجبوری اکثر اُسکی سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ بظاہر اُسپر کسی کا جبر نہیں ہوتا، مگر درحقیقت اُنھی قومی و ملکی و تمدنی اور بچپن سے کسی امر کی ممارست و تربیت و صحبت کا اثر رفتہ رفتہ بے معلوم اُس میں ایسا سرایت کر جاتا ہے کہ جس سے اُن افعال کے کرنے پر جنکو وہ کرتا ہے مجبور ہوتا ہے اور جن باتوں کو وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی مرضی سے کرتا ہوں درحقیقت وہ اُنھی قوی اثر کے سبب سے بمجبوری کرتا ہے۔

دوسری قسم کی مجبوری اپنے افعال میں خود انسان کو اپنی خلقت کے سبب سے ہوتی ہے، ہم تمام دنیا کی چیزوں میں اُنکی ایک فطرت پاتے ہیں جس کے برخلاف ہرگز نہیں ہوتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ معدنی چیزیں ہوا میں نہیں اُڑتی پہرتیں، پانی ہوا کے اوپر نہیں رہتا، مچھلی زمین پر زندہ نہیں رہتی، اور زندے جانوروں سے زندگی و پرند جانوروں سے پرواز، آبی جانوروں سے شناوری کبھی زائل نہیں ہوتی، پس وہ سب اُن افعال کے سرزد ہونے میں جو اُن سے منسوب ہیں بمقتضاے اپنی خلقت کے مجبور ہیں۔

اسی طرح ہم انسانوں میں بھی دیکھتے ہیں، کہ وہ بھی اپنے افعال میں بمقتضاے اپنی فطرت کے مجبور ہیں، جسکی آنکھہ خدا نے ایسی بنائی ہے جس سے دور کی چیز دکھائی دیتی ہے، تو وہ دور کی چیز دیکھنے میں مجبور ہے۔ برخلاف اُسکے جسکی آنکھہ کم بین ہے وہ دور کی چیز دیکھنے میں مجبور ہے اسیطرح انسانوں کی بناوٹ ایسی ہے کہ جو افعال ظاہری و باطنی اُن سے سرزد ہوتے ہیں وہ اُن میں مجبور محض ہیں، اگر بالفرض ایک نہایت رحم دل نیک طبیعت شخص کے اعضا، دل و دماغ کی بناوٹ، ایک نہایت شقی القلب بے رحم بدذات آدمی کی سی ہوتی تو اُس سے بھی وہی افعال سرزد ہوتے ہیں جو اُس بدذات سے، یا اگر ایک بیوقوف آدمی کے اعضا کی بناوٹ ایک عقلمند آدمی کے اعضا کی بناوٹ سے تبدیل ہو سکے تو اُس عقلمند سے اُسی

خواہ انکو ڈراؤ خواہ انکو نہ ڈراؤ انکو سب برابر ہے وہ ایمان نہیں لانیکے ۵

بیوقوف کے سے افعال اور اُس بیوقوف سے اُس عقلمند کے سے افعال سرزد ہونے لگیں گے غرض کہ علم تشریح ابدان سے ثابت ہو گیا ہے کہ جس قسم کی بناوٹ انسان کی ہوتی ہے اُسی کے مناسب افعال خواہ مخواہ اُس سے سرزد ہوتے ہیں، نہایت بے رحم سفاک قاتلوں کی کھوپری میں ایک خاص قسم کی بناوٹ ہے، اور تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ ہر قاتل و سفاک کی کھوپری اُسی بناوٹ کی ہوتی ہے، پس جسکی کھوپری اُس بناوٹ کی ہوگی، وہ ضرور سفاک قاتل بے رحم ہوگا، اور جو بے رحم سفاک قاتل ہوگا، اُسکی کھوپری اُسی بناوٹ کی ہوگی، پس اُن افعال میں جو خلقت انسانی سے علاقہ رکھتے ہیں انسان مجبور ہے، اور یہہ ایسی بدیہی باتیں ہیں جن سے کوئی بھی جبکہ وہ اُس علم میں واقفیت حاصل کرے انکار نہیں کر سکتا۔

اِس کو اور صاف طرح سے غور کرو جس کو ہر کوئی سمجھ سکے، بعضے لوگ ایسے ہیں جن کا حافظہ بہت قوی ہے، بعضے ایسے ہیں جن کو کوئی بات یاد نہیں رہتی، بعضے ایسے ہیں جنکے قویٰ قوی ہیں، بعضے نہایت ضعیف القویٰ ہیں، بعضے ایسے ہیں کہ کسی کام کو ایسا عمدہ کرتے ہیں کہ اوروں سے باوصف کوشش کے ایسا نہیں ہو سکتا، کسی کا ہاتھ خوشنویسی کے لایق ہوتا ہے، کسی کا مصوری کے، کسی کا دماغ علم ادب کے مناسب ہوتا ہے، کسی کا ریاضی کے، کسی کی بناوٹ کسی خاص امر کے ایسی مناسب ہوتی ہے کہ اُس کی مثل دوسرا نہیں ہو سکتا، پس یہہ تمام تفاوت انسانوں میں فطرت کے باعث سے ہیں، اور جو افعال کہ اُس فطرت پر مبنی ہیں، اُنکے صادر ہونے میں وہ مجبور ہیں۔

باایں ہمہ ہم انسانوں میں ایک اور چیز بھی پاتے ہیں جو نیک و بد میں تمیز کر سکتی ہے، یا ایک بات کو دوسری بات پر ترجیح دے سکتی ہے۔ یہہ قوت بھی کبھی بالکل اکثر قومی و ملکی و تمدنی اُمور کی الف و موانست سے اور بچپن سے کسی امر کی ممارست و تربیت و صحبت کے اثر سے موثر ہو جاتی ہے، اور اُس قوت کی ایسی حالت کو تمام اہل مذاہب کانشنس یعنی نور ایمان و نور بصیرہ سے تعبیر کرتے ہیں، مگر درحقیقت وہ قابل اعتماد اور لایق طمانیت کے نہیں ہے، کیونکہ اُسکا درست و غیر درست دونوں قسم کے اثروں سے موثر ہونا اور مخالف اثروں سے ایک ہی نتیجہ حاصل ہونا ممکن ہے، ایک مسلمان کیلئے کسی بت کو سجدہ کرنا بمقدار اُسکے نور ایمان کے برخلاف ہے، ویسا ہی ایک بت پرست کے نور دہرم کے موافق ہے، پس ایک شی دو مخالف نتیجے پیدا کرتی

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۶ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۷ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۸ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝۹

مگر اسکے سوا ایک اور قوت بھی انسان میں پائی جاتی ہے جو ان تمام اثرون پر غالب ہو جاتی ہے اور جسکو میں نور قلب یا نور فطرت کہتا ہون - ہمارے پاس بہت سے لوگون کی نسبت تاریخی شہادت موجود ہے جنہون نے بچپن سے ایک خاص قوم کی رسم و عادات میں تربیت پائی، اور اُنہیں ملکی و تمدنی باتون کے سوا اور کوئی خیال اُنکے دل میں نہیں گذرا، اور زمانہ دراز تک اُنہی قومی و ملکی و تمدنی امور کی الف و موانست میں رہے، اور ایک ہی سی صحبت پائی، اور ایک ہی سی تربیت ہوئی، اور پھر خود اُنہون نے اپنی سوچ سمجھہ اور غور و فکر سے جسکو الہام کہنا چاہیے اُن تمام بندشون کو توڑا، اور اُنکے عیبون کو جانا اور اپنے تئین اُس سے آزاد کیا اور اور لوگون کے آزاد کرنے میں کوشش کی -

یہہ قوت فکری کم و بیش تمام انسانون میں فطرتی ہے اور ہر شخص خود اپنے حال پر فکر کر کے سمجھ سکتا ہے کہ وہ اُس کے کام میں لانے پر قادر ہے، اور یہی وہ قوت ہے جو حق و باطل میں تمیز کرتی ہے اور اصلی سچ کو پرکھہ لیتی ہے، اور انسان کو اپنی حالت کی اصلاح پر متوجہ کرتی ہے، اور تمام بوجھون کو جو انسان پر بسبب اُسکی ملکی و تمدنی اور آبائی رسم و رواج کی الف و موانست سے ہوتی ہیں اُنکو اُٹھا دیتی ہے، اسی قوت کو زندہ رکھنے اور کام میں لانے کی، اور اُس بوجھہ یعنی ملکی و تمدنی و آبائی رسم و رواج کی الف و موانست کے اُٹھانے کی، جا بجا قرآن میں ہدایت ہوئی ہے، اور یہی قوت ہے جس کے باعث انسان مکلف ہوا ہے اور دیگر حیوانات سے افضل رکھا گیا ہے -

یہہ سچ ہے کہ یہہ قوت بھی انسانون میں بمقتضاے اُن کی خلقت کے قوی اور ضعیف ہے،

مہر کر دی ہے اللہ نے اُنکے دلوں پر اور اُنکے کانوں پر اور اُنکی آنکھوں پر پردہ ہے اور اُنکے
لئے بڑا عذاب ہے (۶) اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا پر اور اخیر دن پر
ایمان لائے ہیں حالانکہ وہ ایمان نہیں لائے (۷) دہوکا دیتے ہیں اللہ کو اور اُن
لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، حالانکہ وہ بجز اپنے آپ کے اور کسی کو دہوکا نہیں دیتے،
اور سمجھتے نہیں (۸) اُنکے دلوں میں بیماری ہے پھر خدا نے اُنکی بیماری کو بڑہا دیا اور اُنکے
لئے دکھ دینے والا عذاب ہے، اس بات پر کہ جھوٹ کہتے تھے (۹)

مگر معدوم نہیں، اور جن میں معدوم ہو وہ مکلف نہیں، بلکہ مرفوع القلم ہیں۔ کبھی یہہ قوت پند و نصیحت
اور سمجھانے بجھانے اور دلیلوں اور نشانیوں کے بتانے اور صحبت کے اثر سے تحریک میں آجاتی
ہے، جیسے کہ اُن لوگوں کا حال ہوتا ہے جو سچی راہ بتانے والوں کی ہدایتوں کو سمجھ کر اور یقین کر کر پیروی
کرتے ہیں بشرطیکہ اُس پیروی کی اور کوئی ایسی وجہہ ہو جس نے انسان کو خفیہ خفیہ اپنے افعال پر مجبور
کر دیا ہو، اور اُس ذاتی فطری قوت کو بغیر کام میں لائے اُس خفیہ مجبوری سے وہ پیروی نہ کی ہو۔ اور کبھی
وہ قوت فطری ایسی قوی ہوتی ہے کہ خود بخود اُس میں سے وہ روشنی اُٹھتی ہے، اور حق و باطل میں فرق
دکھاتی ہے، اور ملکی و تمدنی اور آبائی رسم و رواج کی الفت و موانست کے بوجھ کو اُٹھا دیتی ہے، یہی وہ لوگ
ہیں جو شرع کی زبان میں پیغمبر اور تمدنی اصطلاح میں رفارمر کہلاتے ہیں۔

یہی قوت تھی جس نے ایک جوان کے دل کو خود اپنی روشنی سے روشن کر دیا، جو 'اور' کلدانیا' میں رہتا تھا
اور جسکا نام ابراہیم تھا، بچپن سے اُس نے اپنے پیارے باپ کی گود میں پرورش پائی، بجز بتوں کے
اُس کی آنکھوں نے کچھ نہیں دیکھا، اور بجز بتوں کی پرستش کے نغموں کے اُس کے کانوں نے کچھ نہیں سنا
اور بغیر سمجھا تو یہہ سمجھا کہ ہائے میرا پیارا باپ اور میری پیاری قوم بڑی گمراہی میں ہے۔ یہہ سوچ کر گھبرایا
اور چاروں طرف دیکھنے لگا کہ پھر سچ کیا ہے؟ چاند کو روشن دیکھکر خیال کیا کہ شاید یہہ سچ ہو۔
سورج کو چمکتا دیکھ کر سوچا کہ شاید یہہ سچ ہو۔ مگر اُس نور فطرت نے بتایا کہ یہہ سب جھوٹ ہے، اُس
نے سب سے منہ موڑا اور سچی بات پکار اُٹھا کہ انی وجہت وجھی للذی فطر السموات والارض

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ﴿١٠﴾ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِنْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿١١﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِنْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٢﴾ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ﴿١٣﴾ اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١٤﴾

حنیفا وما انا من المشرکین"۔

ایک یتیم بن ماں باپ کے بچے کا حال سنو، جس نے نہ اپنی ماں کی کنار عاطفت کا لطف اُٹھایا، نہ اپنے باپ کی محبت کا مزہ چکھا، ایک ریگستان کے ملک میں پیدا ہوا، اور اپنے گرد بجز اونٹ چرانے والوں کے غول کے کچھ نہ دیکھا، اور بجز لات ومنات وعزیٰ کو پکارنے کی آواز کے کچھ نہ سنا، مگر خود کبھی نہ بھٹکا اور کہا تو یہہ کہا کہ "افرایتم اللات والعزیٰ ومنات الثالثة الاخریٰ" پس یہہ تمام روشنیاں اُس نور فطرت کی خود آپ ہی آپ روشن ہوئی تھیں، اور جنھوں نے نہ صرف اُن کو بلکہ تمام جہان کو منور کر دیا۔

(۱۲) (واذا قیل لهم) ان آیتوں میں اُس گفتگو کا اشارہ ہے جو منافق اور کافر آپس میں کرتے تھے یعنی کافر سمجھتے تھے کہ منافقوں کا اسطرح ظاہر میں اپنے تئیں مسلمان جتانا فساد ڈالنا ہے، تو وہ اُن سے کہتے تھے کہ تم فساد مت ڈالو اور اپنے تئیں مسلمان مت جتلاؤ، یا جسطرح اور لوگ سچ مچ مسلمان ہوگئے ہیں تم بھی ہو جاؤ، تو وہ اُن کو جواب دیتے تھے کہ ہمارا ظاہر میں مسلمانوں میں ملا رہنا فساد کی بات نہیں ہے، بلکہ اچھی بات ہے، نہ ہم اُن بیوقوفوں کیطرح ایمان لاسکتے ہیں، خدا تعالےٰ نے اُن منافقوں کی ان دونوں باتوں کی برائی بتلائی، اور ان آیتوں سے اگلی آیت میں اسطرح کی

اور جب اُن سے کہا جاوے کہ مت بگاڑ ڈالو دنیا میں تو کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو سنوارنیوالے ہیں (۱۰) ہاں وہی ہیں بگاڑنیوالے پر سمجھتے نہیں (۱۱) اور جب اُنسے کہویں کہ تم اسیطرح ایمان لاؤ جسطرح اور لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا ہم اسطرح ایمان لاویں جسطرح بیوقوف ایمان لائے ہیں، ہاں وہی ہیں بیوقوف پر جانتے نہیں (۱۲) اور جب وہ اُن لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے ہیں، تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ہیں، اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمھارے ساتھی ہیں، ہم تو اُن سے جی ٹھٹھا کرنیکیلیے، ہرکچھ نہیں کرتے (۱۳) اللہ اُن سے ٹھٹھا کرتا ہے اور اُنکو اُنکی گمراہی میں ٹکراتے ہوے ڈھیل دیکر کھینچتا ہے (۱۴)

گفتگو کا سبب فرمایا کہ اسطرح کی گفتگو کا سبب یہہ تھا کہ منافق جب مسلمانوں سے ملتے تھے تو کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں، اور جب کافروں میں جاتے تھے تو کہتے تھے کہ ہم مسلمانوں سے اپنے تئیں مسلمان بناکر ٹھٹھا کرتے ہیں، ہم تو درحقیقت تمھارے ہی ساتھی ہیں، کافر تو منافقوں کو اس لئے مفسد بتاتے تھے کہ وہ کافروں کو دھوکے میں ڈالتے تھے، اور خدا نے اُنکو اس لئے مفسد بتایا کہ مسلمانوں کو دھوکا دیتے تھے، منافق سچے مسلمانوں کو بیوقوف بتاتے تھے، مگر خدا نے اُنھی کو بیوقوف بتایا۔

(۱۴) (اللہ یستھزئ بھم) اس لفظ سے یہہ بحث کرنی کہ خدا کی شان سے ٹھٹھا کرنا کیونکر ہوسکتا ہے ٹھٹھے کی بات ہے، لوگوں میں بڑی غلطی ہے جو قرآن مجید کے ہر ایک لفظ کو قطع نظر کرکے انسانی محاورہ سے حقیقی ولغوی معنی لینے چاہتے ہیں، قرآن مجید جیسا کہ ہم یقین کرتے ہیں بیشک خدا کا کلام ہے، مگر وہ انسانوں کی زبان میں اور انسانوں کے محاورہ بات چیت میں بولا گیا ہے، پس جسطرح کہ ایک انسان دوسرے انسان سے بات کرتا ہے، اور اپنی گفتگو میں مجاز و استعارہ اور کنایہ کا استعمال کرتا ہے اور بعضی دفعہ عام مشہوریات کو بطور استدلال کے لاتا ہے، اور کبھی مخاطب کی وسعت علم و عقل وفہم کے مطابق طرز کلام اختیار کرتا ہے، کبھی محال امر کو محال بات پر تعلیق کرتا ہے، کبھی مزاحاً

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ
وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۵﴾ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا
فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ
لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۶﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷﴾ اَوْ كَصَيِّبٍ
مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ
فِىْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾
يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ

کوئی بات کھتا ہے، اسی طرح قرآن کو بھی سمجھنا چاہیئے اور انہیں اصولوں پر اُس کے معنی قرار دینے لازم ہیں
کبھی کبھی آپس میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ ہم کو کیا چڑاتا ہے، ہم ہی اُس کو چڑاتے ہیں، حالانکہ وہ اُس کو
کچھ نہیں چڑاتے، بلکہ اُسی کے چڑانے کو اپنا چڑانا تعبیر کرتے ہیں، اور اِس سے صرف مقصود اُس
شخص کی بیوقوفی کا جتلانا ہوتا ہے۔ اسی طرح کافروں کی بے وقوفی جتلانے کو اس مقام پر خدا نے
فرمایا کہ کافر مسلمانوں سے کیا ٹھٹھا کرتے ہیں، خدا اُن سے ٹھٹھا کرتا ہے، جو اُن کو ایسی حالت
میں چھوڑ رکھا ہے، پس کافروں کا مسلمانوں سے ٹھٹھا کرنا ہی خدا کا کافروں سے ٹھٹھا کرنا ہے

(۱۶) (مثلھم) میں آگ جلانیوالا یا موسلا دھار مینھ، مشبہ بہ نہیں ہیں بلکہ منافقوں کی
حالت کو اُن لوگوں کی حالت سے تشبیہ دی ہے جنھوں نے آگ جلانے والے کی روشنی
دیکھی اور پھر اندھیرے میں پڑ گئے (رات کو رستہ چلنے والے جلتی ہوئی آگ دیکھ کر رستہ
پہچانتے تھے اور قافلہ کے لوگوں کا پڑا ہونا خیال کرتے تھے اور جب آگ بجھ جاتی تھی تو
اندھیرے میں رستہ ٹٹولتے حیران کھڑے رہ جاتے تھے) یا جنھوں نے بجلی

یہہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت دیکر گمراہی کو خریدا ہی پھر اُنکی تجارت نے کچھ فائدہ نہ دیا اور نہ انھون نے ہدایت پائی ⑮ اُنکی مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی شخص نے آگ جلائی پھر جب اُس آگ نے جو کچھ کہ اُس کے اِرد گرد ہے اُسکو روشن کیا تو اللہ نے روشنی دیکھنے والون کی روشنی چھین لی اور اُنکو اندہیرون میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں دیکھتے ⑯ گونگے ہیں بہرے ہیں اندہے ہیں پھر وہ (راہ پر) نہین پلٹنے کے ⑰ یا اُنکی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے موسلادہار مینہہ کا برسنا، جس میں اندہیری اور کڑک اور چمک ہے بجلی کی کڑک سے موت کو ڈر کے مارے اپنے کانونمین اونگلیان ڈالتے ہیں، حالانکہ خدا کافرون کو گھیرے ہوئے ہی ⑱ بجلی اُنکی بینائی اُچک لیتی ہوئی لگتی ہے جب اُنکو روشنی معلوم ہوتی ہے تو اُس میں چلتے ہیں،

کی خوفناک چمک میں رستہ دیکھا اور پھر اندہیرے میں کھڑے رہ گئے، پھر دونون تشبیہیں منافقون کے حال کے مطابق تھیں، کہ اسلام کی روشنی سے کچھ کچھ راہ پر آتے تھے اور پھر گمراہی کے اندہیرے میں ٹکراتے رہ جاتے تھے۔

⑲ (یکاد البرق) ان آیتوں میں خدا تعالی نے فطرت انسانی کی وہ حالت بیان فرمائی ہے جو ایسے موقع پر مینہہ اور کڑک وچمک میں خوف سے ہو جاتی ہے، اور تھوڑا سا رستہ بھی دکھائی دیجاتا ہے، اور اس ظاہری تمثیل سے اُس تھوڑی سی ہدایت اور زیادہ تر گمراہی کی تمثیل سمجھائی ہے جو منافقون کے حال کے مناسب تھی، اور آخر کو اپنی قدرت کے قانون اور اپنے وجود کے آثار اور اپنی حکمت کاملہ کی نشانیون سے اپنے ہونے پر استدلال کیا ہے۔ تمام قرآن میں جس عمدگی وخوبی سے قوانین قدرت سے خدا تعالی نے اپنے وجود پر استدلال کیا ہے درحقیقت نہایت پیارا اور دل میں اثر کرنے والا اور بے مثل و بے نظیر ہے، اور یہہ ایسا عمدہ طریقہ استدلال کا ہے جو عالم اور جاہل سب کی سمجھ میں آتا ہے۔

وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ
إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ
وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۹﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ
فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ
الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۰﴾
وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا

(۲۱) (مما نزلنا) سے مراد قرآن ہے، جو نبی پر بذریعہ وحی کے خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے، پس اس مقام پر جب تک کہ وحی و نبوت کی حقیقت نہ بیان ہو اُس وقت تک اِس آیت کا مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا۔

وحی تو وہی ہوتی ہے جو اُسے پیغمبر کو دی جاتی ہے، مگر اگلے مفسرون نے اِسکا بیان کہ وہ کیونکر دی جاتی ہے ٹھیک طور پر نہیں کیا، اُنھون نے خدا و رسول کو دنیا کے بادشاہ اور وزیر کی مانند اور وحی کو بادشاہ کے کلام یا حکم یا پیغام کی مانند سمجھا ہے، اور جبرئیل کو ایک مجسم فرشتہ، بادشاہ و وزیر میں ایلچی پیغام لیجانے والا قرار دیا ہے۔

امام فخرالدین رازی تفسیر کبیر میں ارقام فرماتے ہیں، کہ آسمان پر جبرئیل خدا کا کلام سنکر آنحضرت پر اُترتے تھے اور وہ پیغام کہدیتے تھے۔ پھر اِس تقریر پر اُن کو یہہ مشکل پیش آئی، کہ خدا کے کلام میں تو حروف اور آواز نہیں ہے، پھر جبرئیل نے وہ کیونکر سُنا ہوگا، پھر اُسکا جواب یہہ دیا ہے، کہ ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ نے جبرئیل میں ایسی سماعت پیدا کی ہو جو خدا کا کلام سُن لیتا ہو، پھر اُس میں یہہ قدرت رکھی ہو کہ وہ عبارت میں اُسکی تعبیر کر سکے۔ اور یہہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدا نے لوح محفوظ میں اسی ترتیب سے قرآن پیدا کر دیا ہو اور جبرئیل نے اسکو پڑھکر یاد کر لیا ہو یا یہہ ہوا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کسی جسم دار

اور جب اُنپر اندھیرا چھاجاتا ہے تو کھڑے رہجاتے ہیں، اور اگر خدا چاہے تو اُنکی سماعت اور بینائی لیجاوے بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے، اے لوگو اپنے پروردگار کی بندگی کرو جسنے تمکو اور جو تم سے پہلے تھے اُنکو پیدا کیا تاکہ تم پرہیزگار ہو (۱۹) (خدا وہ ہے) جسنے بنایا تمھارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو ڈیرہ + اور آسمان سے پانی برسایا پھر اُس سے تمھارے کھانیکے لئے پھل اُگائے پھر اللہ کی برابر کسی کو مت کرو اور (یہ سب باتیں) تم جانتے ہو (۲۰) اور اگر تم شک میں پڑے ہو اُس چیز میں جو ہمنے نازل کی ہے

+ البناء مصدر سمی به المبنی بیتًا کان او قبۃ او خباء او طراف والبنیۃ العرب اخبیتھم ومنہ بنی علی امرأتہ لانھم کانوا اذا تزوجوا ضربوا علیھا خباء جدیدا (کشاف و بیضاوی)

میں سے خاص طرح کی آوازیں ٹھیر ٹھیر کر نکالی ہوں اور جبرئیل نے بھی اُسی کے ساتھ آواز ملالی ہو پھر اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو بتادیا ہو کہ یہی وہ عبارت ہے، جو ہمارے کلام قدیم کو پورا ادا کردیتی ہے۔

یہہ تقریریں ہمارے علمائے قدیم کی اُسی قسم کی تقریریں ہیں جن پر آج لوگ ہنستے ہیں، اور قرآن مجید اور مذہب اسلام کو مثل اس تقریر کے لغو سمجھتے ہیں۔ امام صاحب نے اِس بات پر غور نہیں فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ نے آنحضرت ہی میں ایسی سماعت یا لوح محفوظ میں سے پڑھنے کی قدرت یا جس جسم میں سے وہ اونچی نیچی آوازیں نکلتی تھیں اُن سے کلام سمجھ لینے کی طاقت کیوں نہیں پیدا کی جو خدا کا کلام سن لیتے اور سمجھ لیتے تاکہ اس تکلیف کی کہ جبرئیل سنیں پھر اُس کی عبارت بنائیں پھر آنحضرت کو آکر سنائیں حاجت نہ رہتی۔ اِسکی بھی تشریح امام صاحب نے نہیں فرمائی، کہ اُن اونچی نیچی آوازوں سے، آواز ملالینے کے بعد جبرئیل کو خدا نے کیونکر بتایا کہ یہہ وہی عبارت ہے، آیا اُنھی اونچی نیچی آوازوں سے، اُن سے تو جاننا محال تھا، کیونکہ دور لازم آتا ہے، پھر اور کسی طرح بتایا ہوگا، مگر پہلے ہی اُس طرح بتادیا ہوتا "ولاشک ان ھذہ ھفوات لیس لھا فی الاسلام نصیب"، نبوت کو بھی علمائے متقدمین نے ایک عہدہ سمجھا ہے، کہ خدا جسکو چاہتا ہے یا جسکو منتخب کرتا ہے دیدیتا ہے۔ جیسے بادشاہ اپنے بندوں میں سے کسی کو وزیر کسیکو دیوان کسیکو بخشی کردیتا ہے، اور وہ اُس منصب کو لیکر وہ کام شروع کرتا ہے، اور مبعوث ہونے کے ٹھیک یہی معنی اُنھوں نے

عَلٰی عَبۡدِنَا

سمجھے ہیں۔

مگر میری سمجھ یہہ نہیں ہے میں نبوت کو ایک فطری چیز سمجھتا ہوں۔ نبی گو اپنی ماں کے پیٹ ہی میں کیوں نہو نبی ہوتا ہے "النبی نبی ولو کان فی بطن امہ" جب پیدا ہوتا ہے تو نبی ہی پیدا ہوتا ہے، جب مرتا ہے تو نبی ہی مرتا ہے۔

نبی کا لفظ یہودیوں میں زیادہ تر مستعمل تھا، وہ اُسکو لفظ نبا سے مشتق کرتے تھے جسکے معنی خبر دینے کے ہیں۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ انبیا مثل نجومیوں کے دنیا کی باتوں میں سے غیب کی بات یا آیندہ ہونے والی باتیں بتا دیتے ہیں۔ شاید اتنا فرق سمجھتے ہوں کہ نجومی ستاروں کے حساب یا شیطانوں کے اسرار سے بتاتے تھے، اور انبیا ربانی کرشمہ سے، پس جو شخص کہ کوئی پیشین گوئی نہیں کرتا تھا اُسکو نبی یا پیغمبر نہیں کہتے تھے، مگر اسلام میں اور مسلمانوں میں یہہ خیال نہیں ہے، وہ اُن سب کو جن پر خدا نے وحی نازل کی ہے نبی جانتے ہیں اور پیغمبر مانتے ہیں، گو کہ اُس نے کوئی بھی پیشین گوئی نہ کی ہو، بلکہ مذہب اسلام تو یہہ بتاتا ہے کہ "لا یعلم الغیب الا ھو" یہی سبب ہے کہ قرآن مجید میں ہر ایک صاحب وحی کو نبی یا پیغمبر لکھا گیا ہے جن میں سے اکثر کو جیسے داؤد و سلیمان کو یہودی نبی نہیں کہتے۔

بہرحال اس لفظی بحث کو جانے دو، نبوت درحقیقت ایک فطری چیز ہے جو انبیا میں بمقتضائے اُنکی فطرت کے مثل دیگر قوای انسانی کے ہوتی ہے۔ جس انسان میں وہ قوت ہوتی ہے وہ نبی ہوتا ہے اور جو نبی ہوتا ہے اُس میں وہ قوت ہوتی ہے۔ جس طرح کہ تمام ملکات انسانی اُسکی ترکیب اعضا، دل و دماغ و خلقت کی مناسبت سے علاقہ رکھتے ہیں، اسی طرح ملکہ نبوت بھی اُس سے علاقہ رکھتا ہے یہہ بات کچھ ملکہ نبوت ہی پر موقوف نہیں ہے، ہزاروں قسم کے جو ملکات انسانی ہیں بعضی دفعہ کوئی خاص ملکہ کسی خاص انسان میں از روے خلقت و فطرت کے ایسا قوی ہوتا ہے کہ وہ اُسی کا امام یا پیغمبر کہلاتا ہے۔ لوہار بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے، شاعر بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے، ایک طبیب بھی فن طب کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے، مگر جو شخص روحانی امراض کا طبیب ہوتا ہے، اور جس میں اخلاق انسانی کی تعلیم و تربیت کا ملکہ بمقتضاے اُس کی فطرت کے خدا سے عنایت ہوتا ہے، وہ پیغمبر کہلاتا ہے۔ اور جسطرح کہ

اسپنے بندے پر

اور قوائے انسانی بمناسبت اُسکے اعضا کے قوی ہوتے جاتے ہیں اُسی طرح یہہ ملکہ بھی قوی ہوتا جاتا ہے، اور جب اپنی پوری قوت پر پہونچ جاتا ہے، تو اس سے وہ ظہور میں آتا ہے جو اُس کے مقتضیٰ ہوتا ہے جسکو عرف عام میں نبوت سے تعبیر کرتے ہیں خدا اور پیغمبر میں بجز اُس ملکۂ نبوت کے جسکو ناموس اکبر اور بزبان شرع جبریل کہتے ہیں اور کوئی ایلچی پیغام پہونچانے والا نہیں ہوتا، اُس کا دل ہی وہ آئینہ ہوتا ہے جس میں تجلیات ربانی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے، اُس کا دل ہی وہ ایلچی ہوتا ہے جو خدا پاس پیغام لے جاتا ہے اور خدا کا پیغام لے کر آتا ہے، وہ خود ہی وہ مجسم چیز ہوتا ہے جس میں سے خدا کے کلام کی آوازیں نکلتی ہیں، وہ خود ہی وہ کان ہوتا ہے جو خدا کے بے حرف و بے صوت کلام کو سنتا ہے، خود اُسی کے دل سے فوارہ کی مانند وحی اُٹھتی ہے، اور خود اُسی پر نازل ہوتی ہے، اُسی کا عکس اُس کے دل پر پڑتا ہی، جس کو وہ خود ہی الہام کہتا ہے، اُس کو کوئی نہیں بلواتا بلکہ وہ خود بولتا ہے اور خود ہی کہتا ہے، "وما ینطق عن الهوی ان هو الا وحی یوحی"۔

جو حالات و واردات ایسے دل پر گذرتے ہیں، وہ بھی بمقتضائے فطرت انسانی اور سب کے سب قانون فطرت کے پابند ہوتے ہیں، وہ خود اپنا کلام نفسی ان ظاہری کانوں سے اسی طرح پر سنتا ہے جیسے کوئی دوسرا شخص اُس سے کہہ رہا ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو ان ظاہری آنکھوں سے اس طرح پر دیکھتا ہے جیسے دوسرا شخص اُس کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔

ان واقعات کے بتلانے کو، اگر چہ یہہ قول یاد آتا ہے کہ، "قدر ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی"، مگر ہم بطور تمثیل کے، گو وہ کیسی ہی کم رتبہ ہو اس کا ثبوت دیتے ہیں، ہزاروں شخص ہیں جنھوں نے مجنونوں کی حالت دیکھی ہوگی، وہ بغیر بولنے والے کے اپنے کانوں سے آوازیں سنتے ہیں، تنہا ہوتے ہیں مگر اپنی آنکھوں سے اپنے پاس کسی کو کھڑا ہوا باتیں کرتا ہوا دیکھتے ہیں، وہ سب اُنھیں کے خیالات ہیں، جو سب طرف سے بے خبر ہو کر ایک طرف مصروف اور اُس میں مستغرق ہیں، اور باتیں سنتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں، پس ایسے دل کو جو فطرت کی رو سے تمام چیزوں سے بے تعلق اور روحانی تربیت پر مصروف و اُس میں مستغرق ہو ایسی واردات کا پیش آنا کچھ بھی خلاف فطرت انسانی نہیں ہے، ہاں ان دونوں میں اتنا فرق ہی کہ پہلا مجنون ہی، اور پچھلا پیغمبر، گو کہ کافر پچھلے کو بھی مجنون بتاتے تھے۔

فائدہ

پس وحی وہ چیز ہے جسکو قلب نبوت پر بسبب اُسی فطرت نبوت کے مبدء فیاض نے نقش کیا ہے۔ وہی انتقاش قلبی کبھی مثل ایک بولنے والی آواز کے انھی ظاہری کانوں سے سُنائی دیتا ہے، اور کبھی وہی نقش قلبی دوسرے بولنے والے کی صورت میں دکھائی دیتا ہے، مگر بجز اپنے آپ کے نہ وہاں کوئی آواز ہے نہ بولنے والا، خدا نے بہت سی جگہہ قرآن میں جبرئیل کا نام لیا ہے، مگر سورہ بقرہ* میں اُسکی ماہیت بتادی ہے، جہاں فرمایا ہے کہ "جبرئیل نے تیرے دل میں قرآن کو خدا کے حکم سے ڈالا ہے" دل پر اوتارنیوالی یا دل میں ڈالنے والی، وہی چیز ہوتی ہے جو خود انسان کی فطرت میں ہو، نہ کوئی دوسری چیز جو فطرت سے خارج، اور خود اُس کی خلقت سے جسکے دل پر ڈالی گئی ہے جداگانہ ہو، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُسی ملکہ نبوت کا جو خدا نے انبیا میں پیدا کیا ہے جبرئیل نام ہے - یہی مطلب قرآن کی بہت سی آیتوں سے پایا جاتا ہے جیسے کہ سورہ قیامۃ میں فرمایا ہے کہ "ان علینا جمعہ وقرآنہ" یعنی ہمارا ذمہ ہے وحی کو تیرے دل میں اکٹھا کر دینے اور اُسکے پڑھ دینے کا، "فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ" پھر جب ہم اُس کو پڑھ چکیں تو اُس پڑھنے کی پیروی کر، "ثم ان علینا بیانہ" پھر ہمارا ذمہ ہے اُس کا مطلب بتانا، اِن آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا اور پیغمبر میں کوئی واسطہ نہیں ہے، خود خدا ہی پیغمبر کے دل میں وحی جمع کرتا ہے وہی پڑھتا ہے وہی مطلب بتاتا ہے، اور یہہ سب کام اُسی فطری قوت نبوت کے ہیں، جو خدا تعالیٰ نے مثل دیگر قوائے انسانی کے انبیا میں مقتضائے اُنکی فطرت کی پیدا کی ہے، اور وہی قوت ناموس اکبر ہے، اور وہی قوت جبرئیل پیغامبر۔

اسیطرح خدا تعالیٰ سورہ والنجم میں فرماتا ہے، "وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی" یعنی محمد صلعم اپنی خواہش نفس سے نہیں کہتا مگر یہہ تو وہ بات ہے جو اُس کے دل میں ڈالی گئی ہے، "علمہ شدید القوی ذو مرۃ" اُسکو سکھایا ہے بڑے قوت والے صاحب دانش نے "فاستوی وھو بالافق الاعلیٰ" پھر ٹھیرا اور وہ بہت بلند کنارہ پر تھا "ثم دنی فتدلیٰ" پھر پاس ہوا اور ادھر کھڑا ہوا "فکان قاب قوسین او ادنیٰ" پھر دو کمانوں یا اُس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا "فاوحی الی عبدہ ما اوحی" پھر اپنے بندہ کے دل میں ڈالی وہ بات جو ڈالی - یہہ تمام مشاہدہ اگر انہیں ظاہری آنکھوں سے تھا، تو وہ عکس خود اپنے دل کی تجلیات ربانی کا تھا، جو بمقتضائے فطرت انسانی و فطرت نبوت دکھائی

* فانہ نزلہ علیٰ قلبک باذن اللہ (بقر آیت (۹۱)

تو تم لاؤ

دیتا تھا، اور دراصل بجز ملکہ نبوت کے جسکو جبرئیل کہو یا اور کچھ نہ تھا۔

علماے اسلام نے انبیا اور عام انسانون میں، بجز اُسکے کہ اُنکو ایک عہدہ مل گیا ہے جو ممکن تھا کہ اُنمین سے بھی کسی کو مل جاتا، اور کچھ فرق نہیں سمجھا، اور اسی سئے اشاعرہ و ماتریدیہ نے نبی اور اُمت کی مثال سلطان و رعیت کی سمجھی ہے مگر میری سمجھ میں یہہ مثال ٹھیک نہیں ہے، نبی او اُمت کی مثال، راعی و غنم کی سی ہے گو نبی و اُمت انسانیت میں شریک ہیں، جیسے کہ راعی و غنم حیوانیت میں، مگر نبی و اُمت میں فطرۃ نبوت کی ایسی ہی فصل ہے جیسے کہ راعی و غنم میں ناطقیت کی۔

قرآن مجید کا نجماً نجماً نازل ہونا بھی بڑی دلیل اس بات کی ہے کہ وہ بمقتضاے اُسی فطرت کے نازل ہوا ہے، ہم بمقتضاے فطرت انسانی یہہ بات دیکھتے ہیں کہ تمام ملکات انسانی کسی محرک یعنی کسی امر کے پیش آنے پر اپنا کام کرتے ہیں، اسیطرح ملکہ نبوت بھی جبھی اپنا کام کرتا ہے جبکہ کوئی امر پیش آتا ہے۔ ہمارے دل میں سینکڑون مضمون ہوتے ہیں، سینکڑون نصیحتین ہوتی ہیں، اشعار یاد ہوتے ہیں، دوستون کی صورتین اور مکانون کے باغون اور جنگلون کی تصویریں دماغ میں موجود ہوتی ہیں مگر جب تک اُنپر متوجہ ہونے کا کوئی سبب نہو وہ سب بے معلوم رہتی ہیں، یہی حال ملکہ نبوت کا ہی نبی معہ اپنے ملکہ نبوت کے موجود ہوتا ہے کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا ہے، جاگتا ہے دنیوی باتین جنکو نبوت سے کچھ تعلق نہیں ہے اسیطرح پر کرتا ہے جسطرح کہ اور تمام انسان کرتے ہیں، مگر جب کوئی ایسا امر پیش ہوتا ہے جو اُس ملکہ نبوت کی تحریک کا باعث ہو، اُسوقت وہ ملکہ نبوت اپنا کام کرتا ہے، اُسی باریک دقیقہ کی طرف خدا نے اشارہ کرنے کو اپنے نبی کی زبان سے یہہ کہوایا کہ "انا بشر مثلکم یوحی الی انما الھکم الہ واحد" اور خود آنحضرت نے فرمایا کہ انما انا بشر اذا امرتکم بشی من امر دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشی من رائی فانما انا بشر" (رواہ مسلم) یعنی میں بھی تو انسان ہی ہوں جب تمکو تمھارے دین کی کسی بات کا حکم دون تو اُسکو مان لو اور جب میں کوئی بات اپنی راے سے کہوں تو بیشک میں بھی انسان ہوں۔

(فاتوا بسورۃ من مثلہ) ہمنے شروع تفسیر میں سورۃ کے لفظ کی تحقیق میں بتایا تھا کہ جہاں قرآن میں لفظ سورۃ کا آیا ہے اُس سے کوئی سورۃ جو سورتون کے نام سے مشہور ہیں مراد نہیں ہے، بلکہ کوئی حصہ قرآن کا مراد ہے۔

بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۱)

جو لوگ کہ قرآن پر خدا کی وحی سے ہونے میں شبہہ کرتے تھے انکا شبہہ مٹانے کو خدا نے اُن سے فرمایا کہ اگر تم اسکو خدا سے نہیں سمجھتے تو تم بھی اس کی مانند لاؤ۔

یہہ مضموں کئی طرح پر قرآن میں آیا ہے۔ اِس مقام پر تو یہہ فرمایا ہے کہ قرآن کے کسی ٹکڑے یا حصہ کی مانند تم بھی لاؤ۔

اسی طرح سورہ یونس † میں فرمایا ہے کہ کیا کافر قرآن کو کہتے ہیں کہ یوں ہی بنا لیا ہے تو تو اُن سی کہ کہ اُس کے ٹکڑے یا حصہ کی مانند تم بھی بنا لاؤ"۔

اور سورہ ہود ‡ میں فرمایا ہے کہ کیا کافر قرآن کو کہتے ہیں کہ یون ہی بنا لیا ہے تو تو اُن سے کہ کہ اُس کے دس ہی ٹکڑون یا حصوں کی مانند تم بھی یون ہی بنا لاؤ۔

اور سورہ اسریٰ § میں فرمایا ہے کہ "تو کہدے کہ اگر جن وانس اس بات پر جمع ہون کہ اس قرآن کی مانند بنا لاویں تو اُس کی مانند نہ بنا لا سکیں گے"

اور سورہ قصص ‖ میں فرمایا ہے کہ "تو اُن سے کہدے کہ خدا کے پاس سے کوئی کتاب لاؤ جو توریت و قرآن سے زیادہ ہدایت کرنے والی ہو"

اِن سب آیتون پر غور کرنے کے بعد اس بات کو سمجھنا چاہیئے کہ قرآن کی مانند سے کیا مراد ہے ہماری تمام علماء و مفسرین نے یہہ خیال کیا ہے کہ قرآن نہایت اعلیٰ درجہ فصاحت و بلاغت پر واقع ہوا ہی اور اُس زمانہ میں اہل عرب کو فصاحت و بلاغت کا بڑا ہی دعویٰ تھا۔ پس خدا نے قرآن کے من اللہ ثابت کرنیکو یہہ معجزہ قرآن میں رکھا کہ ویسا فصیح کلام کوئی بشر نہیں کہہ سکتا اور نہیں کہہ سکا پس اُنھوں نی قرآن کی مانند سے فصاحت و بلاغت میں مانند ہونا مراد لیا ہی۔

† ام يقولون افتراه قل فاتوا بسورة من مثله وادعوا من استطعتم من دون الله ان كنتم صادقين (یونس ۳۹)

‡ ام يقولون افتراه قل فاتوا بعشر سور مثله مفتريات وادعوا من استطعتم من دون الله ان كنتم صادقين۔ (هود ۱۶)

§ قل لئن اجتمعت الانس والجن على ان ياتوا بمثل هذا القرآن لا ياتون بمثله ولو كان بعضهم لبعض ظهيرا (اسریٰ ۹۰)

‖ قل فاتوا بكتاب من عند الله هو اهدى منهما اتبعه ان كنتم صادقين۔ (قصص ۴۹)

اُسکی مانند کوئی سورۃ اور خدا کے سوا اپنے حمایتیونکو بھی بُلالو اگر تم سچے ہو (۲۱)

مگر میری سمجھ میں ان آیتون کا یہہ مطلب نہیں ہے اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ قرآن مجید نہایت اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ فصاحت و بلاغت پر واقع ہے اور جوکہ وہ الہی وحی ہے جو پیغمبر کے قلب نبوت پر نہ بطور معنی و مضمون کے بلکہ بلفظہ ڈالی گئی تھی، جس کے سبب سے ہم اُس کو وحی متلو یا قرآن یا کلام خدا کہتے اور یقین کرتے ہیں اسلئے ضرور تھا کہ وہ ایسے اعلیٰ درجہ فصاحت پر ہو، جو بے مثل و بے نظیر ہو، مگر یہہ بات کہ اُس کی مثل کوئی نہیں کہہ سکا یا کہہ سکتا، اُس کے من اللہ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی کسی کلام کی نظیر نہونا اِس بات کی تو بلا شبہہ دلیل ہے، کہ اُس کی مانند کوئی دوسرا کلام موجود نہیں ہے، مگر اسکی دلیل نہیں ہے، کہ وہ خدا کی طرف سے ہے، بہت سے کلام انسانون کے دنیا میں ایسے موجود ہیں، کہ انکی مثل فصاحت و بلاغت میں آج تک دوسرا کلام نہیں ہوا، مگر وہ من اللہ تسلیم نہیں ہوتے، نہ ان آیتون میں کوئی ایسا اشارہ ہے جس سے فصاحت و بلاغت میں معارضہ چاہا گیا ہو، بلکہ صاف پایا جاتا ہے کہ جو ہدایت قرآن سے ہوتی ہے اُس میں معارضہ چاہا گیا ہے، کہ اگر قرآن کے خدا سے ہونے میں شبہہ ہے، تو کوئی ایک سورۃ یا دس صورتیں یا کوئی کتاب مثل قرآن کے بنالاؤ جو ایسی ہادی ہو۔ سورہ قصص میں آنحضرت کو صاف حکم دیا گیا ہے کہ، "تو کافرون سے کہدے کہ کوئی کتاب جو توریت و قرآن سے زیادہ ہدایت کرنیوالی ہو اُسے لاؤ"، توریت کی عبارت فصیح نہیں ہے، بلکہ عام طور کی عبارت ہے، اِس لئے کہ علاوہ قومی دستورات و تاریخ نہ مضامین کے جو اُسکے جامع نے اُس میں شامل کئے ہیں، جسقدر مضامین وحی کے اُس میں ہیں انکا الفاظ بھی بلفظہ شاید بجز احکام عشرہ توریت کے جن کو حضرت موسیٰ نے پہاڑ میں بیٹھ کر پتھر کی تختیون پر کھود لیا تھا، پایا نہیں جاتا، پس ظاہر ہے کہ قرآن گو کیسا ہی فصیح ہو، مگر جو معارضہ ہے، وہ اُس کی فصاحت و بلاغت یا اُس کی عبارت کے بے نظیر ہونے پر نہیں ہے، بلکہ اُس کے بے مثل ہادی ہونے میں ہے جو بالتصریح سورہ قصص کی آیت میں بیان ہوا ہے، ہاں اُس کی فصاحت و بلاغت اُس کے بے نظیر ہادی ہونے کو زیادہ تر روشن و مستحکم کرتی ہے۔

اِن آیتون کے مخاطب اہل عرب تھے، پس جب قرآن نازل ہوا تو اُسوقت جو عرب کا حال تھا اُس کو ذرا اِس طرح پر خیال میں لانا چاہیئے کہ اُس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے جم جاوے۔ وہ

فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿٢٤﴾

نام قوم ایک لٹیری، چور، و قزاق، خانہ بدوش قوم تھی جو مثل کنجرون کے اپنا ڈیرہ گدھوں و خچروں پر لادی پڑی پھرتی تھی غیر قومون نے "سارسین" جو لفظ "سارقین" کا محرف ہے خطاب دیا تھا، بغض و عداوت وکینہ جو بدترین خصائص انسانی سے ہیں اُن کے رگ و ریشہ میں پڑا ہوا تھا یہاں تک کہ وہاں کے جانور بھی کینہ میں ضرب المثل ہیں (شترکینہ) خونریزی، بے رحمی، قتل اولاد اُن میں ایسے درجہ پر تھی جس کی نظیر کسی قوم کی تاریخ میں نہیں پائی جاتی، کنواری اور بیاہی عورتیں زنا کو اپنا فخر سمجھتی تھیں، جس طرح مرد کسی نامی عورت یا مشہور خاندان کی عورت سے زنا کرنا فخریہ اپنی قوم میں بیان کرتا تھا، اسی طرح عورتیں کسی نامی یا مشہور خاندانی مرد سے زنا کرنا فخریہ بیان کرتی تھیں، قوم کی قوم جاہل و اُمی تھی، بجز شراب خواری و بت پرستی کے کچھ کام نہ تھا، اور قوموں سے ایسے گوشے میں پڑی ہوئی تھیں کہ کچھ روشنی تعلیم و تربیت کی اُن تک نہیں پہونچی تھی، اُسی قوم میں کا ایک شخص جس نے چالیس برس اپنی عمر کے اُنھی کے ساتھ صرف کئے تھے، ربانی روشنی سے جو خدا نے بمقتضائے فطرت اُس میں رکھی تھی منور ہوا، اور روحانی تربیت کے حقایق و دقایق ایسے الفاظ میں جو عالم اور حکیم اور فلسفی اور نیچرلسٹ و دہریہ سے لیکر عام جاہلوں بدوں صحرا نشینوں کی ہدایت کے لئے بھی یکساں مفید تھے علانیہ بیان کئے، جو ممکن نہ تھا کہ بغیر اس کے کہ وہ خدا کی طرف سے ہوں بیان کئے جاسکتے، فطرت کے قاعدے کے مطابق ممکن نہ تھا کہ بغیر اُس فطرت نبوت کے جو خدا اپنے انبیاء میں ودیعت کرتا ہے ایسی قوم کے کسی شخص کے اسطرح کے خیالات اور اقوال و نصایح ہوں، جیسے کہ قرآن میں ہیں، یا ایسی تاریک و خراب حالت کی قوم کا کوئی شخص بغیر اُس نور کے جو خدا نے اُسکو دیا ایسی ہدایتیں بتادے جیسی کہ قرآن میں ہیں، یہ بجز خدا سے ہونے کے اور کسی طرح ہو ہی نہیں سکتیں، اسی امر کی نسبت خدا نے فرمایا کہ اگر تم کو اس کے خدا سے ہونے میں شک ہے تو فاتوا بسورۃ من مثلہ۔

پھر اگر تم نہ کر سکے اور نہ کر سکو گے تو بچو اُس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، جو طیار ہے کافروں کے لئے (۲۲)

(۲۲) (فان لم تفعلوا) اور پھر فرمایا کہ اگر تم نہ کر سکے اور پھر بطور یقین کے فرمایا کہ نہ کر سکو گے (کیونکہ ایسی قوم کے ایسے خیالات ہونے جیسے کہ قرآن میں ہیں ممکن ہی نہ تھے) تو اُس کو خدا کی طرف سے سمجھ لو اور عذاب سے بچو۔

ان آیتوں میں خدا تعالیٰ نے جنت و نار یا دوزخ و بہشت کا ذکر کیا ہے، جنت و نار کی نسبت لفظ "اعدت" جس کے معنی طیار یا آمادہ کے ہیں چار جگہہ قرآن مجید میں آیا ہے اول تو اسی آیت میں ہے "اعدت للکافرین" اور پھر سورہ آل عمران میں ہے "واتقوا النار التی اعدت للکفرین" اور پھر اسی سورت میں جنت کی نسبت دوسری جگہہ ہے "اعدت للمتقین" اور پھر سورہ حدید میں ہے "اعدت للذین اٰمنوا باللہ ورسلہٖ" اور اس لفظ پر علماے اسلام نے استدلال کر کر یہہ عقیدہ قایم کیا ہے کہ "الجنۃ والنار مخلوقتان" یعنی بہشت اور دوزخ دونوں پیدا ہو چکی ہیں، یعنی بالفعل موجود ہیں۔ مگر غور کرنے سے پایا جاتا ہے کہ ان آیتوں سے یا "اعدت" کے لفظ سے یہہ نتیجہ نہیں نکلتا۔

تمام قرآن کا طرز بیان اس طرح پر ہے کہ آیندہ کی باتوں کا جو یقینی ہونے والی ہیں ماضی کے صیغوں سے بیان کیا جاتا ہے، جو اُن کے قطعی ہونے پر دلالت کرتے ہیں، اسی طرح ان آیتوں میں جو باتیں ہونے والی ہیں اُن کو بطور ہو چکی، یعنی ماضی کے صیغہ سے بیان کیا ہے، مثلاً پہلی آیت میں فرمایا ہے "بچو اُس آگ سے جس کا ایندہن آدمی اور پتھر ہیں اور جو تیار ہے کافروں کیلئے" آدمیوں پر ایندہن کا اطلاق اُسوقت ہو سکتا ہے جب وہ آگ بھڑکانے کیلئے آگ میں ڈالے جاوینگے اور اُن علماء اسلام کے نزدیک اگر یہہ ہوگا تو قیامت میں حساب و کتاب کے بعد ہوگا اِس وقت نہ کوئی آدمی جہنم کی آگ کا ایندہن ہے، اور نہ کوئی ایسی آگ موجود ہے جس کا ایندہن آدمی ہوں، ممکن ہے کہ کہا جاوے کہ ایسا ہوگا، پس اگر ہوگا تو بالفعل موجود ہونا قایم نہ رہا۔

دوسری آیت میں بہشتیوں کی نسبت پھل کا ملنا اور ایک سے پھل کا ملنا اور اُنکا کہنا کہ یہہ تو وہی ہے جو پہلے ملا تھا، سب ماضی کے صیغوں سے بیان ہوا ہے، حالانکہ اگر یہہ ہوگا تو قیامت کے بعد ہوگا، جب لوگ حساب و کتاب دیکر بہشت میں جاوینگے۔ علاوہ اسکے اگر کسی کام کا بدلا یا کسی جرم کی سزا یقینی ہو تو اس کہنے سے کہ اگر تم یہہ بات کروگے تو اُسکا

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

یہ صلہ اور یہہ جرم کروگے تو اس کی یہہ سزا تمھارے لئے طیار ہے، یہہ لازم نہیں آتا کہ وہ صلہ یا ذریعہ سزا بالفعل موجود بھی ہو، بلکہ اِس طرز کلام کا صرف یہہ مفاد ہے کہ وہ بدلا یا سزا ملنی یقینی ہے پس یہہ مسئلہ کہ بہشت اور دوزخ دونوں بالفعل مخلوق و موجود ہین قرآن سے ثابت نہیں۔

جنت یا بہشت کی ماہیت جو خود خدا تعالیٰ نے بتلائی ہے وہ تو یہہ ہے "فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعين جزاء بما كانوا يعملون"* یعنی کوئی نہیں جانتا کہ کیا اُنکے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک (یعنی راحت) چھپا رکھی گئی ہے اُس کے بدلے میں جو وہ کرتے تھے۔

پیغمبر خدا صلعم نے جو حقیقت بہشت کی فرمائی، جیسے کہ بخاری و مسلم نے ابو ہریرہ کی سند پر بیان کیا ہے وہ یہہ ہے، "قال الله تعالى اعددت لعبادى الصالحين ما لا عين رات ولا اذن سمعت ولا خطر على قلب بشر" یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیار کی ہے مینے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیز جو نہ کسی آنکھہ نے دیکھی ہے اور نہ کسی کان نے سنی ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں اُسکا خیال گذرا ہے۔ پس اگر حقیقت بہشت کی یہی باغ اور نہریں اور موتی کے اور چاندی سونے کی اینٹوں کے مکان اور دودھ و شراب اور شہد کے سمندر اور لذیذ میوے اور خوبصورت عورتیں اور لونڈے ہوئی تو یہہ تو قرآن کی آیت اور خدا کے فرمودہ کے بالکل مخالف ہے، کیونکہ اِن چیزوں کو تو انسان جان سکتا ہے، اور اگر فرض کیا جاوے کہ ویسی عمدہ چیزیں نہ آنکھوں نے دیکھیں نہ کانوں نے سنیں تو بھی، "ولا خطر على قلب بشر" سے خارج نہیں ہو سکتیں، عمدہ ہونا ایک اضافی صفت ہے اور جب کہ اُن سب چیزوں کا نمونہ دنیا میں موجود ہے تو اُس کی صفت اضافی کو جہاں تک کہ ترقی دیتے جاؤ انسان کے دل میں اُس کا خیال گذر سکتا ہے، حالانکہ بہشت کی ایسی حقیقت بیان ہوئی ہے کہ، "لا خطر على قلب بشر"

* سورۃ السجدہ - آیت ۱۷

اور بشارت دی اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور اچھے کام کئے ہیں کہ اُن کے لئے جنتیں ہیں، جنکے نیچے نہریں بہتی ہیں،

پس بہشت کی جو یہہ تمام چیزیں بیان ہوئی ہیں درحقیقت بہشت میں جو "قرۃ اعین" ہوگا اُسکے سمجھانے کو بقدر طاقت بشری تمثیلیں ہیں، نہ بہشت کی حقیقتیں۔

انسان مطابق اپنی فطرت کے اُنھی چیزوں کو سمجھ سکتا ہے اور اُنھی کا خیال اُسکے دل میں آسکتا ہے، جو اُس نے دیکھی یا چھوئی یا چکھی یا سونگھی یا قوت سامعہ سے محسوس کی ہوں، اور بہشت کی جو "قرۃ اعین" یعنی راحت یا لذت ہے اُسکو نہ انسان نے دیکھا ہے، نہ چھوا ہے نہ چکھا ہے، نہ سونگھا ہے، نہ قوۃ سامعہ نے اُس کا حس کیا ہے، پس فطرت انسانی کے مطابق انسان کو اُس کا بتلانا ناممکن ہے، اسکے سوا ایک اور مشکل درپیش ہے، کہ جو کچھ انسان کو بتایا جاتا ہے وہ اُن الفاظ سے تعبیر ہوتا ہے جو انسان کی بول چال میں ہیں، اور جو چیز کہ انسان نے نہ دیکھی نہ چھوئی نہ چکھی نہ سونگھی نہ قوت سامعہ سے حس کی، اُس کے لئے کوئی لفظ انسان کی زبان میں نہیں ہوتا، اور اس لئے اُسکا تعبیر کرنا گوکہ خدا ہی تعبیر کرنا چاہے محالات سے ہے۔ اِسکے سوا ایک اور سخت مشکل یہہ ہے، کہ کوئی انسان اُن کیفیات کو بھی جو اس دنیا میں ہیں تعبیر نہیں کرسکتا، کوئی شخص کھٹاس، مٹھاس، درد، دکھ، رنج وراحت، کی کچھ بھی کیفیت نہیں بتا سکتا، یا اُسکے لئے دوسرا لفظ بدل دیتا ہے، یا کوئی مشابہت اور نظیر اُس کی لاتا ہے، جو وہ بھی مثل پہلی کے محتاج بیان ہوتی ہے" پس بہشت کی کیفیت یا لذت کا جس کو "قرۃ اعین" سے تعبیر کیا ہے بیان کرنا گوکہ خدا ہی اُس کا بیان کرنا چاہے محال سے بھی بڑھکر محال ہے مگر جبکہ انسان کو ایک بات کے کرنے کو اور ایک بات کے نہ کرنے کو کہا جاوے، تو بالطبع انسان اُس کی منفعت اور مضرت کے جاننے کا خواہاں ہوتا ہے، اور بغیر جانے اُسکے کرنے یا نہ کرنے پر راغب یا متنفر نہیں ہوتا، اس واسطے ہر ایک پیغمبر کو بلکہ ہر ایک ریفارمر یعنی مصلح کو اُس منفعت و مضرت کا کسی تمثیل و تشبیہ سے بتانا پڑتا ہے۔

"قرۃ اعین" کی ماہیت یا حقیقت یا کیفیت یا اصلیت کا بتانا تو محالات سے ہے اس لئے انبیاء نے اُن راحتوں اور لذتوں یا رنج اور تکلیفوں کو جو انسان کے خیال میں ایسی ہیں جو اُن سے

كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوا هٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا

زیادہ نہیں ہو سکتیں، بطور جزا و سزا اُن افعال کے بیان کیا ہے، اور غرض اُن سے بعینہ وہی اشیاء نہیں ہیں بلکہ جو رنج و راحت، لذت و کلفت، اُن سے حاصل ہوتی ہے اُس کیفیت کو، "قرۃ اعین" سے تشبیہاً بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، گو وہ تشبیہ کیسی ہی ادنیٰ اور ناچیز ہو۔

موسیٰ نے اُس "قرۃ اعین" کو اولاد پیدا ہونے مینہ برسنے رزق کے فراغ ہونے دشمنوں پر غلبہ پانے۔ اور اُس کلفت کو اولاد کے مرنے قحط پڑنے وبا پھیلنے شکست کھانے کی کیفیت کی تشبیہ میں بیان کیا۔ یہہ تشبیہیں اگرچہ بنی اسرائیل کے دل پر بہت موثر تھیں، مگر در حقیقت ایسی نہ تھیں کہ جو تمام انسانوں کی طبیعت پر حاوی ہوں، محمد مصطفےٰ ﷺ نے اُسکو ایسی تشبیہوں میں بیان کیا ہے، کہ تمام انسانوں کی طبیعتوں پر حاوی ہیں، اور کل انسانوں کی خلقت اور جبلت کے نہایت ہی مناسب ہیں۔

تمام انسانوں کی خواہ وہ سرد ملک کے رہنے والے ہوں خواہ گرم ملک کے، مکان کی آراستگی، مکان کی خوبی، باغ کی خوشنمائی، بہتے پانی کی دلربائی، میووں کی تروتازگی، سب کے دل پر ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے، اسکے سوا حسن یعنی خوبصورتی سب سے زیادہ دل پر اثر کرنے والی ہے، خصوصاً جبکہ وہ انسان میں ہو، اور اُس سے بھی زیادہ جبکہ عورت میں ہو، پس بہشت کی "قرۃ اعین" کو ان فطرتی راحتوں کی کیفیات کی تشبیہ میں، اور دوزخ کی مصائب کو آگ میں جلنے اور لہو پیپ پلائے جانے، اور تھوہر کھلائے جانے کی تمثیل میں بیان کیا ہے، تاکہ انسان کے دل میں یہہ خیال پیدا ہو کہ بڑی سے بڑی راحت و لذت، یا سخت سے سخت عذاب وہاں موجود ہے، اور در حقیقت جو لذت و راحت یا رنج و کلفت وہاں ہے، اُن کو اس سے کچھ بھی مناسبت نہیں ہے، یہہ تو صرف ایک اعلیٰ راحت و احتظاظ، یا رنج و کلفت کا خیال، پیدا کرنے کو اُس پیرایہ میں جس میں انسان اعلیٰ سے اعلیٰ احتظاظ و رنج کو خیال کر سکتا تھا بیان کیا ہے۔

یہہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کے پیدا کی ہوئی ہے، اُس میں سنگ مرمر کے اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں باغ میں شاداب و سرسبز درخت ہیں، دودہ و شراب و شہد کی ندیاں بہہ رہی ہیں

جب دفعہ ہم انکو وہاں چکھنے کو پھل ملے تو کہیں یہہ وہی ہے جو پہلے ہمکو ملا تھا کیونکہ ایک ہی سے (پھل) لائی جاوینگی،

ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے، ساقی و ساقنین نہایت خوبصورت، چاندی کے کنگن پہنے ہوئے جو ہمارے ہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں، شراب پلا رہی ہیں، ایک جنتی ایک حور کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے ایک نے ران پر سر دہرا ہے ایک چھاتی سے لپٹا رہا ہے، ایک نے لب جان بخش کا بوسہ لیا ہے کوئی کسی کونہ میں کچھ کر رہا ہے کوئی کسی کو نہیں کچھ، ایسا بیہودہ پن ہے جس پر تعجب ہوتا ہے اگر بہشت یہی ہو تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اُس سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔

علماے اسلام رحمتہ اللہ علیہم اجمعین نے بسبب اپنی رقت قلبی اور توجہ الی اللہ اور خوف و رجا کی غلبہ کے، جو آدمی کے دل پر زیادہ اثر کرنے سے ایسے درجہ پر پہونچا دیتا ہے کہ اصل حقیقت کے بیان کرنے کی جرأت نہیں رہتی، یہہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جو ام الفاظ سے مستفاد ہوتا ہے اُسی کو تسلیم کریں، اور اُسکی حقیقت اور اُسکے مقصد کو خدا کے علم پر چھوڑ دیں، اسواسطے وہ بزرگ تمام اُن باتوں کو تسلیم کرتے ہیں جنکو کوئی بھی نہیں مان سکتا، اور وہ باتیں جیسے کہ عقل اور اصلی مقصد بانی مذہب کے برخلاف ہیں، ویسے ہی مذہب کی سچائی اور بزرگی اور تقدس کے مخالف ہیں۔

اس امر کے ثبوت کے لیئے کہ بانی مذہب کا ان چیزوں کے بیان کرنے سے صرف اعلیٰ درجہ کی راحت کا بقدر فہم انسانی خیال پیدا کرنا مقصود تھا، نہ واقعی ان چیزونکا دوزخ و بہشت میں موجود ہونا، ایک حدیث کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو ترمذی نے بریدہ ؓ سے روایت کی ہے اُس میں بیان ہے کہ، ایک شخص نے آنحضرت سے پوچھا کہ بہشت میں گھوڑا بھی ہوگا آپنے فرمایا کہ تو سُرخ یاقوت کے گھوڑے پر سوار ہو کر جہاں چاہیگا اُڑتا پھریگا، پہر ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت وہاں اونٹ بھی ہوگا، آپنے فرمایا کہ وہاں جو کچھ چاہو گے سب کچھ ہوگا پس اس جواب سے مقصود یہہ نہیں ہے کہ در حقیقت

* عن بریدۃ ان رجلا قال یا رسول اللہ ھل فی الجنۃ من خیل قال ان اللہ ادخلک الجنۃ فلا تشاء ان تحمل فیہا علی فرس من یاقوتۃ حمراء یطیر بک فی الجنۃ حیث شئت الا فعلت وسالہ رجل فقال یا رسول اللہ ھل فی الجنۃ من ابل قال فلم یقل لہ ما قال لصاحبہ فقال ان یدخلک اللہ الجنۃ یکن لک فیہا ما اشتہت نفسک ولذت عینک رواہ الترمذی۔ (مشکوٰۃ)

وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ (۲۳)

بہشت میں گھوڑے اور اونٹ موجود ہونگے، بلکہ صرف اُن لوگوں کے خیال میں، اُس اعلیٰ درجہ کی راحت کے خیال کا پیدا کرنا ہے، جو اُن کے خیال اور اُنکی عقل و فہم و طبیعت کے مطابق اعلیٰ درجہ کی ہوسکتی تھی اسی کی مانند اور بہت سی حدیثیں ہیں، اور اگر اُن سب کو صحیح بھی مان لیا جاوے تب بھی کسی کا مقصود اُن اشیاء کا بعینہ بہشت میں موجود ہونا نہیں ہے، بجز اسکے کہ جہاں تک انسان کی عقل و طبیعت کے موافق اعلیٰ درجہ کی راحت کا خیال پیدا ہوسکے وہ پیدا ہو۔

حکماء الٰہی اور انبیاء ربانی دونوں ایک سا کام کرتے ہیں فرق یہ ہے کہ حکماء صرف اُن چند لوگوں کو تربیت کرسکتے ہیں جنکا دل و دماغ تربیت پاچکا ہو، بخلاف اسکے انبیاء تمام کافہ انام کو تربیت کرتے ہیں، جن کا بہت بڑا حصہ قریب کل کے محض ناتربیت یافتہ جاہل وحشی جنگلی بدوی بے عقل و بد دماغ ہوتا ہے، اور اسی لئے انبیاء کو بہ مشکل پیش آتی ہے، کہ اُن حقایق و معارف کو، جن کو تربیت یافتہ عقل بھی مناسب غور و فکر و تامل سے سمجھ سکتی ہے، ایسے الفاظ میں بیان کریں کہ تربیت یافتہ دماغ اور کوڑ مغز دونوں برابر فائدہ اُٹھاویں۔ قرآن مجید میں جو بے مثل حیرت انگیز معجزہ وہ یہی ہے کہ اُسکا طرز بیان ہر ایک کے مذاق اور دماغ کے موافق ہے، اور باوجود اسقدر اختلاف کے دونوں نتیجہ پانے میں برابر ہیں۔ انہی آیات کی نسبت دو مختلف دماغوں کے خیالات پر غور کرو، ایک تربیت یافتہ دماغ خیال کرتا ہے کہ وعدہ و وعید دوزخ و بہشت کے جن الفاظ سے بیان ہوئے ہیں اُن سے بعینہ وہی اشیاء مقصود نہیں بلکہ اُسکا بیان کرنا صرف اعلیٰ درجہ کی خوشی و راحت کو فہم انسانی کے لایق تشبیہ میں لانا ہے، اس خیال سے اُس کے دل میں ایک بے انتہا عمدگی نعیم جنت کی، اور ایک ترغیب اوامر کے بجالانے، اور نواہی سے بچنے کی پیدا ہوتی ہے، اور ایک کوڑ مغز مُلّا یا شہوت پرست زاہد یہ سمجھتا ہے، کہ درحقیقت بہشت میں نہایت خوبصورت ان گنت حوریں ملیں گی شرابیں پئیں گے میوے کھاویں گے، دودھ و شہد کی ندیوں میں نہاویں گے اور جو دل چاہیگا وہ مزے اُڑاویں گے اور اس لغو و بیہودہ خیال سے دن رات اوامر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے میں کوشش کرتا ہے اور جس نتیجہ پر پہلا پہونچا تھا اُسی پر یہ بھی پہونچ جاتا ہے، اور کافہ انام کی تربیت کا کام بخوبی تکمیل پاتا ہے، پس جس شخص نے ان حقایق

اور وہاں اُنکے لئے پاکیزہ عورتیں ہیں، اور وہ ہمیشہ وہاں رہیں گے (۲۳)

قرآن مجید پر جو فطرت انسانی کے مطابق ہیں غور نہیں کی، اُس نے درحقیقت قرآن کو مطلق نہیں سمجھا، اور اس نعمت عظمیٰ سے بالکل محروم رہا۔

(متشابہا) جو مطلب قرآن مجید کا ہمنے بیان کیا ہے اُس کے مطابق ہمکو نہ کچھ "ثمرۃ" کے لفظ پر بحث کرنی ضرور ہے اور نہ "متشابہا" کے لفظ پر، کیونکہ اس لفظ سے پھل کی عمدگی پر اُسی مقصود سے زیادہ تعجب دلاتا ہے۔ مگر تعجب یہہ ہے کہ بعض ہمارے علمائے اسلام نے بھی "متشابہا" کی تفسیر میں ثمر سے درختوں کے میوے مراد نہیں لئے۔ بیضاوی* میں لکھا ہے کہ "اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ جو لذت دنیا میں خدا کی معرفت اور اُسکی طاعت میں چکھی تھی تو جنت میں وہ لذت بڑھ کر ہوگی اسلئے ان الفاظ سے کہ "یہہ وہی ہے جو ہمکو پہلے ملا تھا" ثواب مراد ہو سکتا ہے اور ایک ہی سی ہونے سے "بزرگی اور علو مدارج میں ایک سا ہونا" یہہ ایسی ہی بات ہے جیسے کہ کافروں کے حق میں کہا گیا ہے کہ چکھو جو تم جانتے تھے"۔

تفسیر کشف الاسرار‡ میں بھی لکھا ہے کہ جنت و نار کی جو چیزیں بیان ہوئی ہیں وہ سب تمثیلیں ہیں نہ حقیقتیں، تاکہ جو چیز ہمارے پاس ہے اُس سے اُس چیز کا جو ہم سے پوشیدہ ہے کچھ خیال ہو۔

* وان الاٰیۃ محملا اخر وھو ان مستلذات اھل الجنۃ فی مقابلۃ ما رزقوا فی الدنیا من المعارف والطاعات متفاوتۃ فی اللذۃ بحسب تفاوتھا فیحتمل ان یکون المراد من ھذا الذی رزقنا انہ ثوابہ ومن تشابھھما تماثلھما فی الشرف والمزیۃ وعلو الطبقۃ فیکون ھذا فی الوعد نظیر قولہ ذوقوا ما کنتم تعلمون فی الوعید (بیضاوی)

‡ واعلم ان اللہ تعالیٰ خاطبنا بالامثال لیدلنا علی الحاضر عندہ بالغایب عندنا فی الاسماء متفقۃ للدلالۃ والمعانی مختلفۃ ولولا ذلک لما بقی فی النار شی من شجرۃ الزقوم والسلاسل وغیر ذلک بل کانت تاکلہ النار وما فی الجنۃ من فرشھا وانھارھا کذلک فھو مثل فقط (تفسیر کشف الاسرار)

إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَسْتَحْيِۦٓ أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا فَأَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ وَأَمَّا ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ فَيَقُولُونَ مَاذَآ أَرَادَ ٱللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا يُضِلُّ بِهِۦ كَثِيرًا وَيَهْدِى بِهِۦ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِۦٓ إِلَّا ٱلْفَٰسِقِينَ ﴿۲۴﴾ ٱلَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ ٱللَّهِ مِنۢ بَعْدِ مِيثَٰقِهِۦ وَيَقْطَعُونَ مَآ أَمَرَ ٱللَّهُ بِهِۦٓ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِى ٱلْأَرْضِ أُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْخَٰسِرُونَ ﴿۲۵﴾ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِٱللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَٰتًا فَأَحْيَٰكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ

---

(۲۴) (ان اللہ لا یستحی) تمام مفسرین اس آیت کی نسبت لکھتے ہیں کہ خدا تعالی نے قرآن میں مکھی و مکڑی و چیونٹی کا ذکر کیا ہے، اس پر کافر ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ ایسی حقیر چیزوں کا ذکر کرنا خدا کی شان کے لایق نہیں ہے، اس پر یہہ آیت نازل ہوئی کہ مچھر یا اُس سے زیادہ حقیر چیز کی مثل کہنے میں خدا شرماتا نہیں مگر اس صورت میں اس آیت کو پہلی و پچھلی آیتوں سے کچھ تعلق نہیں رہتا، بلکہ اس آیت سے اس بات پر اشارہ پایا جاتا ہے کہ اوپر کی آیتوں میں جو بیان جنت و نار کا ہوا ہے وہ صرف بطور ایک حقیر مثل کے ہے، مگر اللہ حقیر سے حقیر مثل کہنے میں بھی نہیں شرماتا، جو سعید ہیں وہ اُسکا مقصد سمجھتے ہیں اور ہدایت پاتے ہیں، اور جو شقی ہیں وہ اُسکے مقصد پر غور نہیں کرتے بلکہ حقارت سے دیکھتے ہیں اور گمراہ ہوتے ہیں۔

(عہد اللہ) عہد آپس میں دو شخصوں کے ایک قول ہے، جسکا منشا یہہ ہے کہ اُس کی رعایت رکھی جاوے اور پورا کیا جاوے، اور ایجاب و قبول سے وہ موثق ہو جاتا ہے کبھی یہہ عہد بذریعہ قول کے ہوتا ہے اور کبھی بغیر قول کے مثلاً یہہ عہد کرنا کہ میں دس من گیہوں دونگا ایک قولی عہد ہے، مگر من کی مقدار بھی جو مروج ہو

اللہ کچھ شرماتا نہیں ایک مچھر کی یا اُس سے بھی بڑھکر مثل کہنے میں، پھر جو ایمان لائے ہیں جانتے

ہیں کہ سچ مچ وہ خدا کی کہی ہوئی ہے، اور جو کفر میں پڑے ہیں سے کہتے ہیں کہ ایسی

مثل کہنے سے خدا نے کیا ارادہ کیا ہے، بہتوں کو اُس سے گمراہ کرتا ہے، اور بہتوں کو

اُس سے ہدایت کرتا ہے، اور بجز بدکاروں کے (کسی) کو اُس سے گمراہ نہیں کرتا ﴿۲۴﴾ جو

اللہ کے عہد کو پکا کر کے توڑتے ہیں، اور جس چیز کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے اُسکو کاٹتے

ہیں، اور دنیا میں فساد ڈالتے ہیں، وہی لوگ ٹوٹے میں پڑے ہیں ﴿۲۵﴾ کیونکر تم نہیں مانتے اللہ کو

حالانکہ تم مردہ (یعنی کچھ نہ تھے) پھر تمکو زندہ (یعنی موجود اور مشہور و معروف) کیا پھر تم کو مارے گا،

* ایک عہد ہے بغیر قول کے، جو اُس قولی عہد کے ضمن میں داخل ہے، پس عہد بالقول اور بالحال دونوں طرح پر ہوتا ہے، خدا کا عہد جو مخلوق سے ہے، یا مخلوق کا عہد جو خدا سے ہے، وہ قولی نہیں ہو سکتا کیونکہ اُس کی ذات لفظوں کے بولنے اور آواز کے نکلنے سے جو انسان سے متعلق ہے بری ہے پس خدا کا قول وہ انسانی فطرت ہے جس پر خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے، اُسکی قدرت کی نشانیاں جو دنیا میں اور خود انسان میں ہیں، اور جو عقل و تمیز انسان میں بالواسطہ یا بلا واسطہ اُنکے سمجھنے کی موجود ہے، اُسکے خدا ہونے پر موثق عہد ہے، جسکا دونوں جانب سے ایجاب و قبول ہوا ہے، خود انسان کی فطرت اور جو قوائے محرک اور قوۃ مانع یا معتدل کرنے والی اُن

+ قال القفال وهو كقوله تعالى هل اتى على الانسان حين من الدهر لم يكن شيئا مذكورا، فبين سبحانه وتعالى ان الانسان كان لاشي يذكر فيجعله سميعا بصيرا او مجازه من قولهم فلان ميت الذكر وهذا امر ميت وهذه اسلعة ميتة اذا لم يكن لها طالب ولا ذاكر قال المخبل السعدي -

واحييت لي ذكرى وما كنت خاملا + ولكن بعض الذكر انبه من بعض

فكذا المعنى الاية وكنتم امواتا اي خاملين ولا ذكر لكم لانكم لم تكونوا شيئا فاحياكم اي جعلكم خلقا سميعا بصيرا (تفسير كبير)

كنتم امواتا خاملي الذكر فاحياكم بالظهور ** + والعرب يسمي كل خامل ميتا وكل امر مشهور حيا +

(تفسير مجمع البيان)

ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۲۶﴾ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۲۷﴾

قوی کی اُس میں رکھی ہے وہ ٹھیک اُسکے دین یا شریعت کے بجالانے کا جو عین فطرت ہی کا عہد ہے، پس جو لوگ اُس عہد کو توڑتے ہیں وہی بدکار ہیں اور وہی اُن شئون سے گمراہ ہوتے ہیں۔

(۲۶) اس آیت میں تین لفظ غور کرنے کے قابل تھے۔ کنتم امواتا۔ فاحیاکم ثم یحییکم۔ اس آیت کا ترجمہ اس طرح پر کیا ہے کہ پہلے دو لفظوں کا حل اُس سے ہو جاتا ہے پچھلے لفظ پر ہم وہاں بحث کرینگے جہاں بعث و نشر کی حقیقت بیان کرینگے، یہہ مسئلہ اِس قابل ہے کہ ایک مناسب مقام پر پوری تقریر اِس پر لکھی جاوے۔

(۲۷) (سبع سمٰوٰت) سات کے لفظ سے یہہ لازم نہیں آتا کہ سات سے زیادہ آسمان نہوں، بلکہ اُس زمانہ کے لوگ جو بلحاظ سبع سیارات یہہ سمجھتے تھے کہ آسمان سات ہیں اُنھی لوگوں کے خیال کے مطابق سات کا لفظ اطلاق ہوا ہے، یہہ کچھ میری ہی راے نہیں ہے بلکہ اگلے مفسروں کی + بھی یہی راے ہے۔ ،،سموات،، جمع ہے سما کی جس کے معنی اونچے کے ہیں، یہہ لفظ عرب کی زبان میں اور یہودیوں کی زبان میں اُس زمانہ سے بولا جاتا ہے جبکہ یونانی علم ہئیة کا وجود بھی نہ تھا، قرآن مجید میں بھی اس لفظ کا اطلاق اُسی محاورہ میں ہوا ہے جو اُس زمانہ میں تھا، مگر قرآن مجید کے نازل ہونے کے زمانہ میں اور اُس کے بعد بالتخصیص مسلمانوں میں یونانی علم ہیئت کا بڑا رواج ہو گیا تھا۔ یونانیوں نے آسمان کو ایک جسم شفاف صلب کروی الشکل مقعر و محدب کا محیط زمین کے جس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں تسلیم کیا تھا، یونانی مسئلے مسلمانوں میں بہت رائج ہو گئے تھے اور سب (الا شاذ و نادر) بطور سچے مسئلوں کے تسلیم کئے جاتے تھے، یہاں تک کہ قرآن کے بیانات کو بھی اُن کے مطابق

+ فان قال قائل فهل يدل التنصيص على سبع سموات على نفي العدد الزايد قلنا الحق ان تخصيص العدد بالذكر لا يدل على نفي الزايد (تفسیر کبیر)

پھر جلاویگا، پھر اُسکے پاس جاؤ گے (۲۶) اللہ وہ ہے جسنے پیدا کیا تمھارے لئے سب کچھ جو زمین میں ہے پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو اُس کو ٹھیک سات آسمان کر دیئے اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے (۲۷)

کیا جاتا تھا، البتہ علماء سے علم کلام نے یونانیوں کے چند مسائل میں ترمیم اور بعض میں اختلاف کیا تھا، جن کو وہ صریح مذہب کے برخلاف سمجھتے تھے، اور اُس کے سوا باقی مسائل کو بطور ہیچ کے تسلیم کرتے تھے۔ آسمانوں کا مسئلہ بھی ایسا ہی تھا، جس میں علماے اسلام نے کچھ تھوڑی ترمیم کی تھی اور اُس کے جسم کروی محیط انفر ہونے اور ستاروں کے اُس میں جڑے ہوئے ہونے اور آسمانوں کے زمین کے گرد چکر کھانے کو ویسا ہی تسلیم کیا تھا جیساکہ یونانیوں نے بیان کیا تھا۔ اِس لئے تفسیروں میں اور مذہبی کتابوں میں آسمان کے وہی معنی یا اُس کے قریب قریب مروج ہوگئے جو یونانی حکیموں نے بیان کئے تھے، اور بہت بڑی غلطی یہہ پڑگئی کہ لفظ تو لیا قرآن کا اور اُس کے معنی لئے یونانی حکیموں کے، اور رفتہ رفتہ وہ معنی ذہن میں ایسے راسخ ہوگئے کہ انکا انکار کرنا گویا قرآن کا انکار کرنا ٹھیر گیا، مگر ایسا سمجھنا بنا فاسد علی الفاسد ہے۔

اِس لئے میں اُن معنوں سے جو اکثر مفسرین سمجھتے ہیں انکار کرتا ہوں اور میں کہتا ہوں کہ جن جن چیزوں پر قرآن مجید میں سما، یا سموٰت کا اطلاق آیا ہے، وہی معنی سما، وسموٰت کے ہم قرار دینگے، نہ وہ معنی جو علماے اسلام نے یونانی حکیموں کی حکمت کی پیروی سے قرار دئے ہیں۔

قرآن مجید میں جسکا بیان اُسکے ہر ایک موقع پر آویگا، اُس وسعت پر بھی سما کا اطلاق ہوا ہے جو ہر شخص اپنے سر کے اوپر دیکھتا ہے، اور اُس نیلی نیلی چیز پر بھی ہوا ہے جو گنبدی چھت کی مانند ہر شخص کو اُس کے سر کے اوپر دکھائی دیتی ہے۔ اور اُن چمکتے چمکتے جسموں پر بھی ہوا ہے جن کو ہم ستارے یا کواکب کہتے ہیں بادلوں پر بھی ہوا ہے جو مینھہ برساتے ہیں، مگر قرآن نے آسمان کے وہ معنی جو یونانی حکیموں نے بیان کئے ہیں کہیں نہیں بتلائے، اس لئے ہم اُن سے انکار کرتے ہیں، اور جو قرآن نے بتائے ہیں اُنھی معنوں میں سے کوئی معنی سما کے لفظ کے سمجھتے ہیں۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ

اس مقام پر "سما" کے لفظ سے وہ وسعت مراد ہے جو ہر شخص اپنے سر کے اوپر دیکھتا ہے، پس آیت کے معنی یہہ ہیں کہ خدا اُس وسعت کی طرف متوجہ ہوا جو انسان کے سر پر بلند دکھائی دیتی ہے، اور ٹھیک اُسکو سات بلندیاں کر دیں، سات سیارہ کواکب کو ہر کوئی جانتا تھا، عرب کے بدو بھی اُن سے بخوبی واقف تھے۔ وہ ستارے اوپر تلے دکھائی دیتے ہیں یعنی ایک سب سے نیچا، دوسرا اُس سے اونچا، اور تیسرا اُس سے اونچا، اور علیٰ ہذا القیاس، اور اُن کواکب کے سبب جو بطور روشن نشان کے اُس وسعت مرتفع میں دکھائی دیتے ہیں، اُس وسعت کے ساتھ جدا جدا حصے یا درجے یا طبقے ہو جاتے ہیں، پس اسی کی نسبت خدا تعالی نے فرمایا کہ اُسکو ٹھیک سات آسمان کر دئیے۔

یہہ معنی جو ہمنے بیان کئے اگرچہ لوگوں کو ایک نئی بات معلوم ہوتی ہو گی، مگر یہی معنی بعض معتبر مفسروں نے بھی سمجھے ہیں، تفسیر + بیضاوی میں لکھا ہے کہ "سما سے یہہ اجرام علوی (جن میں کواکب بھی داخل ہیں) مراد ہیں یا اوپر کی طرفین" پس انہی مجمل لفظوں کی یہہ تفصیل ہے جو ہمنے بیان کی ہے۔

(۲۸) (واذ قال ربک) اس آیت سے وہ ذکر شروع ہوا ہے جو آدم کا قصہ کہلاتا ہے، تمام مفسرین اسکو ایک واقعی جھگڑا یا مباحثہ سمجھتے ہیں جو خدا اور فرشتوں میں ہوا، تعالی شانہ عما یقولون۔ "ملک" کے معنی ایلچی یا پیغامچی کے ہیں، عبرانی، یونانی، اور فارسی میں جو لفظ ملک کے لئے ہیں اُن سب کے معنی بھی ایلچی کے ہیں۔ جو خدا کا پیغام نبیوں کو پہونچاتا ہے، توریت میں بعض جگہہ عام ایلچی کے لئے بھی بولا گیا ہے اور بعض جگہہ مذہبی پیشواؤں اور ابر اور ہوا اور وبا کے لئے، مگر فرشتوں کے وجود کی نسبت لوگوں کے عجیب عجیب خیالات ہیں۔ انسان کی یہہ ایک طبعی بات ہے کہ جب کسی ایسی مخلوق کا ذکر ہو جسکو وہ نہیں جانتا، تو خواہ نخواہ اُس کے دل میں اُس مخلوق کے ایک جسمانی جسم متحیز کا جسکے رہنے کی کوئی جگہہ بھی ہو خیال جاتا ہے، پھر اُنکے اوصاف پر خیال کرتے کرتے اُن کی ایک صورت جو اُن اوصاف کی مقتضی ہوتی ہے اُسکے خیال میں قرار پاتی ہے، اور پھر وہ اسباب کو

+ والمراد بالسماء هذه الاجرام العلوية او جهات العلو (بیضاوی)

اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا

تو بھول جاتا ہے کہ میں اُس مخلوق کو نہیں جانتا، نہ میں نے اُسکو کبھی دیکھا ہے اور یوں جاننے لگتا ہے کہ وہ مخلوق وہی ہے، جو میرے خیال میں ہے، اور جب وہ خیال لوگوں میں نسل در نسل چلا آتا ہے، تو ایسا مستحکم ہو جاتا ہے کہ گویا اُس میں شک و شبہ مطلق ہے ہی نہیں، یہی حال فرشتوں کی نسبت ہوا ہے، اُنکو نوری سمجھکر گورا گورا سفید برف کا رنگ نوری شمع کی مانند بناہیں، بلور کی سی پنڈلیاں، ہیرے کے سے بازون، ایک خوبصورت انسان کی شکل، مگر نہ مرد نہ عورت تصور کیا ہے، آسمان اُنکے رہنے کی جگہہ قرار دی ہے، آسمان سے زمین پر آنے اور زمین سے آسمان پر جانے کے لئے اُن کے پر لگائے ہیں، کسی کو شان دار، اور کسی کو غصہ ور و غضب ناک، کسی کو کم شان کا، کسی کو صور پھونکتا، کسی کو آتشین کوڑے سے مینہہ برساتا، خیال کیا ہے، بعض اقوام نے جو زیادہ غور و فکر کی ہے، تو اُنکے لئے نہ جسم مانا ہے، اور نہ اُنکا متحیز ہونا تسلیم کیا ہے، اور اِس لئے فرشتوں کی نسبت انسانوں کے دو فرقے ہو گئے ہیں، ایک وہ جو فرشتوں کے وجود اور اُن کے متحیز ہونیکے دونوں باتوں کے قایل ہیں، اور ایک وہ کہ اُنکے متحیز ہونیکے قائل نہیں، بعض بت پرست سمجھتے تھے کہ فرشتے سعد اور نحس کواکب کی روحیں ہیں، مجوسی اور بعض بت پرستوں کا یہہ خیال تھا کہ عالم کی ترکیب نور و ظلمت سے ہے، اور نور و ظلمت دونوں موجود حقیقتیں ہیں، مگر آپس میں مختلف، اور ایک دوسرے کی ضد، نور کے بھی بال بچے پیدا ہوتے ہیں اور ظلمت کی بھی بال بچے پیدا ہوتے ہیں مگر نہ اسطرح جیسے کہ حیوان اور انسان جنتے جناتے ہیں بلکہ اسطرح جیسے کہ حکیم سے حکمت اور روشن چیز سے روشنی، اور احمق سے حماقت، نور کی اولاد تو فرشتے ہیں اور ظلمت کی اولاد شیطان ہیں، حکماء عقول ہی پر جنکو اُنھوں نے تسلیم کیا ہے فرشتہ کا اطلاق کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ فرشتے حقیقت موجودہ غیر متحیزہ ہیں، اور اُن کی حقیقت نفوس انسانی کی حقیقت سے زیادہ قوی ہے، اور انسان کی بہ نسبت اُن کو علم بھی زیادہ ہے، اُن میں سے کچھ تو آسمانوں سے اس قسم کا علاقہ رکھتے ہیں جیسے کہ ہمارے بدن سے ہماری روح، اور کچھ بجز استغراق کے ذات باری میں کسی چیز سے علاقہ نہیں رکھتی، اور وہی ملائکہ مقربین ہیں۔ اور بعض فلاسفہ کہتے ہیں کہ اُنکے سوا دو قسمیں اور ہیں، اور وہ زمین کے

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ

فرشتے ہیں اور دنیا کے امورات کو درست کرتے ہیں، جو نیک کام کرنے والے ہیں وہ تو فرشتے ہیں اور جو بدکام کرنے والے ہیں وہ شیطان ہیں۔

یہودی فرشتوں کو آدمی کی صورت پر مجسم مانتے تھے، اور انکو اجسام حقیقی سمجھتے تھے، البتہ اُنکے جسم کے مادہ کو مثل انسان کے جسم کے مادہ کے نہیں مانتے تھے، بلکہ یہہ کہتے تھے کہ انکا جسم مادہ غلیظ سے مرکب نہیں ہے، وہ اپنے تئیں انسانوں کو دکھلا بھی دیتے ہیں اُن سے بات چیت بھی کرتے ہیں اُن کے ساتھ کھانا بھی کھاتے ہیں اور غایب بھی ہو جاتے ہیں، پھر کوئی اُنکو نہیں دیکھ سکتا۔ اُنکے کھانا کھانے کے باب میں کہتے ہیں، کہ ظاہر میں کھاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، مگر انسانوں کی خوراک نہیں کہاتے، بلکہ اُنکا کھانا اور ہی کچھ ہے، یہودیوں میں جو ایک صدوقی فرقہ تھا وہ فرشتوں کا قائل نہ تھا، عیسائیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ فرشتے جسم رکھتے ہیں، اور مقدس ہیں، انجیل میں حضرت عیسیٰ کو فرشتوں سے برتر کہا گیا ہے، اور بہشتیوں کی نسبت لکھا ہے کہ وہ فرشتوں کی مانند ہونگے۔

عرب کے بت پرست فرشتوں کو ایک مجسم اور متحیز چیز سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ وہ کھاتے پیتے نہیں، اور نہ کچھ بشری ضرورت اُن کو ہے، وہ آسمانوں پر رہتے ہیں اور زمین پر آتے جاتے ہیں، وہ یہہ سمجھتے تھے کہ انسان بھی فرشتوں کو زمین پر رہتے چلتے پھرتے دیکھ سکتا ہے، اسی خیال سے وہ آنحضرت صلعم کی نسبت کہا کرتے تھے، کہ اگر وہ پیغمبر ہیں تو اُنکے ساتھ فرشتے کیوں نہیں ہیں، عام مسلمانوں کا بھی یہی عقیدہ ہے جو عرب کے بت پرستوں کا تھا، وہ فرشتوں کو ہوا کی مانند لطیف اجسام سمجھتے ہیں اور مختلف شکلوں میں بن جانے کی اُن میں قدرت جانتے ہیں، اور خیال کرتے ہیں کہ وہ آسمانوں پر رہتے ہیں اور پردار ہیں کہ اُڑکر زمین پر اُترتے ہیں، اور زمین پر سے اُڑکر آسمان پر چلے جاتے ہیں اور چیلوں کیطرح آسمان اور زمین کے بیچ میں منڈلاتے ہیں، غرضکہ تمام اقوام میں فرشتوں کی نسبت انسانی نقایص سے پاک ہونے کا اور ایک اعلیٰ تقدس کا خیال تھا، اسی خیال کی وجہہ سے نیک اور اچھے آدمی کو بھی مجازاً فرشتہ کہتے تھے جیسے کہ حضرت یوسف کو زلیخا کی سہیلیوں نے کہا، "ماھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم"۔

کہیں زمین میں

میں کہتا ہوں کہ جس طرح انسان سے فروتر مخلوق کا ایک سلسلہ ہم دیکھتے ہیں اُسی طرح انسان سے برتر مخلوق ہونے سے انکار کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے، شاید کہ ہو گو وہ کیسی ہی عجیب اور ناقابل یقین ہو مگر ایسی خلقت کے درحقیقت موجود ہونے کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے، کیونکہ اس بات کا ثبوت کہ ایسی خلقت ہی نہیں ہے، قرآن مجید سے فرشتوں کا ایسا وجود جیسا کہ مسلمانوں نے اعتقاد کر رکھا ہے ثابت نہیں ہوتا بلکہ برخلاف اُسکے پایا جاتا ہے، خدا فرماتا ہے" وقالوا لولا انزل علیہ ملک ولو انزلنا ملکا لقضی الامر ثم لاینظرون۔ ولو جعلناہ ملکا لجعلناہ رجلا وللبسنا علیھم ما یلبسون"، یعنی کافروں نے کہا کہ کیوں نہیں بھیجا پیغمبر کے ساتھ فرشتہ، اور اگر ہم فرشتہ بھیجتے تو بات پوری ہو جاتی اور ڈھیل میں نہ ڈالے جاتے، اور اگر ہم فرشتہ ہی پیغمبر کرتے تو اُس کو آدمی ہی بناتے اور بلاشبہ اُنکو ایسی ہی شبہہ میں ڈالتے جیسے کہ اب شبہہ میں پڑے ہیں۔ اِس آیت سے پایا جاتا ہے کہ فرشتے نہ کوئی جسم رکھتے ہیں اور نہ دکھائی دے سکتے ہیں، اُنکا ظہور بلا شمول مخلوق موجود کے نہیں ہو سکتا، "لجعلناہ رجلا" قید احترازی نہیں ہے، اس جگہ انسان بحث میں تھا اس لئے "لجعلناہ رجلا" فرمایا ورنہ اُس سے مراد عام موجودہ مخلوق ہے۔

ان باریک باتوں پر غور کرنے سے اور اس بات کے سمجھنے سے کہ خدا تعالیٰ جو اپنے جاہ و جلال اور اپنی قدرت اور اپنے افعال کو فرشتوں سے نسبت کرتا ہے تو جن فرشتوں کا قرآن میں ذکر ہے انکا کوئی اصلی وجود نہیں ہو سکتا بلکہ خدا کی بے انتہا قدرتوں کے ظہور کو اور اُن قویٰ کو جو خدا نے اپنی تمام مخلوق میں مختلف قسم کے پیدا کئے ہیں ملک یا ملائکہ کہا ہے، جن میں سے ایک شیطان یا ابلیس بھی ہے۔ پہاڑوں کی صلابت، پانی کی رقت، درختوں کی قوت نمو، برق کی قوت جذب و دفع، غرضکہ تمام قویٰ جنسے مخلوقات موجود ہوئی ہیں اور جو مخلوقات میں ہیں، وہی ملائک و ملائکہ ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، انسان ایک مجموعہ قوای ملکوتی اور قوای بہیمی کا ہے، اور ان دونوں قوتوں کی انتہا دریا ہیں جو ہر ایک قسم کی نیکی و بدی میں ظاہر ہوتی ہیں، اور وہی انسان کے فرشتے اور اُنکی ذریات اور وہی انسان کے شیطان اور اُسکی ذریات ہیں

بعض اکابر اہل اسلام کا بھی یہی مذہب ہے جو میں کہتا ہوں، اور امام محی الدین ابن عربی نے فصوص الحکم میں یہی مسلک

خلیفہ

اختیار کیا ہے۔ شیخ عارف باللہ موید الدین ابن محمود المعروف بالجندی نے جو مریدان خاص شیخ صدر الدین قونوی مرید امام محی الدین ابن عربی سے ہیں، شرح فصوص الحکم میں فرشتوں کی نسبت بہت بڑی بحث لکھی ہے۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ اپنی اصطلاح میں تمام عالم کو مجموع من حیث المجموع انسان کبیر کہتے ہیں، اور انسان کو انسان صغیر مقصود اُن کا اس اصطلاح سے یہہ ہے کہ انسان عالم کی ایک فرد ہے، اور جسقدر قوی انسان

قال الشیخ رضی اللہ عنہ فی فصوص الحکم "وکانت الملئکۃ من بعض قوی تلک الصورۃ التی ہی صورۃ العالم المعبر عنہ فی اصطلاح القوم بالانسان الکبیر" قال الشیخ موید الدین ابن محمود الجندی الذی اخذ الطریق من الشیخ صدر الدین القونوی وھو عن الشیخ محی الدین ابن العربی صاحب الفصوص "اعلم ان الملئکۃ ھی ارواح القوی القائمۃ بالصور الحسیۃ والارواح النفسیۃ والعقلیۃ القدسیۃ وتسمیتھا ملائکۃ لکونھا روابط وموصلات الاحکام الربانیۃ والاثار الالہیۃ الی العوالم الجسمانیۃ فان الملک فی اللغۃ ھو القوۃ والشدۃ فلما قویت ھذہ الارواح بالانوار الربانی وتایدت واشتدت بھا وقویت النسب الربانیت والاسماء الالہیۃ ایضا علی ایقاع احکامھا واثارھا وایصال انوارھا واظہارھا سمیت ملائکۃ وھم ینقسمون الی علوی روحانی وسفلی طبیعی وعنصری ومثالی ونورانی فمنھم المھیمون ومنھم المسخرون ومنھم المولدۃ من الاعمال والاقوال والانفاس والصافون والحافون والعالون الی اخر ما قال"

قال الشیخ رضی اللہ عنہ "فکانت الملائکۃ لہ کالقوی الروحانیۃ والحسیۃ التی فی نشاءۃ الانسان وکل قوۃ منھا محجوبۃ بنفسھا لاتری افضل من ذاتھا" قال الشارح "القوی الحسیۃ التی فی نشاءۃ الانسان ھی التی متعلقاتھا المحسوسات کالابصار والسماع والشم والذوق واللمس وما تحت ھذہ الکلمات من الانواع والشخصیات واما القوی الروحانیۃ فکالمتخیلۃ والمتفکرۃ والحافظۃ والذاکرۃ والعاقلۃ والناطقۃ وھذہ القوی الکلیات وتشخصیاتھا فی حیطۃ الروح النفسانی ومنشاءھا ومجاری تصرفاتھا واحکامھا واثارھا الدماغ وکالقوی الطبیعیۃ مثل الجاذبۃ والماسکۃ والھاضمۃ والغاذیۃ والمنمیۃ والمربیۃ والمصورۃ وشخصیاتھا راجعۃ الی الروح الطبعی وکالحلم والعلم والوقار والعناۃ والشجاعۃ والعدالت والسیاسۃ والنخوۃ والریاست وغیرھا مما تحتھا من التشخصیات والانواع بالمماثلۃ والمشاکلۃ والمبائلۃ والمنافرۃ عایدۃ الی روح الحیوانی والنفسانی وکما ان القوی منبثۃ فی اقطار نشاءۃ الانسان والکمال لکل جنس وصنف ونوع من ھذہ القوی محل اختصاصا بھا ھو محل ظہور احکامہ واثارہ ومنشاء حقائقہ واسرارہ ولکن حکم جمعیۃ الانسان سار فی الکل بالکل فلذلک العالم الذی ھو الانسان الکبیر فی زعمھم کلیات ھذہ القوی وامھاتھا بجزئیاتھا وانواعھا وشخصیاتھا منتشرۃ ومنبثۃ فی فضاء السموات والارضین وما بینھما وما فوقھما من العوالم وتعینات ھذہ القوی والارواح فی کل حال بما یناسبہ ویوافقہ علی الوجہ الذی یلائمہ ویطایفہ وبھا ملاک الامر النازل من حضرات الربوبیۃ۔

ایک خلیفہ کرنیوالا ہون

میں ہیں وہ جزئیات ہیں، اور جو اُسکے کلیات ہیں وہ انسان کبیر ہے، اور فرماتے ہیں کہ اُس عالم یعنی انسان کبیر کی جو قوی ہیں اُنھیں میں سے بعض کا نام ملایک ہے

شیخ رحمۃ اللہ علیہ ارقام فرماتے ہیں کہ وہ قوی جنکو ملایک کہتے ہیں انسان کبیر یعنی عالم کیلئے ایسے ہیں جیسے انسان کے لئے قوی ہیں، شارح کہتے ہیں کہ دیکھنا اور سننا اور سونگھنا اور چکھنا اور چھونا جو انسان میں ہے، وہ سب اُنھیں قوای ملکوتی حسیہ کے ماتحت ہیں اور قوۃ متخیلہ اور متفکرہ اور حافظہ اور ذاکرہ اور عاقلہ وناطقہ اُنھیں قواے ملکوتی روحانیہ کے تابع ہیں، اور جاذبہ اور ماسکہ اور ہاضمہ اور غاذیہ اور نمیہ اور مربیہ اور مصورہ اُنھیں قواے ملکوتی طبعیہ میں داخل ہیں، اور حلم اور علم اور وقار اور سمجھ اور شجاعت اور عدالت اور سیاست اور ریاست اُنھیں قواے ملکوتی حیوانیہ میں شامل ہیں، اور یہہ تمام قوی آسمان وزمین اور اُنکی فضاؤں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

پس شیخ اور اُنکے متبع بھی ملائکہ کا اطلاق صرف قواے عالم پر کرتے ہیں۔ ہمارے استنباط اور شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے استنباط میں صرف اتنا فرق ہے کہ شیخ کے نزدیک تمام قوی جو اجسام مرئیہ وغیر مرئیہ اور اشیاے محسوسہ وغیر محسوسہ میں ہیں وہ جزئیات ہیں اور جو اُنکے کلیات ہیں وہ ملائکہ ہیں، اور یہہ جزئیات اُن کی ذریات، شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکاشفہ سے اُن جزئیات کے کلیات کو جانا ہوگا، مگر چونکہ ہمکو وہ مکاشفہ حاصل نہیں ہے، اس لئے ہم انہیں قوتوں کو جنکو شیخ اور اُنکے متبع ذریات ملائکہ قرار دیتے ہیں ملائکہ کہتے ہیں، مطلب ایک ہے صرف لفظوں یا جاننے نہ جاننے کا پھیر ہے۔

شیطان کی[*] نسبت تو قیصری شرح فصوص میں نہایت صاف وہی بات لکھی ہے جو ہمنے لکھی ہے، اُس میں لکھا ہے کہ، بعضون نے یہہ بات لکھی ہے کہ انسان کبیر یعنی عالم میں

---

[*] فی قیصری شرح الفصوص فی ذیل بیان ابلیس، قیل ابلیس هو قوۃ الوهمیۃ الکلیۃ التی فی العالم الکبیر و القوی الوهمیۃ التی فی الاشخاص الانسانیۃ والحیوانیۃ افرادها لمعارضتها مع العقل الهادی طریق الحق وفیه نظر لان نفس المنطبعۃ هی الامارۃ بالسوء والوهم من سدنتها وتحت حکمها لانها من قواها فهی اولی بذلک کما قال تعالی ونعلم ما توسوس به نفسه وقال ان النفس لامارۃ بالسوء وقال علیه السلام اعدا عدوک نفسک التی بین جنبیک وقال علیه السلام الشیطان یجری من بنی ادم مجری الدم وهذا شان النفس

قَالُوا اَتَجعَلُ فِيهَا مَن يُّفسِدُ فِيهَا وَيَسفِكُ الدِّمَآءَ

جو قوت وہمیہ کلیہ ہے وہی ابلیس ہے، اور ہر ایک انسان میں جو قوت وہمیہ ہے وہی ابلیس کی ذریات ہیں، مگر شارح کہتا ہے کہ یہہ ٹھیک نہیں ہے، وہم نہیں، بلکہ نفس امارہ جو انسان میں ہے وہی ذریات ابلیس ہے، خدا نے بھی فرمایا ہے کہ "جو وسوسے دل میں آتے ہیں اُنکو ہم جانتے ہیں" اور فرمایا ہے کہ "نفس ہی بُرائی کرنے کو کہتا ہے"۔ آنحضرت صلعم نے بھی فرمایا ہے کہ "سب دشمنوں سے زیادہ دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے پہلوؤں میں ہے" اور آنحضرت صلعم نے یہہ بھی فرمایا کہ "شیطان انسان میں خون کی طرح چلتا ہے" اور ٹھیک یہہ حالت نفس کی ہے، انتہکی تمام محققین اس بات کے قایل ہیں کہ انھی قوائی کو جو انسان میں ہیں اور جن کو نفس امارہ یا قوائے بہیمیہ تعبیر کرتے ہیں یہی شیطان ہے۔

اگر فرض کریں کہ فرشتے اور شیطان ایک علٰحدہ وجود رکھتے ہیں جیسے کہ عموماً مسلمانوں کا عقیدہ ہے تو بھی یہہ بات بحث طلب ہے کہ کیا فی الواقع یہہ مباحثہ خدا و فرشتوں میں ہوا تھا؟ کیونکہ قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ فرشتے خدا سے مباحثہ نہیں کر سکتے، بلکہ اُسکے حکم کو بجا لاتے ہیں، خدا نے فرمایا ہے "وقالوا اتخذ الرحمن ولدا سبحانہ بل عباد مکرمون لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون +" یعنی کافروں نے کہا کہ خدا نے بیٹا بیٹی بنائے ہیں حالانکہ وہ اُس سے پاک ہے بلکہ جنکو وہ بیٹا بیٹی کہتے ہیں وہ (معزز بندے (یعنی عمدہ مخلوق) ہیں خدا کے آگے بڑھ کر بات نہیں کرتے اور جو وہ کہتا ہے وہی وہ کرتے ہیں، اس آیت سے فرشتوں کو مجال مباحثہ خدا سے نہیں معلوم ہوتی پھر کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ فی الواقع فرشتوں نے خدا سے مباحثہ یا جھگڑا ٹنٹا کیا تھا۔

اصل یہہ ہے کہ ان آیتوں میں خدا تعالیٰ انسان کی فطرت کو اور اُس کے جذبات کو بتلاتا ہے اور جو قوائے بہیمیہ اُس میں ہیں اُن کی بُرائی یا اُن کی دشمنی سے اُس کو آگاہ کرتا ہے، مگر یہہ ایک نہایت دقیق راز تھا جو عام لوگوں کی اور اُونٹ چرانے والوں کی فہم سے بہت دور تھا اسلیے خدا نے انسانی فطرت کی زبان حال سے آدم و شیطان کے قصے یا خدا اور فرشتوں کے مباحثے کی طور پر اُس فطرت کو بیان کیا ہے تاکہ ہر کوئی خواہ اُس کو فطرت

+ سورہ انبیا آیت ۲۶، ۲۷-

بولے کیا تو اُس میں ایسے کو خلیفہ کریگا جو اُس میں فساد کرے اور خون بہاوے

کا راز سمجھئے خواہ فرشتوں اور خدا کا مباحثہ یا خواہ شیطان و خدا کا جھگڑا، اصلی مقصد حاصل کرنے سے محروم نہ رہے۔ اس طرح پر عام و خاص سمجھدار و ناسمجھ عالم و جاہل کا یکساں قرآن مجید سے مقصد پانا درحقیقت بہت بڑا معجزہ قرآن کا ہے۔ توریت میں لکھا ہے کہ "خدا نے فرشتوں سے کہا کہ 'آؤ ہم آدمی کو اپنی صورت پر بناویں'" یہہ مضمون مسلمان مفسرون کے دل میں تھا، اور وہ اُسکو مثل یہودیوں کے ایسا ہی سمجھ رہے تھے جیسے کہ ایک آدمی سے ایک آدمی بات کرتا ہے" "اذ قال ربك للملائكة" کو بھی اُنہوں نے ویسا ہی سمجھا، اور آدم و شیطان کا قصہ بنا لیا ورنہ وہ صرف انسان کی فطرت کا زبان حال سے بیان ہے۔

اسطرح مخلوق کی زبان حال سے سوال و جواب میں مطالب کا بیان اور جگہہ بھی قرآن مجید میں آیا ہی، خدا نے زمین کی زبان حال سے حکایتاً فرمایا کہ، "جب ہمنے† آسمان و زمین سے کہا کہ تم دونوں خواہ نخواہ حاضر ہو دونوں نی کہا کہ ہم دونوں بخوشی حاضر ہیں۔ اور جہنم کی نسبت فرمایا‡ کہ جسدن ہم جہنم کو کہینگے کہ تو بھر گئی؟ تو وہ کہیگی کہ ہے اس سے زیادہ اور بھی"۔ پس ان آیتوں میں خدا تعالیٰ نے ایسی چیزوں کی زبان حال سے جو گویا نہیں ہیں، سوال و جواب کے طور پر اُنکی فطرت کو جسطرح کہ انسان کے خیال میں آسکتی ہے بیان کیا ہے۔

قصہ یا حکایت کئی طرح پر بیان کی جاتی ہے، اور وہ بیان بالکل سچ ہوتا ہی کبھی ایک واقعہ کا بیان کیا جاتا ہے جو درحقیقت واقع ہو چکا ہے، مثلاً زید نے عمرو سے لڑائی کی اور آخرکار زید نے عمرو کو مار ڈالا" پس اس واقعہ کا بیان کرنا ایک ایسے قصہ اور واقعہ کا بیان کرنا ہے جو واقع ہو چکا ہے" اور وہ بالکل سچ ہے۔

اور کبھی اُن واقعات کا بیان کیا جاتا ہے جو انسان خواب میں دیکھتا ہے، جس میں عجیب واقعات پیش آتے ہیں، اُن واقعات کا بیان کرنا بھی باوجودیکہ اُن میں سے ایک بھی بجز خیال کے ظاہر میں واقع نہیں ہوا بلکہ سچا بیان ہے بشرطیکہ صراحتاً یا اشارتاً یا کنایتاً یا قرینہ سے یا کسی کلام ماسبق سے یا طرز کلام سے پایا جاوے، کہ یہہ بیان اُن واقعات کا ہے جو خواب میں دیکھے ہیں اور کبھی کسی کی حالت سے جو اُمور مترشح

† ثم استوىٰ الى السماء وهى دخان فقال لها وللارض ائتيا طوعا او كرها قالتا اتينا طائعين۔

(سورۃ حم سجدۃ آیت ۱۰)

‡ يوم نقول لجهنم هل امتلات وتقول هل من مزيد + سورۃ قاف آیت ۲۹)

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (۲۸)
وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا

ہوتے ہیں اُس حالت کو بطور ایک متکلم کے قرار دیکر اُس کی زبان سے قصہ بیان کیا جاتا ہے - یہہ بیان اگر خلاف اُس حالت کے ہو جس کو بطور متکلم کے قرار دیا ہے تو وہ قصہ جھوٹا ہے، اور قرآن مجید میں اس قسم کا کوئی قصہ نہیں ہے، اور اگر وہ حالت اُس چیز میں فرض کر لی گئی ہے، اور اُس حالت مفروضہ کو متکلم قرار دیکر قصہ بیان کیا گیا ہے، تو وہ صرف ایک شاعرانہ مضمون ہے، اور اگر وہ حالت واقعی اور صحیح ہے اور بیان بھی اُس حالت کے مطابق ہے تو وہ بیان بھی بالکل سچ اور درست ہے، کیونکہ اُس بیان کا منشا یہہ نہیں ہوتا - کہ زمین بولی تھی اور آسمان پکارا تھا اور دوزخ چلائی تھی، بلکہ کسی فائدے کے لئے صرف اُس حالت کی کیفیت کا اظہار مطلوب ہوتا ہے - قرآن مجید کی تمام حکایتیں جو کسی کی زبان حال سے تعبیر کیگئی ہیں سب ایسی ہی ہیں اور اسلئے بالکل سچ ہیں -

امثال کا بھی یہی حال ہے کہ کبھی ایک ایسی بات کی مثال دی جاتی ہے جو درحقیقت واقع ہو چکی ہے اور کبھی ایک ایسی بات کی بھی مثال دی جاتی ہے جو صرف فرضی ہے، اور کبھی واقع نہیں ہوئی، مگر اُس کی مثال دینی نہ غلط ہوتی ہے نہ جھوٹ، قرآن مجید جو انسان کی زبان میں اور انسان کے محاورہ بول چال میں نازل ہوا ہے، اور جس میں بہت سی ایسی ہی باتیں ہیں جو ہمارے تجربہ و مشاہدہ سے بالاتر ہیں، اس لئے اُن مطالب کو طرح طرح کی مثالوں اور حکایتوں سے بیان کیا ہے، قرآن مجید پر غور کرتے وقت اُن چیزوں کا خیال نہ رکھنا اور تمام تمثیلوں اور حکایتوں کو یوں قرار دینا کہ یہہ یوں ہی واقع ہو چکی ہیں، تفسیر القرآن بالرای فی قالمہ میں داخل ہے، صاحب تفسیر کشف الاسرار نے اسی آیت کی بحث میں جسکی ہم تفسیر کر رہے ہیں اسی مطلب کی طرف اپنی + تفسیر میں اشارہ کیا ہے -

(علم ادم الاسماء)،، علم،، کے لفظ سے علماے محققین نے بتانا یا سکھانا یعنی تعلیم کرنا مراد نہیں

+ قالوا اتجعل فیها من یفسد فیها و یسفك الدماء و نحن نسبح بحمدك و نقدس لك،، المعنی ان الله تعالی اخبرنا فی کتابه العزیز بما یجب ان ینتفع به من الاخبار من اول العالم الی آخره ولما لم یکن لنا الی علومها سبیل الا بضرب الامثال والامثال منقسم الی قسمین احدهما یفرضة المتکلم

اور ہم تو تیری تعریف جپتے ہیں اور تجھ پاک کو یاد کرتے ہیں، کہا میں جانتا ہوں، وہ کچھ جو تم نہیں جانتے (۲۸) اور (اللہ نے) آدم کو سارے کے سارے نام سکھا دیئے،

لیا ہے، بلکہ انسان میں اُن قوی کا مخلوق کرنا مراد لیا ہے، جن سے انسان تمام چیزوں کو جانتا اور سمجھتا اور خیال کرتا اور سوچتا اور نئی باتیں ظاہر کرتا اور چند باتوں کے ملانے سے ایک نتیجہ نکالتا ہے* بیضاوی میں لکھا ہے کہ اس آیت کے معنی یہہ ہیں کہ، اللہ تعالی نے آدم کو مختلف اجزا اور متباین قوتوں سے پیدا کیا تھا جو طرح طرح کے معقولات اور محسوسات اور متخیلات اور متوہمات کے جاننے کے لائق تھیں، اور حقایق اشیا اور اُنکے خواص اور اُنکے اسما، اور علوم کے اصول اور صنایع کے قواعد اور اُنکے آلات کی کیفیت اُسکے دل میں ڈالی تھی۔ پس جو چیزیں کہ فطرت انسانی میں ہیں اُنہیں کو خدا تعالی نے تعلیم کرنے کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

"آدم" کے لفظ سے وہ ذات خاص مراد نہیں ہے جسکو عوام الناس اور مسجد کے مُلا بابا آدم کہتے ہیں بلکہ اُس سے نوع انسانی مراد ہے، جیسا کہ تفسیر کشف الاسرار و ہتک الاستار میں لکھا ہے "وما المقصود با آدم وحدہٗ" اور خود خدا تعالی نے فرمایا ہے، "لقد خلقناکم ثم صورناکم ثم قلنا للملائکۃ اسجدوا لآدم" پس کم کا خطاب کل انسانوں کی طرف ہے اور آدم سے بنی آدم یعنی نوع انسان مراد ہیں۔

"اسما" کے لفظ کے معنی اکثر مفسرین نے وہ سمجھے ہیں جس کو ہم نام کہتے ہیں، جیسے گھوڑا گدھا ٹٹو یا کلو تھو بدھو مگر یہہ ٹھیک نہیں ہے بیضاوی نے اسما کی تفسیر میں اُسکے اشتقاقی* معنی مراد لئے ہیں۔ پس علم آدم الاسما"

وان لم یکن وقع فی الوجود والآخر قد کان فی الوجود وجری فالاولی ان یقرب الامثال ما وقع فی الوجود لنعلم من خلک مثلہ لا بمجرد الحکایۃ عما وقع - فھذا الکتاب یشتمل علی الامثال التی یحتاج الی علمھا الانسان من اول ابداعہ الی آخر مرجعہ الی اللہ سبحانہ - والمراد بالامثال ما یستقر بالامثال فی النفوس من الھیأت ولھذا قال لقد ضربنا للناس فی ھذا القرآن من کل مثل فافھم (تفسیر کشف الاسرار)

* والمعنی انہ تعالی خلقہ من اجزاء مختلفۃ وقوی متباینۃ مستعد الادراک انواع المدرکات من المعقولات والمحسوسات والمتخیلات والموھومات والھمہ معرفۃ ذوات الاشیاء وخواصھا واسمائھا واصول العلم وقوانین الصناعۃ وکیفیۃ الاتھا بیضاوی * والاسم باعتبار الاشتقاق ما یکون علامۃ للشیء ودلیلا یرفعہ الی الذھن من الالفاظ والصفات والافعال - بیضاوی۔

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲۹)

سے یہ مراد نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو سب چیزون کے نام بتا دئے تھے جو درحقیقت اُس وقت خارج میں موجود بھی نہ تھیں بلکہ جو قویٰ اُس میں پیدا کئے ہیں اور جن کے سبب اُسکا ذہن ایک نشان یا دلیل سے دوسرے طرف منتقل ہوتا ہے اور نتیجہ پیدا کرتا ہے، اُس کو اسماء کے لفظ سے بیان کیا ہے، اور جو کہ یہہ قویٰ ایسے تھے جن سے انسان تمام چیزون محسوسات و معقولات کو جان سکتا ہے، اسی لئے ،،کلہا،، کے لفظ سے اُسکی تاکید کی ہے جس سے اس بات کا اشارہ ہے کہ تمام چیزون کے جاننے کا مادہ انسان میں ودلیعت کیا گیا ہے، اِن قویٰ کو جو اسماء کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اس میں بڑا دقیقہ یہہ ہے، کہ انسان کسی چیز کی حقیقت و ماہیت کو نہیں جانتا، جو کچھ وہ جانتا ہے وہ صرف اسماء ہی اسماء ہیں پس ،،علم آدم الاسماء کلہا،، کہنا بالکل انسان کی فطرت کے مطابق اور اُسکے بیان کے نہایت ہی مناسب ہے۔

تفسیر کشف الاسرار* میں اس سے بھی زیادہ وضاحت و عمدگی سے بیان کیا ہے کہ ہر شئے کا علم بالقوہ جو انسان کی فطرت میں ہے اُسی کو ،،علم آدم الاسماء،، سے تعبیر کیا ہے۔ پس آیت کے معنی یہہ ہوئے کہ خدا تعالیٰ نے انسان میں ایسے قویٰ پیدا کئے ہیں، جن سے ہر ایک چیز کو سمجھ سکتا ہے اور دلیل سے نتیجہ کو حاصل کر سکتا ہے۔

،،عرضہم،، میں جو ضمیر جمع مذکر کی ہے اُس کا مرجع اوپر مذکور نہیں ہے، اِس لئے تمام مفسرون نے اسماء کے لفظ سے جو ضمناً اُس کے مسمیات سمجھ میں آتے ہیں، اُس طرف اِس ضمیر کو راجع کیا ہے، پھر یہ مشکل پیش آئی ہے کہ اُسکے لئے ضمیر مونث کا ہونا چاہئے تھا نہ ضمیر جمع مذکر کا۔ اِسکا حل صاحب تفسیر

* فاعلم ان اللہ جل اسمہ اوجد فی آدم ما یحتاج الیہ من کون خلقہ علی ما ھو علیہ من النفس الناطقۃ وھا ھلبو الحقل واشھدہ بذلک النور ما یجب لکل مسمی من اسم وقد سلمت ان کل منطوق بالاسم فعلمہ علما لا جہل معہ و ھذا العلم فی جبلۃ ذریتہ موجود لا یزول فھو علم کل شئی بالقوۃ وکانہ بزر اذا اجیدت فلاحتہ صار کل شئی بالفعل علم الانسان ما لم یعلم۔ نظھر من ھذا العلم فی کل زمن وقوم بحسب ما اراد اللہ (تفسیر کشف الاسرار)

پھر انکو یعنی آدم یا انسان کو، فرشتوں کے سامنے کیا اور کہا کہ مجھکو اِن کے نام (یعنی وہ حقائق و معارف جو اُن میں ہیں) بتاؤ اگر تم سچے ہو (۲۹)

بیضاوی نے یہہ کہا ہے، کہ مسمیات میں ذوی العقول و غیر ذوی العقول سب شامل تھے" اِس لئے تغلیباً ضمیر جمع مذکر کی جو ذوی العقول کے لئے مخصوص ہی لائی گئی ہے۔

مگر میرے نزدیک "ہم" کی ضمیر انسانوں کی طرف راجع ہے جو ضمناً لفظ آدم سے سمجھے جاتے ہیں۔ ابھی بتایا گیا کہ آدم سے شخص خاص مراد نہیں ہے بلکہ انسان مراد ہے، اور اس مقام پر افراد انسانی کا موجود ہونا بھی تسلیم نہیں کیا گیا ہے بلکہ صرف اُسکی فطرت کا بیان کرنا تسلیم ہوا ہے" اور اس لئے ضمیر جمع مذکر غایب کا اُسکے لئے لانا بالکل صحیح تھا" گویا خدا تعالیٰ نے تمام چیزوں کے جاننے کی قوت انسان میں اور اُسکی ذریات میں ودیعت کرکے تنزلاً فرشتوں سے کہا کہ تم سب باتیں تو کیا بتاؤ گے انسان ہی میں جو کچھ ودیعت کیا گیا ہے اُسی کو بتلا دو، جب وہ عاجز آئے تو خدا نے انسان سے کہا کہ تو اُن حقائق و معارف کو جو فرشتوں میں ہیں بتلا دے۔

اس آیت میں جو "عرضہم" کی ضمیر ہے وہ انسان کی طرف راجع ہے اور "انبئہم" اور "اسمائہم" میں جو ہم کی ضمیر ہے وہ فرشتوں کی طرف راجع ہے۔

اس قصہ میں جو سجدہ کا لفظ آیا ہے اُسکے معنی زمین پر سر ٹیکنے کے نہیں ہیں، بلکہ اطاعت اور فرمانبرداری یا تذلل کے ہیں، سجدہ کے لفظ کو اِن معنوں میں مستعمل ہونے کے ثبوت میں بیضاوی نے دو شعر نقل کئے ہیں، پہلا شعر یہہ ہے۔

شعر

بجمع تضل البلق فی حجراتہ
تری الاکم فیہ سجدا للحوافر

یہہ شعر زید الخیل الطائی کا ہے، اور اس کا مطلب یہہ ہے، کہ ٹیلے و جنگل اُس کے گھوڑوں کی ٹاپوں کو سجدہ کرتے ہیں، یعنی ٹاپوں کے نیچے ذلیل ہوتے ہیں اور روندے جاتے ہیں، دوسرا شعر یہہ ہے۔

قَالُوا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ (۳۰)

فقدن لها وهما ابا خطامه	وقلن لها اسجد لليلى فاسجدا

یہہ شعر حمید ابن ثور الہلالی کا ہے اس کا مطلب یہہ ہے کہ کیسا ہی وحشی و شریر اونٹ لیلی کے سامنے لے جاویں اور لیلی کی سہیلیاں اُس کو کہیں کہ لیلی کو سجدہ کر تو وہ سجدہ کرتا ہے یعنی گردن ڈالکر تابعداری کرتا ہے۔

تین لفظ اس قصہ میں اور ہیں، جنت۔ شجر۔ ہبوط، علماے اسلام نے اِس کے بیان میں عجیب باتیں کی ہیں، جو لوگ کہ صرف لفظوں ہی پر چلتے ہیں اُنھوں نے تو جنت کو ایک خیالی بہشت عالم بالا پر مان لیا، اور درخت سے بھی سچ مچ کا کوئی درخت (گیہوں کا یا انگور کا یا انجیر کا) اور "ہبوط" سے عالم بالا سے زمین پر گرنا۔

توریت میں بھی یہہ قصہ نہایت عمدگی و لطافت سے بیان کیا گیا ہے، اُس میں جنت سے ایک باغ کا دنیا میں آدم کے لئے لگانا، اور اُس میں دو درختوں کا ہونا، جنکے کھانے سے آدم کو منع کیا تھا، ایک درخت علم خیر و شر، اور دوسرا درخت، حیات، بیان ہوا ہے۔ یہودی اور عیسائیوں نے بھی توریت کے بیان لطیف کو نہایت ابتر و خراب طرح پر بیان کیا ہے، اور یہہ سمجھے ہیں کہ درحقیقت خدا نے عدن میں ایک باغ اوگایا تھا، اور اُس میں سچ مچ کے دو درخت تھے، ایک کی یہہ تاثیر تھی کہ اُس کے کھانے سے علم خیر و شر آجاتا ہے، جیسے سقمونیا کے کھانے سے دست آجاتے ہیں، اور دوسرے کا پھل امرت پھل ہے جسکے کھانے سے آدمی کبھی نہیں مرتا۔ پس بہت سے علماے اسلام نے جن کو اس قسم کے قصص میں یہودیوں کی پیروی کرنے کی عادت پڑ گئی ہے، اُن کی پیروی کی اُنھوں نے کہا کہ یہہ جنت زمین پر تھی اور ہبوط سے اُنھوں نے جنت سے باہر نکال دینے کے معنی لئے، معتزلہ نے اُس کی جگہہ

قال ابو القاسم البلخی و ابو مسلم الاصفہانی ہذہ الجنۃ فی الارض وحمل الاہباط علی الانتقال من بقعۃ الی بقعۃ کما فی قولہ تعالی اہبطوا مصرا (تفسیر کبیر سورۃ بقر آیت ۳۵)

وقال المعتزلۃ انہا بستان کان بارض فلسطین او بین الفارس والکرمان خلقہ اللہ تعالی امتحانا لادم۔ (بیضاوی سورۃ بقر آیت ۳۵)

قال القاضی ان سدرۃ المنتہی فی الارض سمیت بہا لان علم الملائکۃ ینتہی الیہا (مرقاۃ)

بولے تو ہی برگزیدہ ہے، تو نے جو کچھ ہمکو سکھایا ہے اُسکے سوا ہم کچھ نہیں جانتے بیشک

تو ہی جاننے والا حکمت والا ہی (۳۰)

بھی بتادی کہ فلسطین میں فارس و کرمان کے بیچ میں تھی، اور بعضوں نے لکھا کہ سدرۃ المنتہیٰ بھی زمین ہی پر تھا مگر ہم ان معنوں میں سے کسیکو تسلیم نہیں کرتے، ہم شروع ہی سے اس قصہ کو ایک واقعی قصہ نہیں سمجھتے، بلکہ صرف انسانی فطرت کا اُس فطرت کی زبان حال سے بیان قرار دیتے ہیں، پس انسان کا جنت میں رہنا اُسکی فطرت کی ایک حالت کا بیان ہے، جب تک کہ وہ مکلف کسی امر و نہی کا نتھا واللہ دری قال۔

طفلی و دامان مادر خوش بہشتے بودہ است

چون بہ پائے خود روان گشتیم سرگردان شدیم

اور اُسکا شجر ممنوعہ کے پاس جانا یا اُس کا پھل کھانا، اُس کی فطرت کی اُس حالت کا بیان ہے جب کہ وہ اوامر و نواہی کا مکلف ہوا اور ہبوط سے اُسکی فطرت کی اُس حالت کا تبدیل ہونا مراد ہے جبکہ وہ غیر مکلف سے مکلف ہوا، ہبوط÷ کے لفظ کا استعمال صرف انتقال مکان ہی پر مختص نہیں ہے۔

اس بات کا ذکر کہ خدا نے کس چیز سے آدم کو یا تمام زمین پر چلنے والے جانداروں کو پیدا کیا متعدد لفظوں سے قرآن میں آیا ہے، ایک جگہہ فرمایا ہے،، انی خالق بشرا من طین'' ایک جگہہ فرمایا ہے'' خلقہ من تراب'' اور ایک جگہہ فرمایا ہے'' من صلصال من حماء مسنون'' ایک جگہہ فرمایا ہے'' ھو الذی خلق من الماء بشرا'' ایک جگہہ فرمایا ہے'' خلق کل دابۃ من الماء'' ایک جگہہ فرمایا ہے'' وجعلنا من الماء کل شیء حی''

'' تراب'' کے معنی مٹی کے ہیں'' طین'' کے معنی گارے کے ہیں'' صلصال'' کے معنی ریتیلے گارے کے ہیں اور'' حماء مسنون'' اُس بدبو کیچڑ کو کہتے ہیں جو پانی کے نیچے بیٹھی ہوئی ہوتی ہے'' الماء'' کا لفظ تین جگہہ آیا ہے '' خلق کل دابۃ من الماء'' اور'' جعلنا من الماء کل شیء حی'' ان دونوں مقام میں جو لفظ'' ماء'' ہے اُس سے تو نطفہ مراد ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ دابہ کے پہلے جو لفظ'' کل'' ہے اُس میں تمام دابہ جو زمین پر چلتے ہیں داخل ہیں، چنانچہ خود قرآن میں اُسکی تفصیل بیان فرمائی ہے کہ'' منھم من یمشی علی بطنہ ومنھم

÷ ھبط ثمن السلعۃ ھبوطا نقص وھبط اللہ ھبطا (قاموس)

قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۙ

من یمشی علی رجلین ومنھم من یمشی علی اربع،، اور بہت سے دابہ ایسے ہیں جو نطفے سے پیدا نہیں ہوتے اور ،، من الماء بشرا،، میں جو لفظ ،، ماء،، ہی اُس سے بھی نطفہ مراد نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ یہاں بیان انسان کی اول خلقت کا ہے، اور خلقت اول انسان کی نطفہ سے نہیں ہو سکتی بلکہ اُس سے دریا یا سمندر کا پانی مراد ہے، اور دلیل اسکی یہہ ہے کہ اسی آیت کے اوپر خدا نے فرمایا ہے۔

"ھوالذی مرج البحرین ھذا عذب فرات وھذا ملح اجاج وجعل بینھما برزخا وحجرا محجورا" اس کے بعد فرماتا ہے ،، وھوالذی خلق من الماء بشرا،، پس الماء میں جو الف لام ہے وہ صاف اُسی پانی کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا اوپر بیان ہے ✣ بیضاوی نے بھی بطور قول مرجح اسی بات کو اختیار کیا ہے، اور پانی سے وہی پانی مراد لیا ہے، پس ان تمام آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام چیزوں کی ترکیب کیمیاوی سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اُس سے انسان مخلوق ہوا ہے۔

دو چیزوں کا آپس میں مرکب ہونا دو طرح پر ہوتا ہے، ایک اسطرح پر کہ ظاہر میں اُن دونوں کے اجسام مل گئے اور دیر کے بعد پھر جدا ہو گئے، مثلاً ہم ایک بوتل میں پانی اور نہایت باریک ریت ڈالیں اور بوتل کو خوب ہلادیں تو ریت اور پانی بالکل مل جاویگا، مگر جب تھوڑی دیر رکھدیں تو ریت

✣ واذ قال ربك للملائكة انی جاعل فی الارض خلیفه قالوا اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفك الدماء ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك قال انی اعلم ما لا تعلمون (سورۃ بقر) انی خالق بشرا من طین (ص) من تراب (آل عمران) من صلصال من حماء مسنون (الحجر) وعلم ادم الاسماء کلھا ثم عرضھم علی الملئکة فقال انبئونی باسماء ھؤلاء ان کنتم صدقین قالوا سبحنك لا علم لنا الا ما علمتنا انك انت العلیم الحکیم قال یا ادم انبئھم باسمائھم فلما انبأھم باسمائھم قال الم اقل لکم انی اعلم غیب السموت والارض واعلم ما تبدون

✣ خلق من الماء بشرا یعنی الذی خمر به طینت ادم او جعله جزءا من مادة البشر التجتمع وتسلسل وتقبل الاشکال والھیات بسھولة (بیضاوی)

کہا اے آدم اُنکے (یعنی فرشتون کے) نام (یعنی اُنکے حقایق و معارف) اُنکو (یعنی فرشتونکو) بتا دے پھر جب آدم نے اُنکے (یعنی فرشتون کے) نام اُنکو (یعنی فرشتونکو) بتا دیے (خدا نے) کہا کہ میں نے تمکو کہتا تھا کہ میں آسمانونکی اور زمین کی چھپی باتونکو جانتا ہون

الگ اور پانی الگ ہو جاوے گا۔ یا ہم مٹی میں پانی ڈال کر اُسکو گارا بنا دین تو مٹی اور پانی مل جاوے گا مگر جب رہنے دیں تو پانی ہوا ہو کر نکل جاوے گا اور نری مٹی رہ جاوے گی، اسطرح پر دو چیزون کا مرکب ہونا در حقیقت حقیقی ترکیب نہیں ہے۔

او ترکیب کیمیاوی یہہ ہے کہ دو چیزین آپس میں اسطرح پر ملیں کہ از خود جدا نہ ہو سکیں، بلکہ وہ دونوں ملکر ایک تیسری چیز بن جاوے۔ پس "تراب" اور "طین" اور "صلصال" اور "حماء مسنون" اور "ماء" کی ترکیب کیمیاوی سے جو چیز پیدا ہوتی ہے، اُس سے انسان پیدا ہوا ہے، وہ چیز غالباً وہ ہے جو سطح آب پر جمع ہو جاتی ہے اور نہ وہ مٹی ہوتی ہے نہ ریت نہ گارا نہ کیچڑ بلکہ اُن سب کی ترکیب کیمیاوی سے ایک اور ہی چیز بن جاتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ اُسی سے تمام جاندار، انسان و حیوان، مخلوق ہوئے ہیں، اور یہی بات قرآن سے پائی جاتی ہے۔

قرآن مجید میں آدم کا قصہ آٹھہ جگہہ آیا ہے، سورہ بقر، سورہ آل عمران، سورہ اعراف، سورہ حجر، سورہ بنی اسرائیل، سورہ کہف، سورہ طٰہٰ، سورہ صٓ، میں، کسی جگہہ کوئی مضمون بیان ہوا ہے، کسی جگہہ کوئی، کسی جگہہ اجمال ہے کسی جگہہ تفصیل، کسی جگہہ ایک مضمون کو کسی لفظ سے ظاہر کیا ہے، دوسری جگہہ کسی لفظ سے، مگر سب کا نتیجہ یا مقصد متحد ہے، ہم حاشیہ پر اُن آٹھوں جگہہ کی آیتون کو اسطرح پر جمع کرتے ہیں جس میں تمام مضمون اور الفاظ ایک جگہہ سلسلہ وار جمع ہو جاویں اور اُسکے مقابل میں اُنکا ترجمہ بھی اُسی سلسلہ سے لکھتے ہیں تا کہ کل قصہ اُنہی الفاظ میں جو قرآن میں آئے ہیں ایک جگہہ ہو جاوے، اور پھر اپنی سمجھ کے موافق جو ہمنے

۱۰ اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں بولے کیا تو اُس میں ایسے کو خلیفہ کرے گا جو اس میں فساد کرے اور خون بہاوے اور ہم تو تیری تعریف بیچتے ہیں اور تجھ پاک کو یاد کرتے ہیں کہا میں جانتا ہون وہ کچھ جو تم نہیں جانتے۔ میں پیدا کرنے والا ہوں ایک آدمی گارے، مٹی ریتیلے گارے، بدبو کیچڑ سے۔ اللہ نے آدم کو سب نام سکھا دئے پھر اُن کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ مجھکو ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو بولے تو ہی برگزیدہ ہے تو نے جو کچھ ہمکو سکھایا ہے اُسکے سوا ہم کچھ نہیں جانتے بے شک تو ہی جاننے والا حکمت والا ہے کہا اے آدم اُنکے نام اُن کو بتا دے پھر جب آدم نے

وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۳۱﴾ وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ
اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡٓا اِلَّآ اِبۡلِيۡسَ اَبٰى وَاسۡتَكۡبَرَ وَكَانَ
مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۳۲﴾ وَقُلۡنَا يٰٓاٰدَمُ اسۡكُنۡ اَنۡتَ وَزَوۡجُكَ الۡجَنَّةَ

قرآن کا مطلب سمجھانے کے لیے اُسی قصہ کو بیان کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے بخوبی دونوں بیانوں کا مقابلہ کر سکیں۔

وما کنتم تکتمون (بقر) ولقد خلقنا کم ثم صورنا کم ثم قلنا للملئکۃ اسجدوا لادم (سورۂ اعراف) فاذا
سویتہ ونفخت فیہ من روحی فقعوا لہ سٰجدین (الحجر) فسجد الملئکۃ کلھم اجمعون (الحجر) الا ابلیس لم یکن من
السٰجدین (اعراف) کان من الجن ففسق عن امر ربہ (الکھف) ابی ان یکون مع السٰجدین (الحجر) واستکبر و
کان من الکافرین (بقر) قال یا ابلیس مالک الا تکون مع السٰجدین (الحجر) ما منعک ان تسجد لما
خلقت بیدی استکبرت ام کنت من العالین (ص) ما منعک الا تسجد اذ امرتک (اعراف) قال
ءاسجد لمن خلقت طینا (بنی اسرائیل) لم اکن لاسجد لبشر خلقتہ من صلصال من حمإ مسنون (الحجر)
انا خیر منہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین (اعراف) قال فاھبط منھا فما یکون لک ان تتکبر فیھا فاخرج
منھا مذءوما مدحورا (اعراف) فانک رجیم وان علیک اللعنۃ الی یوم الدین (الحجر) انک من الصاغرین قال
انظرنی الی یوم یبعثون قال انک من المنظرین (اعراف) الی یوم الوقت المعلوم قال رب بما اغویتنی
لازینن لھم فی الارض (الحجر) فبعزتک لاغوینھم اجمعین (ص) لاقعدن لھم صراطک المستقیم
ثم لاتینھم من بین ایدیھم ومن خلفھم وعن ایمانھم وعن شمائلھم ولا تجد اکثرھم شاکرین
(اعراف) قال ارءیتک ھذا الذی کرمت علی لئن اخرتن الی یوم القیامۃ لاحتنکن ذریتہ الا قلیلا (بنی
اسرائیل) الا عبادک منھم المخلصین قال ھذا صراط علی مستقیم (الحجر) قال فالحق والحق اقول
(ص) لمن تبعک منھم لاملئن جھنم (اعراف) منک وممن تبعک منھم اجمعین (ص) اذھب
فمن تبعک منھم فان جھنم جزاؤکم جزاء موفورا واستفزز من استطعت
منھم بصوتک واجلب علیھم بخیلک ورجلک وشارکھم فی الاموال
والاولاد وعدھم وما یعدھم الشیطان الا غرورا (بنی اسرائیل)

اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو اُسکو بھی جانتا ہون (۳۱) اور جب ہمنے فرشتونکو کھا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو اُنھون نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے انکار کیا اور تکبر کیا، اور وہ کافرون میں سے تھا (۳۲) اور ہمنے آدم سے کھا کہ بس تو اپنے جوڑے سمیت جنت میں

اِس قصہ میں چار فریق بیان ہوئے ہیں، ایک خدا، دوسرے فرشتے، (یعنی قوئ ملکوتی) تیسرے ابلیس یا شیطان (یعنی قوائ بہیمی) چوتھے آدم (یعنی انسان جو مجموعہ اُن قوئ کا ہے اور جس میں عورت و مرد دونون شامل ہیں) مقصود

اُن کے نام اُنکو بتا دئے خدا نے کہا کہ مین نہ تمکو کہتا تھا کہ میں آسمانون کی اور زمین کی چھپی ہوئی باتون کو جانتا ہون اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو اُسکو بھی جانتا ہوں بیشک ہمنے تمکو پیدا کیا اور تمہاری صورت بنائی پھر ہمنے فرشتوں سے کھا کہ آدم کو سجدہ کرو جب میں اُسکو ٹھیک کر چکون اور اُس میں اپنی روح پھونکدون تو تم اُسکو سجدہ کرتے ہوئے جھک پڑو پھر سب فرشتون نے سجدہ کیا مگر شیطان نے نہیں کیا وہ سجدہ کرنیوالوں میں نہ تھا وہ جن میں سے تھا پس نافرمانی کی اُس نے اپنے پروردگار کی سجدہ کرنیوالون کے ساتھ ہونے سے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا خدا نے کھا اے ابلیس کیون تو سجدہ کرنیوالوں کے ساتھ نہوا کس چیز نے تجھکو منع کیا کہ نہ سجدہ کرے اُسکو جسے میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا تکبر کیا تو نے یا تو بڑوں میں ہے کس بات نے تجھکو روکا کہ میرے حکم کرنے پر بھی تو سجدہ نہ کرے ابلیس نے کھا کہ کیا میں ایسے کو سجدہ کرون جسے تو نے گارے سے پیدا کیا ہے میں ایسا نہیں ہوں کہ اُس آدمی کو سجدہ کرون جسے تو نے تری مٹی سے بنایا ہے میں اُس سے بہتر ہون مجھکو تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اُسکو تو نے رتیلے گارے اور بدبو کیچڑ سے پیدا کیا ہے میں اُس سے بہتر ہون مجھکو تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اُسکو گارے سے خدا نے کہا دور ہو یہان سے تجھکو نہیں چاہیئے تھا کہ یہان تکبر کرتا یہان سے ذلیل و خوار ہو کر نکل بے شک تو مردود ہے اور بیشک تجھ پر قیامت تک لعنت رہیگی بے شک تو ذلیلون میں سے ہے ابلیس نے کھا کہ قیامت تک مواخذہ نہ ہونے کی مجھے مہلت دے خدا نے کھا تجھکو مہلت دی گئی وقت معین تک ابلیس نے کھا کہ اے پروردگار مجھکو تیرے بہکانے ہی کی قسم کہ میں دنیا میں بُری باتونکو اُنھیں اچھی کر دکھاؤن گا اور قسم ہے تیری عزت کی اُن سبکو بہکاؤنگا اور اُنکے لئے تیرے سیدھے رستہ کی راہ ماری کرنیکو گھات میں بیٹھونگا پھر اُنکے آگے سے اور اُنکے پیچھے سے اور اُنکے دائیں اور اُنکے بائیں سے اُنپر آن پڑونگا اور تو اُن میں سے بہتوں کو شکر کرنیوالا نپاویگا ابلیس نے کھا کہ مجھے بتا کہ کیوں اس شخص کو مجھ پر بزرگی دی ہے اگر تو نے مجھے قیامت تک کی مہلت دی تو اس شخص کی اولاد کو بجز چند کے جڑ پیڑ سے اوکھاڑ دونگا بجز تیرے خالص بندون کی جو اُنمیں ہوں خدا نے کہا کہ خالص بندہ ہونا ہی میری تک پہونچنے کا سیدھا رستہ ہے خدا نے کھا کہ سچ بات یہ ہے اور سچ ہی کہتا ہون جو لوگ اُن میں سے تیری پیروی کرینگے بیشک ہو دینگا جہنم کو تجھ سے اور اُن سب سے جنھوں نے اُن میں سے تیری پیروی کی جا پھر جو کوئی اُن میں سے تیری پیروی کریگا تو بیشک

وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِينَ ﴿٣٣﴾ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ

قصہ کا انسانی فطرت کی زبان حال سے انسان کی فطرت کا بیان کرنا ہے۔ خدا جو سب کا پیدا کرنیوالا ہے گویا قوائے ملکوتی کو مخاطب کر کر فرماتا ہے کہ میں ایک مخلوق یعنی انسان کثیف مادہ سے پیدا کرنیکو ہوں مگر وہی میرا نایب ہونے کے لایق ہے، جب میں اُس کو پیدا کر چکوں تو تم سب اُس کو سجدہ کرنا، اس مقام پر

ان عبادی لیس لک علیهم سلطٰن الا من اتبعک من الغاوین (الحجر) وکفی بربک وکیلا (بنی اسرائیل) و قلنا (بقر) یا ادم اسکن انت وزوجک الجنة فکلا (اعراف) منها رغدا (بقر) حیث شئتما ولا تقربا هذه الشجرة فتکونا من الظالمین (اعراف) فقلنا یا ادم ان هذا عدو لک ولزوجک فلا یخرجنکما من الجنة فتشقی ان لک الا تجوع فیها ولا تعری وانک لا تظماء فیها ولا تضحی (طه) فوسوس لهما الشیطان لیبدی لهما ما ووری عنهما من سواتهما (اعراف) قال یا ادم هل ادلک علی شجرة الخلد وملک لا یبلی (طه) وقال ما نهاکما ربکما عن هذه الشجرة الا ان تکونا ملکین او تکونا من الخلدین وقاسمهما انی لکما لمن الناصحین فدلهما بغرور فلما ذاقا الشجرة بدت لهما سواتهما وطفقا یخصفان علیهما من ورق الجنه (اعراف) وناداهما ربهما الم انهکما عن تلکما الشجرة واقل لکما ان الشیطان لکما عدو مبین (اعراف) فازلهما الشیطان عنها فاخرجهما مما کانا فیه وقلنا اهبطوا بعضکم لبعض عدو ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین (بقر) قال فیها تحیون وفیها تموتون ومنها تخرجون (اعراف) وعصی ادم ربه فغوی (طه) فتلقی ادم من ربه کلمات فتاب علیه انه هو التواب الرحیم (بقر) قالوا ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین (اعراف) ثم اجتباه ربه فتاب علیه وهدی (طه) قلنا اهبطوا منها جمیعا فاما یاتینکم منی هدی فمن تبع هدای فلا خوف علیهم ولا هم یحزنون (بقر) فلا یضل ولا یشقی (طه)۔

اور اُس میں سے دل بھر کر کھاؤ جہاں سے چاہو اور اس درخت کے پاس مت جاؤ نہیں تو ظالموں میں ہوگے (۳۲) پھر شیطان نے اُنکو اُس سے ڈگمگا دیا پھر اُن دونوں کو اُس سے جسمیں وہ تھے نکلوایا اور ہمنے اُنکو کہا کہ اُسمیں سے اُترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو

مخاطبین کو اس بات کا کہ اُس مخلوق میں قوائے بہیمیہ ہونگے عالم قرار دیا گیا ہے اور مقتضائے فطرت اُن قوائے کے اُنھون نے کہا کہ کیا تو ایسے کو خلیفہ کریگا جو زمین پر فساد

جہنم تمہاری سزا ہوگی پوری سزا بہکا اُن میں سے جسکو بہکا سکے اپنی آواز سے اور چڑھا اُن پر اپنے سوار و پیدل لیکر اور حصہ بانٹ لے اُنکے مال میں اور اولاد میں اور اُنسے وعدہ کرلے اور کوئی وعدہ اُن سے شیطان نہیں کرتا بجز دھوکے کو بیشک میری بندوں پر تجھکو کچھ غلبہ نہیں ہے بجز اُن گمراہوں کے جنھوں نے تیری پیروی کی اور اے پیغمبر تیرا خدا اُنکی کارسازی کیلئے کافی ہے خدا نے کہا اے آدم تو اور تیرا جوڑا جنت میں رہ اور کھاؤ اُس میں سے پیٹ بھر کر جہاں سے تم چاہو اور اس درخت کے پاس مت جاؤ اگر جاؤ گے تو ظالموں میں سے ہوگے۔ خدا نے کہا ای آدم یہہ ابلیس بیشک تیرا اور تیری جوڑے کا دشمن ہے یہہ تمکو جنت میں سے نہ نکال دے کہ تم بدبخت ہوجاؤ یہاں تو تم نہ بھوکے ہوگے نہ ننگے ہوگے نہ پیاسے ہوگے اور نہ دھوپ میں جلوگے پھر وسوسے میں ڈال دیا اُنکو شیطان نے تاکہ جو پوشیدہ بُرائیاں اُنمیں تھیں اُنکو ظاہر کردے شیطان نے کہا ای آدم کیا بتلاؤں میں تجھکو ہمیشہ رہنے کا درخت اور پرانی نہ ہونیوالی سلطنت اور کہا کہ خدا نے تمکو بجز اسکے اور کسی لیے اس درخت سے منع نہیں کیا کہ تم فرشتے ہوجاوگے یا ہمیشہ رہوگے اور اُن سے قسم کھا کر کہا کہ بیشبہہ میں تمہارا خیرخواہ ہوں پھر اُنکو دھوکے میں ڈالدیا پھر جب اُنہوں نے اُس درخت کو چکھا تو اُن دونو کی شرمگاہیں ظاہر ہوگئیں اور اُنھوں نے بہشت کے درخت کے پتوں سے اُنکو چھپانا شروع کیا خدا نے اُن دونوں کو للکارا کہ کیا میں نے تمکو اس درخت کے کھانے سے منع نہیں کیا تھا اور تم سے نہیں کہدیا تھا کہ شیطان تمہارا علانیہ دشمن ہے پس اُنکو شیطان نے اُس سے ڈگمگا دیا اور جس میں تھے اُس میں سے نکال دیا خدا نے کہا دور ہو تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہاری لیے ایک مدت تک زمین پر رہنا اور اُس سے منفعت اُٹھانی ہے اُس میں تم جیوگے اُس میں مروگے اس میں سے اُٹھوگے نافرمانی کی آدم نے اپنے پروردگار کی اور بہک گیا پھر آدم کے دل میں ڈالیں اُس کے پروردگار نے چند باتیں پھر اُسکو خدا نے معاف کیا وہ بیشک بڑا معاف کرنیوالا مہربان ہے آدم اور اُسکی جورو نے کہا کہ اے پروردگار ہمارے ہمنے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمکو نہ بخشیگا اور نہ مہربانی کریگا تو بیشک ہم نقصان والوں میں ہونگے پھر اُسکے پروردگار نے اُسکو پسند کیا اور اُسکو معاف کیا اور سیدھی راہ بتائی خدا نے کہا کہ تم سب یہاں سے دور ہو پھر میرے پاس سے تمہاری پاس ہدایت پہونچیگی جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کریگا تو اُس پر نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوگا اور نہ بہکیگا اور نہ بدبخت ہوگا۔

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٣٤﴾ فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿٣٥﴾ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ

مچاوے اور خون بہاوے، اور قواے ملکوتی نے اپنی فطرت اس طرح بیان کی، کہ ہم تو تیری ہی تعریف کرتے ہیں اور تجھ پاک کو یاد کرتے ہیں۔

یہ پچھلا فقرہ قوی کی فطرت کو ہی بتاتا ہے، جو قوی جس کام کے لئے ہیں وہی کام کرتے رہتے ہیں، کہ وہی انکی تسبیح اور تقدیس ہے۔ قوت نامیہ انما، اور قوت ناطقہ نطق، قوت احراق، حرق، قوت سیالہ سیلان قوت جامدہ، انجماد، کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتی، انسان باوجودیکہ قواے متضادہ ملکوتیہ وبہیمیہ سے مرکب ہے، مگر اس میں ایسی قدرت ہے کہ ایک قوت پر دوسری قوت کو غلبہ دے سکتا ہے، اور جس قوت سے چاہے کام لے سکتا ہے۔ غیر معلوم چیزوں کو جان جاتا ہے، عالم کے اجزا میں ترکیب دیکر ایک نئی چیز ایجاد کرلیتا ہے۔ اور عالم کے تبدل میں ایک بڑی مداخلت رکھتا ہے اور ٹھیک خدا کا نایب کہلانے کا مستحق ہے۔

انسان کی فطرت کا مخاطبین پر فطرتی تفوق ظاہر کرنے کو، تمام کمالات نفسانی و روحانی وحقائق ومعارف کو انسان کی فطرت میں ودیعت کرکر، جسکو تعلیم اسماء سے تعبیر کیا ہے، انسان کو مخاطبین کے سامنے کیا کہ جو حقائق ومعارف ان میں ہیں اُن کو بتلاؤ، قواے بسیطہ کی فطرت میں اُس کا علم نہ تھا، پس گویا وہ بولے کہ ہم تو اُن کمالات کو نہیں جانتے ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے بتایا ہے یعنی جس محدود فطرت پر پیدا کیا ہے اُس کے سوا کچھ نہیں کرسکتے، مگر انسان کی زبان حال نے جس کی فطرت میں ادراک کلیات وجزئیات تھا مخاطبین کی حقیقت کو بتادیا اور گویا مخاطبین نے زک پائی، اب خدا اپنی قدرت وکمال کے اظہار کے لئے انسانی محاورے کے موافق جیسے کہ انسان کسی کو زک دیکر وہرا تا ہے فرماتا ہے، کہ کیوں میں نہ کہتا تھا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

اِسکے بعد خدا تعالیٰ نے اُن قوائے متضادہ کی جن سے انسان مرکب ہے اس طرح پر فطرت بتائی ہے کہ قوائے

اور تمکو زمین میں ایک مدت تک ٹھہرنا اور کمانا ہے (۳۴) پھر آدم نے اپنے پروردگار سے
چند کلمے سیکھے پھر (خدا نے) اُسکو معاف کیا، بے شک وہی بڑا معاف کرنیوالا بڑا مہربان
ہے (۳۵) ہمنے اُنکو کہا اس میں سے تم سب اُترو، جب میری طرف سے تمھارے
پاس کوئی ہدایت پہونچے پھر جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے۔

ملکوتی اطاعت پذیر و فرمانبردار ہونے کی قابلیت رکھتے ہیں، الا قوای بہیمیہ نہایت سرکش اور نافرمانبردار ہیں اُنھی
کو قابو میں لانا اور فرمانبردار کرنا انسان کا انسان ہونا ہے۔

اُنکے سرکش ہونیکو کبھی تو ان لفظوں سے بیان کیا ہے کہ ابلیس نے سجدہ نہیں کیا، کہیں یوں فرمایا ہے
کہ اُس نے اپنے خدا کے حکم کی نافرمانی کی اور سجدہ کرنے سے انکار کیا، کہیں فرمایا ہے کہ اُس کافر نے
غرور کیا، اور کہا، کہ کیا میں ایسی مخلوق کو سجدہ کروں جو سڑی مٹی سے بنی ہے، میں تو اُس سے افضل ہوں
وہ تو مٹی کا پتلا ہے اور میں آگ کا پوت ہوں۔ قوای بہیمیہ کو جنکا مبداء حرارت غریزی و حرارت خارجی ہے
آگ سے مخلوق ہونا بیان کرنا ٹھیک ٹھیک اُنکی فطرت کا بتانا ہے۔

پھر جو فطرتی تضاد ان دونوں قسم کے قوٰی میں ہے، اُسکے اظہار کے لئے قوای بہیمیہ کو بطور ایک سخت
دشمن کے قرار دیا ہے، اور اُس کی زبان حال سے اُس کی فطرت بیان کی ہے، کہ میں ہمیشہ جب تک
انسان زندہ ہے یا قیامت تک یعنی جب تک اُسکی اولاد رہے گی اُسکو بہکاتا اور راہ راست پر سے
بھٹکاتا رہونگا۔ یہہ الفاظ کہ میں انسان کو دائیں بائیں آگے پیچھے غرضکہ ہر چہار طرف سے گھیرونگا صاف
صاف اُن قوٰی بہیمیہ کی فطرت کا اظہار کرتے ہیں جو انسان میں ہے، اور ہر ذی عقل و ہوش غور کرنے
پر خود اپنے میں یہہ سب باتیں پاتا ہے اور جان سکتا ہے کہ کسطرح اُن قوای بہیمیہ نے چاروں طرف سے
اُسکو گھیر رکھا ہے۔

در میان قعر دریا تختہ بندم کردۂ ۔۔۔ باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش

پھر خدا تعالیٰ نیک آدمیوں کی فطرت کو اور اُس دشمن کے فریب میں آنیوالوں اور نہ آنیوالوں کے فطری نتیجہ کو
بتاتا ہے، اور فرماتا ہے کہ تو جتنی چاہے دشمنی کر اور جسطرح چاہے اپنے لشکر سے اُنپر چڑہائی کر مگر نیک آدمیوں پر تیرا کچھ

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۷﴾ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۳۸﴾

قابو نہوگا، وہی بہکینگے جو تیرے یعنی قوائے بہیمیہ کے تابع ہونیوالے ہیں، اور دونوں کا قدرتی نتیجہ یہہ ہے کہ پہلے بہشت میں چین کرینگے، اور پچھلے دوزخ میں بھرے جاوینگے۔

اِسکے بعد خدا تعالیٰ نے انسان کی زندگی کے دونوں حصوں کو بتایا ہے پہلے حصہ کو یعنی جبکہ انسان غیر مکلف اور تمام قیود سے مبرا ہوتا ہے بہشت میں رہنے اور چین کرنے اور میوون کے کھاتے رہنے سے تعبیر کیا ہے، اور جب دوسرا حصہ اُسکی زندگی کا شروع ہونے والا ہے، تو اُسکے قدیم دشمن کو پھیر بلایا ہے، جس نے اُسکو بہکا کر درخت ممنوعہ کو کھلایا ہے۔

یہہ وہ حصہ انسان کی زندگی کا ہے جب کہ اُسکو رشد ہوتا ہے علاوہ عقل و تمیز کے درخت کا پھل کھاکر مکلف اور اپنے تمام افعال و اقوال و حرکات کا ذمہ دار ہوتا ہے، زندگی کے ضروری سامان کے لئے خود محنت کرتا ہے اور نیک و بد کو خود سمجھتا ہے، اپنی بدی سے واقف ہوتا ہے، اور اُسکو چھپاتا ہے۔ یہہ فطرت انسانی خدا تعالیٰ نے باغ کے استعارہ میں بیان کی ہے، اسلئے تمام فطرت کو باغ ہی کے استعارہ میں بیان فرمایا ہے، سن رشد و تمیز کے پہونچنے کو درخت معرفت خیر و شر کے پھل کھانے سے اور انسان کا اپنی بدیوں کے چھپانے کو درخت کے پتوں سے ڈہانکنے سے تعبیر کیا ہے، مگر شجرۃ الخلد کے پھل تک اُسکو نہیں پہونچایا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک فانی وجود ہے اور اُسکو دائمی بقا نہیں۔

تو اُنپر نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہونگے (۳۶) اور جن لوگون نے نمانا اور میری نشانیون کو جھٹلایا وہ آگ مین پڑنے والے لوگ ہیں وہ اُسی مین ہمیشہ رہیں گے (۳۷) اے بنی اسرائیل میری نعمتون کو یاد کرو جو میں نے تمکو بخشی ہیں اور مجھ سے اقرار پورا کرو میں تم سے اقرار پورا کرونگا اور پھر مجھی سے ڈرو اور اُسی پر ایمان لاؤ جو میں نے اُسکو تصدیق کرتا ہوا نازل کیا ہے جو تمھارے پاس ہے اور اُس کے اول منکروں میں نہ ہو اور مت لو میری نشانیوں پر تھوڑی سی قیمت اور میرا ہی ڈر مانو (۳۸)

اخیر کو نہایت عمدگی سے اُسکا خاتمہ بیان کیا ہے، کہ تم سب نکل جاؤ اور جاکر زمین پر رہو وہی تمھارے ٹھہرنے کی جگہہ ہے، اُس میں تم رہو گے، اُس میں مروگے، اُس میں سے اُٹھوگے، تمھاری بدیون کا علاج بھی وہیں ہے، جو نیک بندے ہون اُنکی ہدایت پر چلنا اور اپنی بدیوں سے شرمندہ ہوکر اُن کے کرنے سے باز آنا اور خدا سے سچا اقرار کرنا کہ پھر نہ کرینگے اور پھر مت کرنا، تم اپنے دشمن پر فتح پاؤگے پھر تمکو کچھ ڈر اور خوف نہ ہوگا اچھے خاصے مقبول بندے ہوگے۔

یہہ ایک نہایت عمدہ اور دلچسپ بیان فطرتِ انسانی کا ہے مگر عام لوگ اس راز فطرت کے سمجھنے کے قابل نہ تھے، اِس لئے خدا نے ابتدا سے اِس راز کو ایک دلچسپ قصہ کے پیرایہ میں بیان کیا ہے، جسکو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے، اور جو نتیجہ راز فطرت سے انسان کو حاصل ہونا چاہیئے وہ ہر شخص کو حاصل ہوتا ہے خواہ تم یہہ سمجھو کہ خدا و فرشتون میں مباحثہ ہوا، اور شیطان نے خدا سے نافرمانی کی، اور آدم بھی گیہون کا درخت کھاکر خدا کا نافرمان بردار ہوا، خواہ میں یون سمجھون کہ اُس بڑے تماشا کرنیوالے نے جو بھانمتی کا ایک تماشا بنایا ہے اُس کے راز کو اُسی بھانمتی کی اصطلاحون میں بتلایا ہے۔

(یا بنی اسرائیل) اس مقام پر خدا تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا قصہ بیان کیا ہے اور اُنکی نافرمانیونکو دُہرایا ہے اور جو مہربانیاں اُنپر کیں اُنکو یاد دلایا ہے تاکہ اُس رحمت کو جو نبی آخر الزمان کے پیدا کرنے اور قرآن کے نازل ہونے سے دنیا پر ہے اُسکی قدر کریں

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾

اور اُسکی ہدایت پر چلیں اور جو خرابیاں اُنھوں نے اپنے سچے مذہب میں ملادی تھیں اُنکو چھوڑ دیں اور نجات پاویں
بنی اسرائیل کا قصہ قرآن میں بہت جگہہ مذکور ہے مگر اکثر لوگوں کو اس میں یہہ دہوکہ ہوتا ہے کہ وہ تمام واقعات
کا حضرت موسیٰ ہی کے وقت میں ہونا سمجھتے ہیں حالانکہ اونمیں ایسے بھی واقعات ہیں جو حضرت موسیٰ
سے پہلے اور اُسکے بعد بھی ہوئے ہیں۔

حضرت موسیٰ سے جو واقعات متعلق ہیں وہ سورہ بقر، نسار، مائدہ، انعام، اعراف، یونس، ہود،
بنی اسرائیل، کہف، مریم، طٰہٰ، مومنین، شعرا، نمل، قصص، صافات، مومن، زخرف، دخان، نازعات
بیس سورتوں میں آئے ہیں اُن میں مکرر بہی مضامین بیان ہوئے ہیں اور کسی میں کسی جگہہ کا واقعہ بیان
ہوا ہے کسی میں کسی جگہہ کا ہم اُن تمام آیات اور الفاظ کو منتخب کر کر بہ ترتیب موسیٰ کے قصہ کو معہ ترجمہ
حاشیہ پر ہم لکھہ دیتے ہیں کہ تمام قصہ جسقدر کہ قرآن مجید میں ہے ملفظہ بہ ترتیب معلوم ہو جاوے
اور پھر ہر ایک آیت کے مطلب کو اُس کے مناسب مقام پر بیان کرینگے۔

سورہ بقر میں اس مقام پر جو واقعات حضرت موسیٰ کے بیان ہوئے ہیں اُن میں سے واقعہ
عبور بحر اور غرق فرعون قابل غور کے ہے اول تو بہت لوگوں نے یہہ غلطی کی ہے جو یہہ سمجھے ہیں کہ

* نتلوا علیك من نباء موسى وفرعون بالحق لقوم یومنون ان فرعون علا فی الارض وجعل اهلها
شیعا یستضعف طائفة منهم یذبح ابناءهم ویستحیی نساءهم انه كان من المفسدین (قصص)
یسومونكم (ال فرعون) سوء العذاب (بقر) یقتلون (اعراف) یذبحون ابناءكم ویستحیون نساءكم وفی ذلكم
بلاء من ربكم عظیم (بقر) نرید ان نمن على الذین استضعفوا فی الارض ونجعلهم ائمة ونجعلهم
الوارثین ونمكن لهم فی الارض ونری فرعون وهامان وجنودهما منهم ما كانوا یحذرون (قصص)
واوحینا الى ام موسى ان ارضعیه فاذا خفت علیه (قصص) اقذفیه فی التابوت (طه) فالقیه
(قصص) فاقذفیه فی الیم فلیلقه الیم بالساحل یاخذه عدو لی وعدو له (طه) ولا تخافی ولا تحزنی انا رادوه
الیك وجاعلوه من المرسلین فالتقطه ال فرعون (قصص) فبصرت (ای اخت موسى) به عن
جنب وهم لا یشعرون (قصص)

اور مت شبہ ڈالو سچ میں جھوٹ ملا کر اور مت چھپاؤ سچ کو جبکہ تم جانتے ہو (۳۹)

حضرت موسیٰ نے دریائے نیل سے عبور کیا تھا یہ بالکل غلط ہے، بلکہ اُنھوں نے بحر احمر کی ایک شاخ سے عبور کیا تھا۔ تمام مفسرین حضرت موسیٰ کے عبور اور فرعون کے غرق ہونے کو بطور ایک ایسے معجزے کے قرار دیتے ہیں جو خلاف قانون قدرت واقع ہوا ہو جسکو انگریزی میں سپر نیچرل کہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے سمندر پر اپنی لاٹھی ماری وہ پھٹ گیا اور پانی مثل دیوار یا پہاڑ کے ادہر اودھر کھڑا ہو گیا اور پانی نے بیچ میں خشک رستہ چھوڑ دیا اور حضرت موسیٰ اور تمام بنی اسرائیل اُس رستہ سے پار اُتر گئے فرعون بھی اُسی رستہ میں دوڑ پڑا اور پھر سمندر مل گیا اور سب ڈوب گئے، اگر درحقیقت یہہ واقعہ خلاف قانون قدرت واقع ہوا تھا تو خدا تعالیٰ سمندر کے پانی ہی کو ایسا سخت کر دیتا کہ مثل زمین کے اُس پر سے چلے جاتے، خشک رستہ نکالنے ہی سے یہ بات پائی جاتی ہے کہ

ہم ٹھیک تجھکو سنا دیں ایمان والوں کے لئے موسیٰ و فرعون کی کچھ خبریں فرعون دنیا میں بہت بڑھ گیا تھا اور مصر کے رہنے والوں کو گروہ گروہ بنا دیا تھا اور اُن میں سے ایک گروہ کو زبون حالت میں پہونچا دیا تھا ذبح کر ڈالتا تھا اُن کے بیٹوں کو اور جیتا رہنے دیتا تھا اُن کی بیٹیوں کو اور وہ مفسدوں میں سے تھا فرعون والے بنی اسرائیل کو بری طرح کے عذاب پہونچاتے تھے بنی اسرائیل کے بیٹوں کو مار ڈالتے تھے ذبح کر ڈالتے تھے اور اُنکی بیٹیوں کو جیتا رہنے دیتے تھے اور اسمیں بنی اسرائیل پر اُنکے پروردگار کی طرف سے بڑی بلا تھی ہمنے اُن پر جو دنیا میں کمزور ہو گئے تھے مہربانی کرنی چاہی اور اُنکو سردار بنانا اور اُنکو وارث بنانا اور زمین پر قدرت والا ٹھیرانا اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو جس بات سے وہ ڈرتے تھے اُنکے ہاتھ سے دکھلانا چاہا،

ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں یہ بات ڈالی کہ موسیٰ کو دودھ پلا دے جب اُسکو موسیٰ کے مارے جانے کا خوف ہو تو اُسکو ایک صندوق میں رکھدے پھر اُسکو ڈال دے پھینک دے دریا میں پھر دریا اُسکو کنارہ پر ڈال دے گا اُسکو اُٹھا لیگا میرا دشمن اور اُسکا دشمن اور تو مت ڈر اور نہ غمگیں ہو ہم اُس کو پھر تیرے پاس لوٹا دینگے اور اُسکو رسولوں میں سے کرینگے (جب موسیٰ کی ماں نے اُنکو دریا میں ڈال دیا اور وہ صندوق کنارہ پر آ لگا) تو فرعون کے لوگوں میں سے کسی نے اُسکو اُٹھا لیا موسیٰ کی بہن نے دور سے اوس کو دیکھا اور فرعون والے نہیں جانتے تھے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۰﴾

یہ واقعہ یا معجزہ جو اسکو تعبیر کرو مطابق قانون قدرت کے واقع ہوا تھا۔ جو مطلب مفسرین نے بیان کیا ہے وہ مطلب قرآن مجید کے لفظوں سے کبھی نہیں نکلتا۔

قالت امرأة فرعون قرة عين لی ولك لا تقتلوه عسى ان ينفعنا او نتخذه ولدا (قصص) وحرمنا عليه المراضع من قبل فقالت هل ادلكم على اهل بيت يكفلونه لكم وهم له ناصحون فرددناه الى امه كى تقر عينها ولا تحزن (قصص)

ولما بلغ اشده واستوى (قصص) دخل المدينة على حين غفلة من اهلها فوجد فيها رجلين يقتتلان هذا من شيعته وهذا من عدوه فاستغاثه الذی من شيعته على الذی من عدوه فوكزه موسى فقضى عليه (قصص) فاصبح فی المدينة خائفا يترقب فاذا الذی استنصره بالامس يستصرخه قال له موسى انك لغوی مبين فلما ان اراد ان يبطش بالذی هو عدو لهما قال يا موسى اتريد ان تقتلنی كما قتلت نفسا بالامس (قصص) وجاء رجل من اقصى المدينة يسعى قال يموسى ان الملاء يأتمرون بك ليقتلوك فاخرج انی لك من الناصحين فخرج منها خائفا يترقب قال رب نجنی من القوم الظلمين (قصص)

قال موسى لفتاه لا ابرح حتى ابلغ مجمع البحرين او امضى حقبا فلما بلغا مجمع بينهما نسيا حوتهما فاتخذ سبيله فی البحر سربا فلما جاوزا قال لفتاه آتنا غداءنا لقد لقينا من سفرنا هذا نصبا قال ارءيت اذ اوينا الى الصخرة فانی نسيت الحوت وما انسانيه الا الشيطان ان اذكره واتخذ سبيله فی البحر عجبا قال ذلك ما كنا نبغ فارتدا على آثارهما قصصا فوجدا عبدا من عبادنا آتيناه رحمة من عندنا وعلمناه من لدنا علما قال له موسى هل اتبعك على ان تعلمن مما علمت رشدا قال انك لن تستطيع معی صبرا وكيف تصبر على ما لم تحط به خبرا قال ستجدنی ان شاء الله صابرا ولا اعصی لك امرا قال فان اتبعتنی فلا تسئلنی عن شیء حتى احدث لك منه ذكرا فانطلقا حتى اذا ركبا فی السفينة خرقها قال اخرقتها لتغرق اهلها لقد جئت شيئا امرا قال الم اقل انك لن تستطيع معی صبرا قال لا تؤاخذنی بما نسيت ولا ترهقنی

نماز پڑہو اور زکوۃ دو اور رکوع کرنے والون کی ساتھ رکوع کرو (۴۰)

سمندر میں راستہ ہو جانے کی نسبت قرآن مجید میں تین جگہہ ذکر آیا ہے اول سورہ بقر میں جہاں فرمایا ہے کہ "اذ فرقنا بکم البحر" دوم سورہ شعرا میں جہاں فرمایا کہ "اوحینا

فرعون کی عورت بولی کہ یہہ تو میری اور تیری آنکھون کی ٹھنڈک ہے اُسکو مت مارو شاید اس سے ہمکو نفع ہو اور ہم اُسکو بیٹا بنا لین ہم نے پہلے ہی پلائیون کا دودہ اُسپر حرام کر دیا تھا موسیٰ کی بہن بولی کہ کیا میں تمکو ایسی گہر والی بتادوں جو تمہارے لئے اسکو پالیں اور اُسکو اچہی طرح رکہین (اُس نے موسیٰ کی مان ہی کو بتلایا) پہر ہمنے موسیٰ کو اُسکی مان ہی کے پاس لوٹا دیا تاکہ اُسکی آنکہونکو ٹہنڈک رہے اور غمگین نہ ہو۔

جب موسیٰ چاق چوبند ہوا تو شہر والوں کی بیخبری میں شہر میں گیا وہان اُس نے دو آدمیونکو مارتے مرتے پایا ایک تو موسیٰ کی قوم کا تھا اور ایک اُس کے دشمنوں میں تھا موسیٰ کی قوم والے نے اُسکے دشمن کی فریاد کی موسیٰ نے اُسکو ایک گھونسا مارا کہ وہ مر گیا پہر شہر ہی میں ڈرتے ہوئے اور کسی خرابی کے آنے کی توقع میں صبح کی جس کی مدد موسیٰ نے کل کی تہی اُس نے موسیٰ کو پکارا موسیٰ نے اُس سے کہا کہ تو ہی علانیہ جہگڑالو ہے پہر موسیٰ نے اُس کے جو اُسکا اور موسیٰ کا بھی دشمن تھا پکڑنیکا ارادہ کیا جو چلایا تھا وہ یہہ سمجھا کہ موسیٰ مجھی کو پکڑیگا) کہا کہ اے موسیٰ کیا تو میرے مار ڈالنے کا بھی ارادہ کرتا ہے جسطرح کہ کل تو نے ایک آدمی کو مار ڈالا ہے۔ اتنے میں ایک آدمی شہر کے پرلے کنارہ سے دوڑتا آیا کہا اے موسیٰ فرعون کے درباری تیری نسبت مشورہ کرتے ہیں کہ تجھکو مار ڈالیں پس یہان سے نکل جا میں تیرا خیر خواہ ہوں پہر موسیٰ ڈرتا ہوا اور کسی آفت کی توقع کرتا ہوا وہان سے نکلا اور کہا اے پروردگار اس ظالم قوم سے مجھے بچا۔

موسیٰ نے اپنے ساتھی جوان سے (غالباً اُسی شخص سے جس نے اُنکے قتل کے مشورہ کی خبر دی تھی) کہا کہ میں ٹھہرنے کا ہی نہیں جب تک میں دو دریاؤن کے ملنے کے مقام تک نہ پہونچ جاؤں یا چلا جاؤں گا بہت دنون تک (یعنی اُس سے بھی پرے) پہر جب وہ دونوں دریاؤن کے ملنے کے مقام تک پہونچے تو اپنی مچھلی وہاں رکھکر بہول گئے پہر مچھلی نے خشک جگہہ میں سے دریا کا رستہ لیا پہر جب وہ اس سے آگے بڑہے تو موسیٰ نے اپنے ساتھی جوان سے کہا کہ ہمارا صبح کا کہانا لاؤ ہم نے تو اپنے اس سفر میں بڑی مصیبت اُٹھائی اُس جوان نے کہا کہ تم نے دیکھا ہوگا کہ جب ہم اُس پتھر سے تکیہ لگاکر بیٹھے تو میں اُس مچھلی کو بہول گیا (یعنی اُسکا خیال نرہا) اور اِس قصہ کا ذکر کرنا (یعنی موسیٰ سے) بجز شیطان کے کسی نے مجھکو نہیں بھلایا اور مچھلی نے عجب طرح سے دریا میں اپنا رستہ لیا موسیٰ نے کہا کہ یہی ہے جو ہم چاہتے تھے (یعنی دونوں دریاؤں کے ملنے تک ہم آنا چاہتے تھے اب آگے کیوں جاوین) پہر وہ دونون اپنے قدمون کا نشان دیکھتے ہوئے اُلٹے پہرے۔ پہر اُن دونون کو

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۱﴾

الی موسی ان اضرب بعصاک البحر فانفلق فکان کل فرق کالطود العظیم۔ تیسرے سورہ طٰہٰ میں جہاں فرمایا ہے کہ، فاوحینا الی موسی ان اسر بعبادی فاضرب لھم طریقا فی البحر یبسا

من امری عمرا فانطلقا حتی اذا لقیا غلاما فقتلہ قال اقتلت نفسا زکیۃ بغیر نفس لقد جئت شیئا نکرا قال الم اقل لک انک لن تستطیع معی صبرا قال ان سالتک عن شیٔ بعدھا فلا تصاحبنی قد بلغت من لدنی عذرا فانطلقا حتی اذا اتیا اھل قریۃ استطعما اھلھا فابوا ان یضیفوھما فوجدا فیھا جدارا یرید ان ینقض فاقامہ قال لو شئت لتخذت علیہ اجرا قال ھذا فراق بینی وبینک سانبئک بتاویل ما لم تستطع علیہ صبرا اما السفینۃ فکانت لمساکین یعملون فی البحر فاردت ان اعیبھا وکان وراءھم ملک یاخذ کل سفینۃ غصبا واما الغلام فکان ابواہ مومنین فخشینا ان یرھقھما طغیانا وکفرا فاردنا ان یبدلھما ربھما خیرا منہ زکوۃ واقرب رحما واما الجدار فکان لغلامین یتیمین فی المدینۃ وکان تحتہ کنز لھما وکان ابوھما صالحا فاراد ربک ان یبلغا اشدھما ویستخرجا کنزھما رحمۃ من ربک وما فعلتہ عن امری ذلک تاویل ما لم تسطع علیہ صبرا (کہف)

ولما توجہ تلقاء مدین قال عسی ربی ان یھدینی سواء السبیل ولما ورد ماء مدین وجد علیہ امۃ من الناس یسقون ووجد من دونھم امراتین تذودان قال ما خطبکما قالتا لا نسقی حتی یصدر الرعاء وابونا شیخ کبیر فسقی لھما ثم تولی الی الظل فقال رب انی لما انزلت الی من خیر فقیر فجاءتہ احدٰھما تمشی علی استحیاء قالت ان ابی یدعوک لیجزیک اجر ما سقیت لنا فلما جاءہ وقص علیہ القصص قال لا تخف نجوت من القوم الظلمین قالت احدٰھما یا ابت استاجرہ ان خیر من استاجرت القوی الامین قال انی ارید ان انکحک احدی ابنتی ھاتین علی ان تاجرنی ثمنی حجج فان اتممت عشرا فمن عندک وما ارید ان اشق علیک ستجدنی ان شاء اللہ من الصلحین قال ذلک بینی وبینک ایما الاجلین قضیت فلا عدوان علی واللہ علی ما نقول وکیل (قصص) فلبثت سنین فی اھل مدین ثم جئت علی قدر یٰموسی

کیا لوگوں کو نیکی کرنے کو کہتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو اور تم کتاب (توریت) پڑھتے ہو پھر کیا تم سمجھتے نہیں (۴۱)

لا تخاف درکا و لا تخشی فاتبعھم فرعون بجنودہ فغشیھم من الیم ما غشیھم، پہلی آیت میں تو کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے سمندر کے جدا ہو جانے یا پھٹ جانے کو خلاف قانون

میرے بندوں میں سے ایک بندہ ملا جس پر ہم نے اپنی مہربانی کی تھی اور اُس کو ہم نے دانشمندی سکھا دی تھی موسیٰ نے اُس سے کہا کہ کیا میں تمہارے ساتھ ہو لوں اگر مجھکو بھی اُن دانشمندیوں میں سے جو تمنے سیکھی ہیں سکھلا دو اُس بندے نے کہا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے اور تم کس طرح اُس بات پر صبر کرو گے جو تمھاری دانش کے احاطہ میں نہیں ہے موسیٰ نے کہا انشاء اللہ تم مجھکو صبر کرنیوالا پاؤ گے اور میں تمھارے کسی کام میں برخلافی نہ کرونگا اُس بندے نے کہا کہ اگر تم میری تابعداری کرنی چاہتے ہو تو جب تک میں خود ہی نہ کہہ دوں مجھ سے کسی بات کو مت پوچھنا پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک کشتی پر سوار ہوئے تو اُس بندے نے کشتی میں شگاف کر دیا موسیٰ نے کہا کہ کیا تمنے کشتی کے لوگوں کے ڈبونے کیلئے اس میں شگاف کیا ہے اُس بندے نے کہا کہ دیکھو تمنے بڑی بات کی اُس بندے نے کہا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے موسیٰ نے کہا کہ جو بات میں نے بھول کر کہی اُس پر مواخذہ مت کرو اور میرے کام میں سختی مت ڈالو پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک نوجوان سے ملے تو اُس بندے نے اُس نوجوان کو مار ڈالا موسیٰ نے کہا کہ کیا تمنے ایک شخص بے گناہ کو بغیر جان کے بدلے مار ڈالا دیکھو تمنے بُرا کام کیا اُس بندے نے کہا کہ میں نے تمسے نہ کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے موسیٰ نے کہا کہ اگر اسکے بعد میں تمسے کوئی بات پوچھوں تو پھر مجھکو اپنے ساتھ مت رکھنا میں اپنا عذر تمھارے سامنے پیش کرتا ہوں۔ پھر وہ دونوں چلے یہانتک کہ جب ایک گانوں کے لوگوں کے پاس پہونچے تو اُن سے کھانا مانگا اُنھوں نے اُنکو کھانا کھلانے سے انکار کیا وہاں ان دونوں نے ایک دیوار دیکھی کہ گرا چاہتی ہے اِن دونوں نے اُس کو سیدھا بنا دیا (حضرت موسیٰ کو بھوک لگی ہوئی تھی کسی نے کھانیکو دیا نہ تھا ٹکا پیسہ پاس نہ تھا) اُنھوں نے اُس بندے سے کہا کہ اگر تم چاہتے تو اسی پر مزدوری لے لیتے اُس بندے نے کہا کہ بس اب مجھ میں اور تم میں جدائی ہے میں اِن باتوں کی تاویل جنپر تم صبر نہ کر سکے بتا دیتا ہوں۔ وہ کشتی تو غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں کھیوا کھیا کرتی تھی میں نے اُسکو عیب دار کر دینا چاہا اُنکے پرے ایک بادشاہ ہے جو زبردستی سے ہر ایک کشتی کو پکڑ لیتا ہے۔ اور وہ نوجوان اُسکے ماں باپ ایمان والے ہیں مجھکو خوف ہوا کہ یہہ اُنکو سرکشی و کفر میں تنگ کریگا پس میں نے چاہا کہ اُنکا پروردگار اُسکا نعم البدل پاکیزہ گی اور محبت میں

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۲﴾

قدرت قرار دیا جاسکے۔ دوسری آیت میں جو الفاظ ہیں انھی پر تمام مفسرین کا دارومدار ہے وہ "ان اضرب بعصاك البحر" کے یہ معنی لیتے ہیں کہ خدا نے موسیٰ سے کہا کہ سمندر کو اپنی لاٹھی سے مار چنانچہ

فلما قضی موسی الاجل وسار باهله انس من جانب الطور نارا قال لاهله امكثوا انی انست نارا لعلی اتیكم منها بخبر (قصص) او اتیكم بشهاب قبس (نمل) جذوة من النار لعلكم تصطلون (قصص) او اجد علی النار هدی (طه) فلما اتاها نودی من شاطی الوادی الایمن (قصص) من جانب الطور الایمن (مریم) فی البقعة المباركة من الشجرة (قصص) ان بورك من فی النار ومن حولها وسبحان الله رب العالمین (نمل) یا موسی انه انا الله العزیز الحكیم (نمل) انی انا الله رب العالمین (قصص) انی انا ربك فاخلع نعلیك انك بالواد المقدس طوی (طه) ما تلك بیمینك یا موسی قال هی عصای اتوكأ علیها و اهش بها علی غنمی ولی فیها مارب اخری (طه) الق عصاك فلما راها تهتز كانها جان ولی مدبرا ولم یعقب یا موسی اقبل (قصص) خذها ولا تخف سنعیدها سیرتها الاولی (طه) اسلك یدك فی جیبك (قصص) واضمم یدك الی جناحك تخرج بیضاء من غیر سوء ایة اخری (طه) واضمم الیك جناحك من الرهب فذانك برهانان من ربك (قصص) فی تسع ایات (نمل) الی فرعون وملائه انهم كانوا قوما فاسقین (قصص) وقربناه نجیا (مریم)

ثم ارسلنا موسی واخاه هارون بایاتنا وسلطان مبین الی فرعون وملائه (هود) هامان وقارون (مومن) ان اخرج قومك من الظلمات الی النور (هود) ان ائت القوم الظالمین قوم فرعون (شعراء) اذهب الی فرعون انه طغی (نازعات) قال رب انی اخاف ان یكذبون (شعراء) رب انی قتلت منهم نفسا (قصص) ولهم علی ذنب فاخاف ان یقتلون (شعراء) ویضیق صدری ولا ینطلق لسانی (شعراء) رب اشرح لی صدری ویسر لی امری واحلل عقدة من لسانی یفقهوا قولی (طه) واخی هارون هو افصح منی لسانا (قصص) اجعل لی وزیرا من اهلی هارون اخی (طه) فارسل الی هارون (شعراء) فارسله معی

اور صبر کرنے سے اور نماز پڑھنے سے مدد لو اور ہاں بے شبہہ وہ بڑی مشکل ہی مگر
اُنپر (کچھ) مشکل نہیں جو خدا کے سامنے عاجزی کرتے ہیں (۴۲)

حضرت موسیٰ نے لاٹھی ماری اور سمندر پھٹ گیا یا پھٹ گیا یا سمندر کی تہ زمین کھل گئی وہ اِس جملہ کو اسطرحپر
بطور شرط و جزا کے قرار دیتے ہیں کہ شرط گویا علت ہے اور جزا اُس کا معلول یعنی لاٹھی مارنے

اُنکو دیگا- اور وہ دیوار شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اُس کے نیچے اُن کے لئے خزانہ تھا اور اُن کا باپ اچھا آدمی تھا پس میرے
پروردگار نے چاہا کہ جب وہ دونوں جوانی میں پہنچ جاویں تو وہ اپنا خزانہ نکال لیں تیرے پروردگار کی مہربانی سے اور میں نے یہہ کام
اپنی طرف سے نہیں کئے یہہ بیان اُن باتوں کا ہے جنپر تو صبر نہ کرسکا-

اور جب موسیٰ شہر مدین کی طرف چلے تو کہا کہ اُمید ہے کہ میرا پروردگار مجھکو سیدھا رستہ بتادے اور جبکہ شہر مدین
کے پانی کے پاس پہونچے تو وہاں لوگوں کے گروہ کو (مویشی کو) پانی پلاتے پایا اور اُس کے پرے دو عورتوں کو پایا کہ اپنے مویشی
کو روکے کھڑی ہیں موسیٰ نے کہا کہ تمھارا کیا حال ہے اُنھوں نے کہا کہ جب تک چرواہے پانی پلاکر نہ چلے جاویں ہم نہیں پلا
سکتیں اور ہمارا باپ بڑا بڈھا ہے پھر موسیٰ نے اُن دونوں کے (مویشی کو) پانی پلادیا پھر چھاؤں میں جا کھڑے ہوئے پھر کہا کہ اے
میرے پروردگار تو نے میری ایسی حالت کردی ہے کہ تھوڑی سی بھلائی کا بھی محتاج ہوں پھر اُن دونوں میں سے ایک شرمیلی
چلتی ہوئی موسیٰ کے پاس آئی کہا میرے باپ نے تجھکو بلایا ہے تاکہ ہماری (مویشی کو) جو پانی تو نے پلایا ہے اُسکی اُجرت دے
پھر جب موسیٰ اُسکے پاس (یعنی اُس عورت کے باپ کے پاس) آئے اور اپنا قصہ اُس سے کہا تو اُس نے کہا کہ مت ڈر و تم نے
ظالم قوم سے نجات پائی اُسکی بیٹیوں میں سے ایک نے کہا کہ اے باپ اسکو مزدوری پر رکھ لے اچھا مزدور جسکو تو مزدوری پر لگاوے
طاقتور اور دیانتدار ہوتا چاہیئے اُس شخص نے موسیٰ سے کہا کہ میں نے ارادہ کیا ہے کہ اپنی دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح
تجھ سے کردوں اس بات پر کہ تو آٹھ برس تک میرے ہاں مزدوری کرے پھر اگر تو دس برس پورے کردے تو یہہ تیری طرف سے ہوگا میں
تجھ پر مشقت ڈالنا نہیں چاہتا تو مجھکو انشاء اللہ اقرار پورا کرنیوالوں میں پاویگا موسیٰ نے کہا کہ مجھ میں اور تجھ میں یہ اقرار ہو چکا اُن دونوں
مدتوں میں سے جونسی میں پوری کردوں تو کچھ مجھ پر زیادتی نہو اور جو میں کہتا ہوں خدا اُس پر مددگار ہے- پھر موسیٰ اہل مدین میں چند
سال رہا پھر تو اُسے موسیٰ وقت پر آگیا-

پھر جب موسیٰ نے میعاد مقررہ پوری کی اور اپنی بی بی کو لیکر چلا تو اُسکو پہاڑ کی جانب سے آگ معلوم ہوئی موسیٰ
نے اپنی بی بی سے کہا کہ ٹھیرو مجھے آگ معلوم ہوئی ہے شاید میں وہاں سے کچھ خبر لے آؤں

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۳﴾

کے سبب سے سمندر پھٹ گیا اور زمین نکل آئی، مگر یہ استدلال صحیح نہیں ہے، "انفلق" ماضی کا صیغہ ہے اور عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب ماضی جزا میں

ردا (قصص) قال سنشد عضدك باخيك ونجعل لكما سلطانا (قصص) قال قد اوتيت سؤلك يا موسى (طه) اذهب انت واخوك باياتى ولا تنيا فى ذكرى اذهبا الى فرعون انه طغى (طه) قال كلا فاذهبا باياتنا انا معكم مستمعون فاتيا فرعون فقولا انا رسول رب العالمين ان ارسل معنا بنى اسرائيل (شعراء) فقولا له قولا لينا لعله يتذكر او يخشى قالا ربنا اننا نخاف ان يفرط علينا او ان يطغى قال لا تخافا اننى معكما اسمع وارى فاتياه (طه) فقل هل لك الى ان تزكى واهديك الى ربك فتخشى (نازعات) فقولا انا رسولا ربك فارسل معنا بنى اسرائيل ولا تعذبهم قد جئناك باية من ربك (طه)

قال فمن ربكما يا موسى قال ربنا الذى اعطى كل شيئ خلقه ثم هدى قال فما بال القرون الاولى قال علمها عند ربى (طه) قال وما رب العلمين قال رب السموت والارض وما بينهما ان كنتم موقنين قال لمن حوله الا تستمعون قال ربكم ورب ابائكم الاولين قال ان رسولكم الذى ارسل اليكم لمجنون قال رب المشرق والمغرب وما بينهما ان كنتم تعقلون قال لئن اتخذت الها غيرى لاجعلنك من المسجونين (شعراء) قال الم نربك فينا وليدا ولبثت فينا من عمرك سنين وفعلت فعلتك التى فعلت وانت من الكافرين قال فعلتها اذا وانا من الضالين ففررت منكم لما خفتكم فوهب لى ربى حكما وجعلنى من المرسلين وتلك نعمة تمنها على ان عبدت بنى اسرائيل (شعراء) فقال له فرعون انى لاظنك يا موسى مسحورا (بنى اسرائيل) قال اولو جئتك بشيئ مبين (شعراء) قال ان كنت جئت باية فأت بها (اعراف) ان كنت من الصادقين فالقى عصاه فاذا هى ثعبان مبين ونزع يده فاذا هى بيضاء للناظرين (شعراء) قال موسى يا فرعون انى رسول من رب العالمين حقيق على ان لا اقول على الله الا الحق قد جئتكم ببينة من ربكم فارسل معى بنى اسرائيل (اعراف) فاستكبر هو وجنوده فى الارض بغير الحق وظنوا انهم الينا لا يرجعون (قصص)

وہ وہ لوگ ہیں جو جانتے ہیں کہ ضرور اپنے پروردگار سے ملیں گے اور ضرور وہ اُسکے پاس پھر جاوینگے (۴۲)

واقع ہوتی ہے تو اُس کی دو حالتیں ہوتی ہیں اگر ماضی اپنے معنوں پر نہیں رہتی بلکہ شرط

یا ایک بھڑکتی لکڑی اُٹھا لاؤں یا آگ کا انگارہ لے آؤں تاکہ تم تاپو یا آگ کے پاس کوئی راہ بتانیوالا پاؤں - پھر جب موسیٰ آگ کے پاس آیا تو جنگل کے دائیں کنارہ سے پہاڑ کی دائیں طرف سے اُس مبارک جگہ میں درخت میں سے کسی نے اُسکو آواز دی کہ جو آگ میں ہے اور جو اُس کے گرد ہے اُسکو برکت دی گئی ہے اور اللہ پاک ہے اور تمام عالموں کا پالنے والا ہے ای موسیٰ بیشک میں خدا ہوں سب پر غالب اور بڑی حکمت والا بے شک میں ہی خدا ہوں تمام عالموں کا پالنے والا بے شک میں تیرا خدا ہوں پھر جوتیاں اُتار ڈال بے شبہہ تو پاک جنگل میں پھرتا ہے اے موسیٰ یہہ کیا تیرے دائیں ہاتھ میں ہے موسیٰ نے کہا کہ یہہ میری لاٹھی ہے اُسکو میں ٹیک لیتا ہوں اور اُس سے اپنے ریوڑ پر پتے جھاڑ لیتا ہوں اور وہ میرے اور کام میں بھی آتے ہی خدا نے کہا کہ اپنی لاٹھی ڈالدے (جب ڈالدی) تو لاٹھی کو ہلتے ہوئے دیکھا گویا کہ وہ سانپ ہے تو موسیٰ پیٹھ پھیر کر پلٹا اور پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا خدا نے کہا اے موسیٰ آگے بڑھ اُسکو پکڑ لے اور مت ڈر وہ جیسی پہلی تھی ویسی ہی ہو جاویگی ڈال اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں اور اپنے ہاتھ کو اپنے بازو سے ملادے تیرا ہاتھ بے عیب سفید نکلیگا بطور ایک دوسری نشانی کے جو ڈر تجھکو ہوا ہے اُس سے اپنے کو دونو بازو ملا کر تھام پھر یہہ دونوں نشانیاں ہیں تیری پروردگار کی نو نشانیوں میں کی فرعون اور اُس کے درباریوں کے لئے بیشک وہ بدکار قوم ہے اور ہمنے موسیٰ کو باتیں کرنیسے مقرب کیا

پھر ہمنے موسیٰ اور اُسکے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور علانیہ غلبہ کے ساتھ فرعون اور اُسکے درباریوں ہامان اور قارون کے پاس بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیرے میں سے روشنی میں نکال لادے - جاؤ ظالم قوم کے پاس جو فرعون کی قوم ہے جاؤ فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہے موسیٰ نے کہا کہ اے پروردگار میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلاوینگے اے پروردگار میں نے اُن میں کا ایک آدمی مار ڈالا ہے میں نے انکا قصور کیا ہے پھر میں ڈرتا ہوں کہ وہ مار ڈالیں گے میرے سینہ میں دم گھٹ جاتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی اے پروردگار میرے سینہ کو کھول دے اور میرا کام مجھ پر آسان کردے اور میری زبان کی گرہ کو کھولدے تاکہ وہ میری بات سمجھیں اور میرے بھائی ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے میرے کنبہ میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر کر پھر ہارون کو میرے پاس بھیج پھر اُسکو میرے ساتھ بطور مددگار کے بھیج خدا نے کہا کہ میں تیرے بازو کو تیرے بھائی سے مضبوط کر دونگا اور تم دونوں کو غلبہ دونگا خدا نے کہا ای موسیٰ جو تو نے مانگا تجھکو دیا گیا جاؤ تو اور تیرا بھائی میری نشانیوں سمیت اور سستی نہ کرو میری نصیحت میں تم دونوں فرعون پاس جاؤ کہ

يٰبَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۴۴)

کی معلول ہوتی ہے تو اُسوقت اُس پر "ف" نہیں لاتے اور جبکہ وہ اپنے معنوں پر باقی رہتی ہے اور جزا کی معلول

فاستکبروا وکانوا قوما عالین (مومن) مجرمین (یونس) قالوا انؤمن لبشرین مثلنا وقومهما لنا عابدون (مومن) فظلموا (اعراف) فکذبوهما (مومن) فقالوا ساحر کذاب (مومن) قال الملاء حوله ان هذا لساحر علیم یرید ان یخرجکم من ارضکم بسحره فماذا تامرون قالوا ارجه واخاه وابعث (شعراء) وارسل فی المدائن حاشرین یاتوک بکل ساحر علیم (اعراف) قال اجئتنا لتخرجنا من ارضنا بسحرک یاموسی فلناتینک بسحر مثله فاجعل بیننا وبینک موعدا لا نخلفه نحن ولا انت مکانا سوی قال موعدکم یوم الزینة وان یحشر الناس ضحی فتولی فرعون فجمع کیده ثم اتی (طه) قال فرعون ائتونی بکل ساحر علیم (یونس) فجمع السحرة لمیقات یوم معلوم وقیل للناس هل انتم مجتمعون لعلنا نتبع السحرة ان کانوا هم الغالبین (شعراء) فلما جاء السحرة فرعون قالوا ائن لنا لاجرا ان کنا نحن الغالبین قال نعم وانکم اذا لمن المقربین (شعراء) فتنازعوا امرهم بینهم واسروا النجوی قالوا ان هذان لساحران یریدان ان یخرجاکم من ارضکم بسحرهما ویذهبا بطریقتکم المثلی فاجمعوا کیدکم ثم ائتوا صفا وقد افلح الیوم من استعلی (طه) قالوا یاموسی اما ان تلقی واما ان نکون اول من القی (طه) اما ان نکون نحن الملقین قال القوا فلما القوا سحروا اعین الناس واسترهبوهم وجاءو بسحر عظیم (اعراف) فالقوا حبالهم وعصیهم وقالوا بعزة فرعون انا لنحن الغالبون (شعراء) فاذا حبالهم وعصیهم یخیل الیه من سحرهم انها تسعی (طه) فلما القوا قال موسی ما جئتم به السحر ان الله سیبطله (یونس) فاوجس فی نفسه خیفة موسی قلنا لا تخف انک انت الاعلی (طه) و اوحینا الی موسی ان الق عصاک فاذا هی تلقف ما یافکون (اعراف) فالقی عصاه فاذا هی تلقف ما یافکون (شعراء) ما صنعوا انما صنعوا کید ساحر ولا یفلح الساحر حیث اتی (طه)

اے بنی اسرائیل یاد کرو میری نعمتوں کو جو میں نے تمکو دی ہیں اور میں نے تمکو تمام عالموں پر بزرگی دی ہے (۴۴)

اگر تعظیم کرے گا تو میری تو میں تیری تعظیم کل کر چکا ہوں" اس مثال میں جزا (یعنی گذشتہ کل میں تعظیم کا کرنا) شرط کی معلول نہیں ہے کیونکہ وہ اُس سے پہلے ہو چکی تھی۔

...سرکشی ہی خدا نے کہا وہ ہرگز تمکو نہ مار سکیں گے پھر تم دونوں میری نشانیوں سمیت جاؤ میں تمہارے ساتھ ہوں تمھاری بات سنونگا پھر فرعون کے پاس جاؤ اور پھر اُس سے کہو کہ ہم دونوں تمام عالموں کے پروردگار کے رسول ہیں ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیجدے اور اُس سے نرم بات کہو شاید کہ نصیحت مانے اور خوف کرے اُنھوں نے کہا کہ اے ہمارے پروردگار بیشک ہم ڈرتے ہیں کہ ہم پر زیادتی کرے یا ہمسے سرکشی کرے خدا نے کہا کہ تم مت ڈرو میں تمھارے ساتھ ہوں تمھاری بات سنونگا اور تمکو دیکھتا رہونگا پھر اُس کے پاس جاؤ موسیٰ گئے اور کہا کہ تجھکو پاک ہونیکی کچھ خواہش ہے اور میں تجھکو تیرے پروردگار کی راہ بتاؤں تاکہ تو خوف کرے، خدا نے کہا کہ تم دونوں فرعون سے کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے رسول ہیں پھر ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیجدے اور اُن کو عذاب مت دے ہم تیرے پروردگار کی نشانی لائے ہیں۔

فرعون بولا اے موسیٰ تمھارا پروردگار کون ہے موسیٰ نے کہا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے تمام چیزوں کی خلقت انکو عطا کی ہے پھر سیدھی راہ بتائی ہے فرعون نے کہا کہ پھر اگلے زمانے کے لوگوں کا کیا حال ہے موسیٰ نے کہا کہ اُسکی خبر خدا کو ہے فرعون نے کہا کہ تمام عالموں کا خدا کون ہے موسیٰ نے کہا کہ جو آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ اُن میں ہے اُس سب کا پروردگار ہے اگر تم یقین لاؤ فرعون نے اُن لوگوں سے جو اُسکے ارد گرد تھے کہا کہ کیا تم نہیں سنتے ہو موسیٰ نے کہا کہ تمھارا پروردگار اور تمھارے سب کے باپ دادا کا۔ فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا کہ تمھارا [illegible] البتہ دیوانہ ہے موسیٰ نے (کہا کہ تمام عالموں کا خدا وہی ہے) جو مشرق و مغرب کا اور جو اُس میں ہے اُس سب کا پروردگار ہے اگر تم سمجھتے ہو فرعون نے کہا کہ اگر تو نے میرے سوا اور کسی کو خدا ٹھہرایا تو میں ضرور تجھکو [illegible] تجھکو نہیں پالا جبکہ تو ہم میں بچہ تھا اور کیا تو نے بسر نہیں کئے ہم میں اپنی عمر کے چند سال [illegible] جو کیا اور تو ناشکروں میں سے ہے موسیٰ نے کہا کہ میں نے کیا تھا جبکہ میں گمراہوں میں تھا پھر میں تم سے ڈرا اور تم میں سے بھاگ گیا پھر خدا نے مجھکو حکم دیا اور مجھکو پیغمبروں میں کیا اور یہ بھلائی جس کا احسان تو مجھ پر رکھتا ہے اس بنا پر ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے فرعون نے موسیٰ سے کہا کہ میں تجھکو سحر زدہ سمجھتا ہوں موسیٰ نے کہا کہ جب بھی اگر میں کوئی بڑی نشانی

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿۴۵﴾

اسی طرح اس آیت میں سمندر کا پھٹ جانا یا زمین کا کھل جانا ضرب کا معلول نہیں ہو سکتا۔

اصل یہ ہے کہ یہودی اس بات کے قائل تھے کہ حضرت موسیٰ کے لاٹھی مارنے سے سمندر

فوقع الحق وبطل ما کانوا یعملون فغلبوا ھنالک وانقلبوا صاغرین والقی السحرۃ سٰجدین (اعراف) سجدا (طٰہٰ) قالوا آمنا برب العٰلمین رب موسیٰ وھارون قال فرعون اٰمنتم بہ قبل ان اٰذن لکم ان ھذا لمکر مکرتموہ فی المدینۃ لتخرجوا منھا اھلھا فسوف تعلمون (اعراف) انہ لکبیرکم الذی علمکم السحر فلاقطعن ایدیکم وارجلکم من خلاف ولاصلبنکم فی جذوع النخل و لتعلمن اینا اشد عذابا وابقیٰ قالوا لن نؤثرک علیٰ ما جاءنا من البینات والذی فطرنا فاقض ما انت قاض (طٰہٰ) وما تنقم منا الا ان اٰمنا بایات ربنا لما جاءتنا ربنا افرغ علینا صبرا وتوفنا مسلمین۔ (اعراف)

ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین ونقص من الثمرات لعلھم یذکرون فاذا جاءتھم الحسنۃ قالوا لنا ھذہ وان تصبھم سیئۃ یطیروا بموسیٰ ومن معہ الا انما طائرھم عند اللہ ولکن اکثرھم لا یعلمون وقالوا مھما تاتنا بہ من ایۃ لتسحرنا بھا فما نحن لک بمؤمنین فارسلنا علیھم الطوفان والجراد والقمل والضفادع والدم ایات مفصلات فاستکبروا وکانوا قوما مجرمین (اعراف) فلما جاءتھم ایاتنا مبصرۃ قالوا ھذا سحر مبین وجحدوا بھا (نمل) ولقد اریناہ ایاتنا کلھا فکذب وابیٰ (طٰہٰ) فلما جاءھم موسیٰ بایاتنا قالوا ما ھذا الا سحر مفتری وما سمعنا بھذا فی اباءنا الاولین قال موسیٰ ربی اعلم بمن جاء بالھدیٰ من عندہ ومن تکون لہ عاقبۃ الدار (قصص) قالوا اجئتنا لتلفتنا عما وجدنا علیہ آباءنا وتکون لکما الکبریاء فی الارض وما نحن لکما بمؤمنین (یونس) قال فرعون یاایھا الملاء ما علمت لکم من الٰہ غیری

اور ڈرو اُس دن سے جبکہ کوئی کچھ بھی کسی کے کام نہ آویگا اور اُسکے لئے کوئی سفارش قبول نہ ہوگی اور نہ کچھ اُسکے بدلے میں لیا جاویگا اور نہ اُس کی مدد کی جائے گی (۴۵)

پھٹ گیا تھا اور زمین نکل آئی تھی اور لاٹھی مارنے سے پتھر میں سے پانی بہہ نکلا تھا۔ علماء اسلام تفسیروں میں اور خصوصًا بنی اسرائیل کے قصوں میں یہودیوں کی پیروی کرنے کی عادی

لاؤں فرعون نے کہا کہ اگر تو کوئی نشانی لاسکتا ہے تو اُس نشانی کو لا اگر تو سچا ہے پھر موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈالدی پھر یکایک وہ ہو بہو سانپ تھی اور اپنا ہاتھ نکالا پھر یکایک دیکھنے والوں کو سپید معلوم ہوتا تھا موسیٰ نے کہا اے فرعون میں پروردگار عالموں کا رسول ہوں مجھکو لایق ہے کہ میں خدا پر سوائے سچ کے اور کچھ نہ کہوں میں لایا ہوں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی نشانی پھر میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیجدے پھر فرعون اور اُسکے لشکروں نے بغیر کسی حق کے دنیا میں تکبر کیا اور گمان کیا کہ وہ ہمارے پاس نہ پھرینگے پھر اُنھوں نے تکبر کیا اور وہ ایک قوم تھی جو بڑی گنہگار تھی بولی کہ کیا ہم ایسے دو شخصوں پر ایمان لاویں جو ہمارے سے ہیں اور اُن کی قوم ہماری غلام ہے پھر اُنھوں نے ظلم کیا اور اُن دونوں کو جھٹلایا اور کہا کہ جھوٹے جادوگر ہیں فرعون نے اپنے اردگرد کے درباریوں سے کہا کہ یہہ جادوگر بڑا جاننے والا ہے چاہتا ہے کہ تمکو تمھاری ملک سے اپنے جادو سے نکال دے پھر تم کیا کہتے ہو وہ بولے کہ اُسکو اور اُسکے بھائی کو مہلت دے اور شہروں میں (جادوگرونکے) اکٹھا کرنیوالوں کو بھیج تیرے پاس لے آویں ہر ایک بڑے علم والے جادوگر کو فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ کیا تو ہماری پاس ہمکو ہمارے ملک سے اپنے جادو سے نکالنے کو آیا ہے پھر بے شبہہ ہم بھی تیرے پاس ویسا ہی جادو لاوینگے پس کسی چوٹ میدان میں ہم ہیں اور اپنے بیں (مقابلہ کے لئے) کوئی وقت مقرر کر نہ ہم اُس کے برخلاف کریں اور نہ تو موسیٰ نے کہا کہ جشن کا دن تمھارے وعدے کا ہے اور تھوڑے دن چڑھے سب آدمی وہاں اکٹھے ہو جاویں پھر فرعون (اپنے محل میں) گیا اور اپنے جادوگرونکو جمع کیا فرعون سے لوگوں نے کہا کہ ہر ایک بڑے جادوگر کو بلاؤ پھر تمام جادوگر وقت معین پر جمع ہوگئے اور لوگوں سے کہا کہ کیا تم بھی اکٹھے ہوگے تاکہ اگر جادوگر غالب آجاویں تو ہم اُنکا ساتھ دیں جب فرعون کے جادوگر فرعون کے پاس آئے تو اُنھوں نے کہا کہ اگر ہم غالب ہوں تو ہمارے لئے کچھ انعام ہے فرعون نے کہا کہ ہاں تب تو تم مقربوں میں سے ہوگی پھر اُنکے باہم اُنکے کام میں کچھ جھگڑا ہوا اور اُنھوں نے اپنے مشورہ کو چھپایا۔ اُنھوں نے کہا کہ بے شبہہ یہہ دونوں جادوگر ہیں اپنے جادو کی زور سے تم کو تمھارے ملک سے نکالنا اور تمہارے عمدہ مذہب کو کھو دینا چاہتے ہیں پس اپنے جادوگروں کو جمع کر کے کہا کہ پھر اکٹھے ہو کر چلو اور آج کے دن جو غالب ہوگا وہی کامیاب ہوگا (چنانچہ یوم موعود کو سب جمع ہوئے) فرعون کے

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ (۴۶)

... ہیں کے مطالب کو خواہ مخواہ کھینچ تان کر یہودیوں کی روایتوں کے موافق کرتے تھے اسلئے ... جگہ بھی اور وہاں بھی جہاں قرآن میں آیا ہے" فاضرب بعصاك الحجر

... من على الطين فاجعل لى (قصص) ابن لى (مومن) صرحا لعلى اطلع الى الهٰ موسىٰ ... ابلغ الاسباب اسباب السموات (مومن) وانى لاظنه من الكاذبين (قصص) وجاءهم (اى قوم فرعون) ... رسول كريم ان ادوا الى عباد الله انى لكم رسول امين وان لا تعلوا على الله انى اتيكم بسلطان ... ربكم ان ترجمون وان لم تؤمنوا لى فاعتزلون (دخان) فلما جاءهم الحق ... قالوا اقتلوا ابناء الذين امنوا معه واستحيوا نساءهم وما كيد الكافرين الا فى ... وقال فرعون ذرونى اقتل موسىٰ وليدع ربه انى اخاف ان يبدل دينكم او ان يظهر فى الارض الفساد (مومن) وقال رجل مومن من ال فرعون يكتم ايمانه اتقتلون رجلا ان يقول ربى الله وقد جاءكم بالبينات من ربكم وان يك كاذبا فعليه كذبه وان يك صادقا يصبكم بعض الذى يعدكم ان الله لا يهدى من هو مسرف كذاب يا قوم لكم الملك اليوم ظاهرين فى الارض فمن ينصرنا من باس الله ان جاءنا قال فرعون ما اريكم الا ما ارى وما اهديكم الا سبيل الرشاد (مومن) وقال الذى امن يا قوم انى اخاف عليكم مثل يوم الاحزاب مثل داب قوم نوح وعاد وثمود والذين من بعدهم وما الله يريد ظلما للعباد ويا قوم انى اخاف عليكم يوم التناد يوم تولون مدبرين ما لكم من الله من عاصم ومن يضلل الله فما له من هاد (مومن) ولقد جاءكم يوسف من قبل بالبينات فما زلتم فى شك مما جاءكم به حتى اذا هلك قلتم لن يبعث الله من بعده رسولا (مومن)

اور اُس وقت کی نعمت کو یاد کرو جب کہ ہمنے تم کو فرعون والوں سے بچایا، بُری
عذاب تمکو دیتے تھے تمھارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور تمھاری عورتوں کو زندہ
رہنے دیتے تھے، اور اس میں تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے لئے بلای عظیم تھی (۴۶)

فانفجرت منه اثنتا عشرة عينا، ضرب کے معنی زدن کے لئے اور اُس سید نے سادی
معجزہ کو ایک معجزہ خارج از قانون قدرت بنا دیا۔

جادوگروں نے موسیٰ سے کہا کہ یا تو تو پہلے ڈال یا ہم پہلے ڈالتے ہیں موسیٰ نے کہا تم ہی ڈالو پھر جب اُنھوں نے
ڈالا تو لوگوں کی آنکھوں پر دہشت بندی کر دی اور اُنکو ڈرا دیا اور بہت بڑا جادوگر لائے جب اُنہوں نے اپنی رسیاں
اور لاٹھیاں ڈالیں اور کہا کہ فرعون کی عزت کی قسم ہم ہی غالب ہیں تب تو موسیٰ کے خیال میں اُنکی رسیاں اور لاٹھیاں
اُنکے جادو سے چلتی ہوئی دکھنے لگیں۔ موسیٰ نے کہا کہ یہہ جو تمنے کیا یہہ جادو ہے اُسکو خدا باطل کریگا مگر موسیٰ دل میں
ڈر گیا خدا نے کہا کہ مت ڈر تو ہی جیتیگا اور خدا نے موسیٰ کے دل میں ڈالا کہ اپنی لاٹھی ڈال کہ وہ اس سب بناوٹ
کو نگل جاویگی پھر موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈالی پھر اُس سب بناوٹ کو جو اُنھوں نے کی تھی نگلتی تھی اُنھوں نے تو جادو
گروں کا سا مکر کیا تھا اور حق کے سامنے جادوگر کامیاب نہیں ہو سکتا پس حق ثابت ہو گیا اور جو اُنہوں نے
کیا تھا وہ باطل ہو گیا پھر وہاں ہار کر ذلت سے لوٹ گئے اور فرعون کے جادوگروں نے سجدہ کیا بولے ہم پروردگار
عالموں پر ایمان لائے جو موسیٰ و ہارون کا پروردگار ہے۔ فرعون نے کہا کہ تم میری اجازت سے پہلے موسیٰ پر ایمان
لے آئے بے شبہہ یہہ مکر ہے جو تمنے اس شہر میں شہر والوں کے نکالنے کو کیا پھر جلد تم اس کا انجام جانوگے، موسیٰ
ہی تمہارا گرو ہے جس نے تمکو جادو سکھایا ہے ضرور میں تمھارے ہاتھ ایک طرف کے اور تمھارے پاؤں دوسری طرف
کے کاٹونگا اور تمکو کھجوروں کے درختوں کے تنوں کی سولی پر چڑھا دونگا اور بلاشبہہ تم جانوگے کہ کون سب سے
زیادہ عذاب دینے میں سخت ہے اور کس کا عذاب زیادہ پائدار ہے وہ بولے کہ جو چیزیں علانیہ ہمارے سامنے ہوئی
ہیں اُن پر اور اُس پر جس نے ہمکو پیدا کیا ہے تجھکو ہم ترجیح نہیں دے سکتے پھر جو تو حکم دینا چاہتا ہے حکم دے، تو ہم پر بجز اس کے
کہ ہم اپنے پروردگار کی نشانیوں پر ایمان لائے ہیں اور کوئی گناہ نہیں ٹھیراتا، اے ہمارے پروردگار جب (یہہ مصیبتیں)
ہم پر آویں تو ہمارے (دل میں) صبر ڈال دے اور ہمکو مسلمان مار۔ *

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (۴۷)

اس مقام پر ضرب کے معنی "زدن" کے نہیں ہیں بلکہ چلنے کے باعجلت چلنے کے ہیں جیسے کہ عرب بولتے ہیں "ضرب فی الارض" چلایا دوڑا زمین پر خود قرآن میں آیات و اذا ضربتم

وقال فرعون یا ھامان ابن لی صرحا لعلی ابلغ الاسباب اسباب السموٰت فاطلع الی الٰہ موسی وانی لاظنہ کاذبا وکذٰلک زین لفرعون سوء عملہ وصد عن سبیل وما کید فرعون الا فی تباب (مومن)

ان قارون کان من قوم موسی فبغی علیھم واتیناہ من الکنوز ما ان مفاتحہ لتنوء بالعصبۃ اولی القوۃ اذ قال لہ قومہ لا تفرح ان اللہ لا یحب الفرحین وابتغ فیما اتاک اللہ الدار الاخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللہ الیک ولا تبغ الفساد فی الارض ان اللہ لا یحب المفسدین قال انما اوتیتہ علی علم عندی اولم یعلم ان اللہ قد اھلک من قبلہ من القرون من ھو اشد منہ قوۃ واکثر جمعا ولا یسئل عن ذنوبھم المجرمون فخرج علی قومہ فی زینتہ قال الذین یریدون الحیوۃ الدنیا یا لیت لنا مثل ما اوتی قارون انہ لذو حظ عظیم وقال الذین اوتوا العلم ویلکم ثواب اللہ خیر لمن امن وعمل صالحا ولا یلقاھا الا الصابرون۔ فخسفنا بہ وبدارہ الارض فما کان لہ من فئۃ ینصرونہ من دون اللہ وما کان من المنتصرین واصبح الذین تمنوا مکانہ بالامس یقولون ویکان اللہ یبسط الرزق لمن یشاء من عبادہ ویقدر لہ لولا ان من اللہ علینا لخسف بنا ویکانہ لا یفلح الکافرون (قصص)

ونادی فرعون فی قومہ قال یا قوم الیس لی ملک مصر وھذہ الانھر تجری من تحتی افلا تبصرون ام انا خیر من ھذا الذی ھو مھین ولا یکاد یبین فلولا القی علیہ اسورۃ من ذھب او جاء معہ الملائکۃ مقترنین (زخرف) ولما وقع علیھم الرجز قالوا یا موسی ادع لنا ربک بما عھد عندک لئن کشفت عنا الرجز لنؤمنن لک ولنرسلن معک بنی اسرائیل فلما کشفنا عنھم الرجز الی اجل ھم بالغوہ اذا ھم ینکثون (اعراف) واخذناھم بالعذاب لعلھم یرجعون وقالوا یا ایھا الساحر ادع لنا ربک بما

اور اُسوقت کی نعمت کو یاد کرو جبکہ ہمنے تمھارے سبب سے سمندر کو جدا کر دیا یعنی ہٹا دیا پھر ہمنے تمکو بچا دیا اور ہمنے فرعون والوں کو ڈبو دیا (اور یہہ سب کچھ تم دیکھتے تھے (۴۷)

فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ (نساء) یعنی جب تم چلو زمین پہ یعنی سفر کرو تو کچھ حرج نہیں ہے کہ نمازیں کمی کرو، پس صاف معنی یہہ ہیں کہ خدا نے حضرت موسیٰ کو

اور بلاشبہہ ہم نے فرعون والوں کو قحطوں میں اور پھلوں کی کم پیداوار میں گرفتار کیا شاید کہ وہ نصیحت پکڑیں پہر جب انکو فراخی ہوتی تھی تو کہتے تھے کہ یہ تو ہمارے لئے ہے۔ اور جب اُنپہ سختی پڑتی تھی تو موسیٰ کی اور اُسکے ساتھ کے لوگوں کی نحوست بتلاتے تھے سمجھو کہ اِسکے سوا کوئی بات نہیں کہ جو نحوست اُنکے لئے تھی وہ خدا کے پاس سے تھی مگر اُن میں کے بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ فرعون والوں نے موسیٰ سے کہا کہ جو نشانیاں تم لاؤ گے تاکہ ہم پر اُن سے جادو کرو تو بھی ہم تجھ پر ایمان نہیں لانے کے، پھر ہمنے اُن پر طوفان اور ٹڈی دل اور جوئیں اور مینڈک اور خون کا (مینہہ) نازل کیا جدا جدا نشانیاں پھر اُنھوں نے تکبر کیا، اور وہ گنہگار قوم تھی۔ جب اُنکے پاس دکھائی دیتی ہوئی ہماری نشانیاں آئیں تو بولے کہ یہہ تو کھلا ہوا جادو ہے اور اُن نشانیوں کا انکار کیا، اور البتہ ہمنے فرعون کو اپنی تمام نشانیاں دکھلائیں پر اُس نے جھٹلایا اور انکار کیا، اور جب موسیٰ اُنکے پاس ہماری نشانیاں لیکر آیا تو بولے کہ یہہ تو بجز بنائے ہوئے جادو کے اور کچھہ نہیں ہے اور ہمنے اپنے اگلے بڑوں سے ایسی بات نہیں سنی، موسیٰ نے کہا کہ میرا پروردگار جانتا ہے کہ کون اُس کے پاس سے ہدایت لیکر آیا ہے اور کس کے لئے پیچھے کو اُس گھر (یعنی عاقبت) کی بھلائی ہوگی فرعون والے بولے کہ کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہمکو اُس بات سے جس پر ہمنے اپنے باپ دادا کو پایا ہے ہٹا دے اور تم دونوں کو دنیا میں بڑائی ہو اور ہم تم دونوں کو نہیں مانتے ہیں، فرعون نے کہا کہ اے درباریوں میں تمھارے لئے سوا اپنے کوئی خدا نہیں جانتا پھر اے ہامان میرے لئے مٹی کی اینٹیں آگ میں پکا اور میرے لئے اونچی محل بنا تاکہ میں موسیٰ کے خدا کے پاس چڑھ جاؤں اور میں تو اُسکو جھوٹوں میں سمجھتا ہوں۔

اور آیا فرعون کی قوم کے پاس ایک بزرگ پیغمبر (یعنی موسیٰ) یہہ کہتا ہوا کہ میرے حوالے کرو خدا کے بندوں کو بیشک میں تمھارے لئے خدا کا بھیجا ہوا امانتدار پیغمبر ہوں اور تم خدا پر سرکشی مت کرو میں ضرور تمھارے سامنے کھلی دلیلیں لاتا ہوں بیشبہہ میں نے اپنے پروردگار اور تمھارے پروردگار کی اس بات سے کہ تم مجھکو سنگسار کرو پناہ مانگی ہے اور اگر تم مجھکو نہیں مانتے تو مجھسے جدا ہو جاؤ، پھر جب موسیٰ اُنکے پاس ہمارے پاس سے حق بات لیکر آیا تو بولے کہ اُن لوگوں کے بیٹوں کو مار ڈالو

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۴۸﴾

کو ٹھا کہ، اپنی لاٹھی کے سہارے سے سمندر میں چل وہ پھٹا ہوا یا کھلا ہوا ہے یعنی پایاب ہو رہا ہے، سورہ طٰہ میں جو آیت ہے اُس میں صاف بیان ہوا ہے کہ میرے بندوں کو

عہد عندک اننا لمہتدون (زخرف) قال موسی ربنا انک اتیت فرعون وملاہ زینۃ واموالا فی الحیوۃ الدنیا ربنا لیضلوا عن سبیلک ربنا اطمس علی اموالھم و اشدد علی قلوبھم فلا یومنوا حتی یروا العذاب الالیم قال قد اجیبت دعوتکما فاستقیما ولا تتبعان سبیل الذین لا یعلمون (یونس) قال موسی لقومہ استعینوا باللہ واصبروا ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین قالوا اوذینا من قبل ان تاتینا ومن بعد ما جئتنا قال عسی ربکم ان یھلک عدوکم ویستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعملون (اعراف)

ولقد اوحینا الی موسی ان اسر بعبادی فاضرب لھم طریقا فی البحر یبسا لا تخاف درکا و لا تخشی (طٰہ) فاسر بعبادی لیلا انکم متبعون واترک البحر رھوا انھم جند مغرقون (دخان) ان اضرب بعصاک البحر فانفلق فکان کل فرق کالطود العظیم (شعرا) واذ فرقنا بکم البحر فانجینٰکم واغرقنا ال فرعون وانتم تنظرون (بقر) فاتبعوھم مشرقین فلما تراءی الجمعان قال اصحاب موسی انا لمدرکون قال کلا ان معی ربی سیھدین (شعرا) فاتبعھم فرعون بجنودہ فغشیھم من الیم ما غشیھم واضل فرعون قومہ وما ھدی (طٰہ) وازلفنا ثم الاخرین و انجینا موسی ومن معہ اجمعین ثم اغرقنا الاخرین (شعرا) فانتقمنا منھم فاغرقنٰھم فی الیم بانھم کذبوا بایاتنا وکانوا عنھا غافلین فاخذنٰہ وجنودہ فنبذنٰھم فی الیم (قصص) فاراد ان یستفزھم من الارض فاغرقنٰہ ومن معہ جمیعا وقلنا من بعدہ لبنی اسرائیل اسکنوا الارض فاذا جاء وعد الاخرۃ جئنا بکم لفیفا (بنی اسرائیل)

اور جب ہمنے چالیس راتوں کا موسیٰ سے وعدہ کیا اُس پر تمنے موسیٰ کے پیچھے بچھڑا بنا لیا اور تم ظالم تھے ﴿۴۸﴾

رات کو سمندر میں ہو کے رستہ سے لیکر نکل چل پس جو معجزہ تھا وہ یہی تھا کہ ایسے مشکل وقت میں سمندر کے پایاب ہونے سے خدا تعالے نے موسیٰ کو اور تمام بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجے سے بچا دیا

جو اُس پر ایمان لائے ہیں اور اُنکی عورتونکو زندہ رہنے دو حالانکہ کافرونکی مکاری بجز گمراہی کے اور کچھ نہیں اور فرعون نے کہا مجھکو چھوڑ دو (یعنی اجازت دو) کہ میں موسیٰ کو مار ڈالوں اور وہ اپنے پروردگار کو پکارا ہی کرے بلا شبہہ مجھے خوف ہے کہ تمھارا دین بدل دے اور ملک میں فساد برپا کرے اور فرعون والوں میں سے ایک مسلمان شخص نے جو اپنے ایمان کو چھپاتا تھا کہا کہ کیا تم ایسے شخص کو مار ڈالوگے جو کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے اور تمھارے پاس تمھارے پروردگار سے نشانیاں لایا ہے اور اگر وہ جھوٹا ہو تو اُسکا جھوٹ اُس پر ہے اور اگر وہ سچا ہے تو تم کو بعضی وہ مصیبتیں پہنچینگی جن کا وہ وعدہ کرتا ہے ہرگز خدا اُس شخص کو جو حد سے تجاوز کرنیوالا دروغگو ہو ہدایت نہیں کرتا، اے میری قوم آج کے دن تمہارے لئے بادشاہت ہے دنیا پر غالب ہو پر خدا کے عذاب سے اگر وہ ہمپر آجاوے کون ہمکو مدد دیگا فرعون نے کہا میں تمکو بجز اُسکے جو میں دیکھتا یا سمجھتا ہوں اور کچھ نہیں سمجھاتا اور میں تمکو بجز راہ راست کے اور کچھ نہیں بتاتا اُس شخص نے جو ایمان لے آیا تھا کہا کہ اے میری قوم بیشک میں تمپر ایسے دن کا جو اگلے گروہوں پر آیا ہے خوف کرتا ہوں جیسے قوم نوح اور عاد اور ثمود اور اُن کی جو اُنکے بعد ہوئیں حالت تھی اور خدا بندوں پر ظلم کرنیکا ارادہ نہیں کرتا اے میری قوم بے شک میں تم پر چلا ہٹ پڑنیکے دن کا خوف کرتا ہوں اُس دن کہ تم اوندھے منہہ پیٹھ پھیر کر پھروگے کوئی تمکو خدا سے بچانیوالا نہوگا اور جسکو خدا گمراہ کرتا ہے اُسکو کوئی راہ بتانیوالا نہیں ہوتا البتہ تمہارے پاس اس سے پہلے کھلی ہوئی نشانیاں لیکر یوسف آیا تھا پھر تم ہمیشہ اُس بات میں جو وہ تمہارے پاس لایا تھا شبہہ میں رہے یہانتک کہ جب وہ مرگیا تو تمنے کہا کہ ہرگز نہیں بھیجنے کا اللہ اُس کے بعد کسی پیغمبر کو۔

فرعون نے کہا اے ہامان میرے لئے ایک محل بنا تاکہ میں رستوں تک آسمانوں کے رستوں تک پہونچ جاؤں پھر موسیٰ کے خدا کے پاس چڑھ جاؤں اور میں تو اُسکو جھوٹا سمجھتا ہوں اور اسیطرح فرعون کے لئے اُس کے بد عمل بھڑک دار کئے گئے تھے اور سیدھے رستہ سے روک دیا گیا تھا اور فرعون کے مکر بجز تباہی کے اور کچھ نہ تھے قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا پھر اُن سے پھر گیا اور ہم نے اُسکو اپنے خزانے دئے تھے کہ اُس کی کنجیاں ایک قوی گروہ پر بھی بھاری تھیں، جب اُس کی قوم نے اُس سے کہا کہ مت اترا کہ خدا اترانے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور جو کچھ خدا نے

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ

اور جب فرعون نے پایاب اترنا چاہا تو پانی بڑھ گیا تھا وہ معہ اپنے لشکر کے ڈوب گیا۔

اس مقام پر یہ بحث پیش آوے گی کہ جب، ضرب کے معنی چلنے کے آتے ہیں تو

وظللنا علیکم الغمام وانزلنا علیکم المن والسلوی کلوا من طیبات ما رزقناکم وما ظلمونا ولکن کانوا انفسہم یظلمون (بقر) ونزلنا علیکم المن والسلوی کلوا من طیبات ما رزقناکم ولا تطغوا فیہ فیحل علیکم غضبی ومن یحلل علیہ غضبی فقد ھوی (طہ) وقطعناھم اثنتی عشرۃ اسباطا امما واوحینا الی موسی اذ استسقاہ قومہ ان اضرب بعصاک الحجر فانبجست (اعراف) فانفجرت منہ اثنتا عشرۃ عینا قد علم کل اناس مشربہم کلوا واشربوا من رزق اللہ ولا تعثوا فی الارض مفسدین (بقر) واذ قلتم یا موسی لن نصبر علی طعام واحد فادع لنا ربک یخرج لنا مما تنبت الارض من بقلہا وقثائہا وفومہا وعدسہا وبصلہا قال اتستبدلون الذی ھو ادنی بالذی ھو خیر اھبطوا مصرا فان لکم ما سالتم (بقر)

وجاوزنا ببنی اسرائیل البحر فاتوا علی قوم یعکفون علی اصنام لہم قالوا یا موسی اجعل لنا الٰہا کما لہم آلہۃ قال انکم قوم تجہلون ان ھؤلاء متبر ما ھم فیہ وباطل ما کانوا یعملون (اعراف) واذ قلنا ادخلوا ھذہ القریۃ فکلوا منہا حیث شئتم رغدا وادخلوا الباب سجدا وقولوا حطۃ نغفر لکم خطایاکم وسنزید المحسنین فبدل الذین ظلموا قولا غیر الذی قیل لہم فارسلنا علیہم رجزا من السماء بما کانوا یفسقون (بقر) یظلمون (اعراف) ولما جاء موسی لمیقاتنا وکلمہ ربہ قال رب ارنی انظر الیک قال لن ترانی ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانہ فسوف ترانی فلما تجلی ربہ للجبل جعلہ دکا وخر موسی صعقا فلما افاق قال سبحانک تبت الیک وانا اول المؤمنین قال یا موسی انی اصطفیتک علی الناس برسالاتی وبکلامی فخذ ما آتیتک وکن من الشاکرین (اعراف)

واذ قلتم یا موسی لن نؤمن لک حتی نری اللہ جہرۃ (بقر) واختار موسی قومہ سبعین رجلا لمیقاتنا (اعراف) فاخذتکم الصاعقۃ وانتم تنظرون ثم بعثناکم من بعد موتکم لعلکم تشکرون (بقر) فلما اخذتہم الرجفۃ قال رب لو شئت

پھر اسکے بعد بھی ہمنے تم کو معاف کر دیا

اُس کے صلہ میں ”فی“ کا لفظ آتا ہے جیسے کہ ”اذا ضربتم فی الارض“ میں ہے حالانکہ ”فاضرب بعصاک البحر“ اور ”فاضرب بعصاک الحجر“ میں ”فی“ نہیں ہے

تجھکو دیا ہے اُس میں آخرت کو ڈھونڈ اور اپنے حصہ کو دنیا میں سے مت بھول اور احسان کر جسطرح کہ خدا نے تجھ پر احسان کیا ہے اور دنیا میں فساد مت مچا کہ اللہ تعالی مفسدون کو دوست نہیں رکھتا اُس نے کہا کہ مجھکو یہہ دولت صرف میری دانائی کے سبب دی گئی ہے۔ کیا وہ یہہ نہ سمجھا کہ بے شبہہ خدا نے کسی زمانہ میں اُس سے پہلے اُنکو ہلاک کر دیا جو اُس سے بھی زیادہ قوی اور زیادہ دولت والے تھے اور کیا گنہگار اپنے گناہون پر پوچھے نہ جاوینگے پھر قارون اپنی قوم کے سامنے تجمل سے نکلا جو لوگ دنیا ہی کی زندگی کو چاہتے تھے اونہوں نے کہا کہ کاش ہماری پاس بھی وہ کچھ ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے بے شک وہی بڑا صاحب نصیب ہے۔ اور جن لوگوں کو دانش دی گئی تھی اُنہوں نے کہا کہ افسوس تم پر خدا کا ثواب اُنکے لئے جو ایمان لائے ہیں اور اچھے کام کئے ہیں بہت اچھا ہے اور وہ بجز صبر کرنیوالوں کے اور کسی کو نہیں ملتا، پھر ہم نے قارون کو اُسکے گھر سمیت زمین میں دھنسا دیا پھر کوئی گروہ خدا کی سوا اُسکے لئے نہ تھے جو اُسکی مدد کرے اور نہ وہ اپنے آپ مدد کر سکتا تھا، اور جن لوگوں نے کل اُسکے مرتبہ کی تمنا کی تھی اُنہوں نے یہہ کہتے ہوئے صبح کی، او ہو اللہ اپنے بندون میں سے جس کے لئے چاہتا ہی رزق کو فراخ کرتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کرتا ہی اور خدا ہم پر احسان نہ کرتا تو ہم کو بھی دھنسا دیتا، او ہو، وہ نہیں فلاح پہونچاتا کافرونکو اور فرعون نے اپنے لوگون میں پکار کر کہا کہ اے لوگو کیا میرے پاس مصر کا ملک نہیں ہے اور یہہ نہریں جو میری ملک کی نیچے بہتی ہیں پھر کیا تم نہیں دیکھتے ہو آیا میں اچھا ہوں اس شخص سے جو ذلیل ہے اور نہیں بیان کر سکتا کیوں نہ اُس پر ڈالے گئے سونیکے کنگن اور کیون نہ اُسکے ساتھ فرشتے ساتھ رہنے کو آئے۔ اور جب فرعون والون پر آفت پڑی تو بولے اے موسے ہمارے لئے اپنے پروردگار سے جس طرح اُس نے تجھکو بتایا ہے دعا مانگ اگر ہم پر سے آفت جاتی رہے تو ہم تجھپر ضرور ایمان لاوینگے اور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دینگے پھر جب ہم نے اُن پر سے ایک مدت تک آفت کو دور کر دیا جس آفت تک وہ پہونچنے کو تھے تو وہ پھر گئے اور ہم نے اُنکو عذاب میں گرفتار کیا کہ شاید وہ بدراہ سے پھر جاویں۔ فرعون والون نے کہا اے جادوگر ہمارے لئے اپنے پروردگار سے جسطرح کہ اُس نے تجھکو بتایا ہے دعا مانگ بیشک ہم ہدایت پا گئے ہیں موسی نے کہا اے ہمارے پروردگار تو نے فرعون کو اور اُسکے درباریونکو تجمل اور دولت دنیا کی زندگی میں دی ہے اے ہمارے پروردگار کیا اسلئے کہ تیرے رستہ سے گمراہ کریں۔۔۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۴۹﴾

مگر فی کے نہ ہونے سے کچھ ہرج نہیں ہے اس لئے کہ جب "ضرب" کے معنی چلنے کے لئے جاتے ہیں تو بواسطہ حرف جر یعنی "فی" کے متعدی کیا جاتا ہے اور جو افعال کہ

اھلکتھم من قبل وایای (اعراف) و اذ اخذنا میثاقکم ورفعنا فوقکم الطور خذوا ما اتینٰکم بقوۃ واذکروا ما فیہ لعلکم تتقون (بقرہ) واذ نتقنا الجبل فوقھم کانہ ظلۃ وظنوا انہ واقع بھم خذوا ما اتینٰکم بقوۃ (اعراف) وما اعجلک عن قومک یٰموسی قال ھم اولاء علی اثری وعجلت الیک رب لترضی (طٰہ) وواعدنا موسی ثلٰثین لیلۃ واتممنٰھا بعشر فتم میقات ربہ اربعین لیلۃ وقال موسی لاخیہ ھارون اخلفنی فی قومی واصلح ولا تتبع سبیل المفسدین (اعراف) واتخذ قوم موسی من بعدہ من حلیھم عجلا جسدا لہ خوار (اعراف) قال فانا قد فتنا قومک من بعدک واضلھم السامری (طٰہ) فاخرج لھم عجلا جسدا لہ خوار فقالوا ھٰذا الٰھکم والٰہ موسٰی فنسی افلا یرون ان لا یرجع الیھم قولا ولا یملک لھم ضرا ولا نفعا ولقد قال لھم ھٰرون من قبل یٰقوم انما فتنتم بہ وان ربکم الرحمٰن فاتبعونی واطیعوا امری قالوا لن نبرح علیہ عاکفین حتی یرجع الینا موسی (طٰہ) فرجع موسی الی قومہ غضبان اسفا (طٰہ) قال موسی لقومہ یٰقوم انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل فتوبوا الی بارئکم فاقتلوا انفسکم ذٰلکم خیر لکم عند بارئکم (بقرہ) ان الذین اتخذوا العجل سینالھم غضب من ربھم وذلۃ فی الحیوۃ الدنیا (اعراف)

قال یٰقوم الم یعدکم ربکم وعدا حسنا افطال علیکم العھد ام اردتم ان یحل علیکم غضب من ربکم فاخلفتم موعدی (طٰہ) قال بئسما خلفتمونی من بعدی اعجلتم امر ربکم والقی الالواح واخذ براس اخیہ یجرہ الیہ قال ابن ام ان القوم استضعفونی وکادوا یقتلوننی فلا تشمت بی الاعداء ولا تجعلنی مع القوم الظٰلمین (اعراف) انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل ولم ترقب قولی (طٰہ) قالوا ما اخلفنا موعدک بملکنا ولٰکنا حملنا اوزارا من زینۃ القوم فقذفنٰھا فکذٰلک القی السامری (طٰہ) قال فما خطبک یٰسامری

شاید کہ تم شکر کرو (۴۹)

کہ بواسطہ حرف جر کے متعدی ہوتے ہیں اُن میں حرف جر کو حذف کرنا اور فعل کو بلا واسطہ
مفعول کی طرف متعدی کرنا جائز ہے اور اس مفعول کو منصوب علی نزع الخافض

اے پروردگار ہمارے ستیاناسی ڈال اُن کے مالوں پر اور سختی ڈال اُنکے دلوں پر پھر وہ
نہیں ایمان لانیکے جب تک کہ دکھ دینے والا عذاب نہ دیکھینگے۔ خدا نے کہا کہ تم دونوں کی دعا
قبول کی گئی پھر مستقل رہو اور اُنکی راہ مت چلو جو نہیں جانتے۔ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا سے مدد مانگو
اور صبر کرو بیشک یہ زمین خدا کی ہے اُسکو اپنے بندوں میں سے جسکو چاہتا ہے دیتا ہے اور آخر کو بھلائی پرہیزگاروں
کے لیے ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ ہمکو تو تیرے آنے سے پہلے اور تیرے آنیکے بعد اذیت ہی دی گئی ہے۔ موسیٰ نے کہا
کہ قریب ہے تمہارے دشمنوں کو خدا ہلاک کریگا اور عنقریب تمکو زمین پر خلیفہ کر دیگا پھر دیکھیگا کہ تم کس طرح کرو گے۔
ہمنے موسیٰ پر وحی کی کہ رات کو لے چل میرے بندوں کو چل اُنکے لئے سمندر کے سوکھے رستہ میں مت خوف کر پکڑے جانے
سے اور نہ کسی طرح کا ڈر کر لے چل میرے بندوں کو رات کو تم (دشمن سے) تعاقب کئے جاؤ گے اور چھوڑ چل سمندر کو ایسی حالت
میں کہ وہ اُترا ہوا ہے بے شک فرعون کے لوگ ایک لشکر ہے کہ ڈبویا جاویگا۔ چل اپنی لاٹھی کے سہارے سے سمندر میں
کہ وہ پھٹا ہوا ہے۔ پھر تھا ہر ایک ٹکڑا بڑے پہاڑ کی مانند۔ اور جب کہ ہمنے تمہارے سبب سے سمندر کو جدا کر دیا پھر ہمنے
تمکو بچایا اور ہمنے فرعون والوں کو ڈبو دیا اور تم دیکھتے تھے پھر سورج کے نکلتے ہی فرعون والوں نے بنی اسرائیل کا پیچھا کیا
پھر جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو موسیٰ کے لوگوں نے کہا کہ اب ہم پکڑے گئے موسیٰ نے کہا ہرگز نہیں
بیشک میرے ساتھ میرا خدا ہے جو ٹھیک رستہ بتا دیگا۔ پھر فرعون نے اپنے لشکر سمیت اُنکا پیچھا کیا پھر ڈھانک دیا اُنکو سمندر
میں سے جس نے اُنکو ڈھانک لیا اور غلط راہ پر لگایا فرعون اپنی قوم کو اور ٹھیک رستہ نہ بتایا۔ اور ہمنے پچھلوں کو قریب
کر دیا اور ہمنے موسیٰ کو اور جو اُسکے ساتھ تھے سب کو بچا دیا پھر ہمنے پچھلوں کو ڈبو دیا۔ پھر ہمنے بدلا لیا اُن سے اور ہمنے اُنکو
سمندر میں ڈبو دیا اس لئے کہ بیشبہ اُنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا اور اُس سے غافل تھے پھر پکڑا ہمنے فرعون کو
اور اُسکے لشکر کو اور اُنکو ہمنے سمندر میں ڈالدیا۔ فرعون چاہتا تھا کہ اُنکو زمین سے نکال دے پھر ہمنے اُسکو ڈبو دیا اور سب کو
جو اُسکے ساتھ تھے اور اُسکے بعد ہمنے بنی اسرائیل کو کہا کہ رہو اس زمین پر پھر جب آویگا آخرت کا وعدہ تو ہم تمکو لا دینگے [illegible]

+ "رہوا" کا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب نے "تھم رہا" کیا ہے اور شاہ رفیع الدین صاحب نے "خشک" کیا ہے اور شاہ
ولی اللہ صاحب نے "آرمیدہ" اور قاموس میں اسکے معنی لکھے ہیں "المرتفع والمنخفض ضد والسکون"

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ

لکھتے ہیں۔ اس مقام پر فعل "اضرب" کے "عصا" کے ساتھ ربط دینے کو ایک حرف جر یعنی "ب" "عصا" پر آچکی تھی پھر اُسی فعل کو مفعول کی جانب متعدی کرنے کیلئے

قال بصرت بما لم يبصروا به فقبضت قبضة من اثر الرسول فنبذتها وكذلك سولت لي نفسي قال فاذهب فان لك في الحيوة ان تقول لا مساس (طه) فلما سكت عن موسى الغضب اخذ الالواح وفي نسختها هدى ورحمة للذين هم لربهم يرهبون (اعراف) ثم آتينا موسى الكتب تماما على الذي احسن وتفصيلا لكل شيء وهدى ورحمة لعلهم بلقاء ربهم يومنون (انعام) واذ اخذنا ميثاق بني اسرائيل وبعثنا منهم اثنا عشر نقيبا وقال الله اني معكم لئن اقمتم الصلوة و آتيتم الزكوة وآمنتم برسلي وعزرتموهم واقرضتم الله قرضا حسنا (مائده)

اذ قال موسى لقومه ان الله يامركم ان تذبحوا بقرة قالوا اتتخذنا هزوا قال اعوذ بالله ان اكون من الجاهلين قالوا ادع لنا ربك يبين لنا ما هي قال انه يقول انها بقرة لا فارض ولا بكر عوان بين ذالك فافعلوا ما تؤمرون قالوا ادع لنا ربك يبين لنا ما لونها قال انه يقول انها بقرة صفراء فاقع لونها تسر الناظرين قالوا ادع لنا ربك يبين لنا ما هي ان البقر تشابه علينا وانا ان شاء الله لمهتدون قال انه يقول انها بقرة لا ذلول تثير الارض ولا تسقي الحرث مسلمة لا شية فيها قالوا الان جئت بالحق فذبحوها وما كادوا يفعلون (بقر)

يا قوم ادخلوا الارض المقدسة التي كتب الله لكم ولا ترتدوا على ادباركم فتنقلبوا خسرين قالوا يا موسى ان فيها قوما جبارين وانا لن ندخلها حتى يخرجوا منها فان يخرجوا منها فانا داخلون قال رجلان من الذين يخافون انعم الله عليهما ادخلوا عليهم الباب فاذا دخلتموه فانكم غالبون وعلى الله فتوكلوا ان كنتم مومنين قالوا يا موسى انا لن ندخلها ابدا ما داموا فيها فاذهب انت وربك فقاتلا انا ههنا قاعدون قال رب اني لا املك الا نفسي واخي فافرق بيننا وبين القوم الفاسقين قال فانها محرمة عليهم اربعين سنة يتيهون في الارض فلا تاس على القوم الفاسقين (مائده)

اور (یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور صحیح کو غلط سے جدا کرنے والی چیز دی

دوسرے حرف جر یعنی "فی" کا لانا کسیقدر فصاحت کلام کے مناسب نہ تھا اور اس لئے اُس کا حذف اولی تھا پس تقدیر کلام کی یہہ ہے کہ "فاضرب بعصاك فی البحر" اور قرینہ حذف "فی" کا

ہم نے تمپر چھاؤں کی ابر کی اور تمپر من وسلوا اوتارا کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہمنے تمکو دیں اور ہمنے اُن پر ظلم نہیں کیا مگر اُنھوں نے آپ اپنے پر ظلم کیا تھا۔ اور ہمنے تم پر من وسلوی اوتارا کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہمنے تمکو دی ہیں اور اُس میں زیادتی مت کرو تاکہ میرا غصہ تم پر نازل ہو اور جسپر میرا غصہ نازل ہوا وہ ہلاک ہوا۔ اور جدا کر دلئے ہمنے بنی اسرائیل کے اسباط کے بارہ گروہ اور ہمنے موسی پر وحی کی جب کہ اُسکی قوم نے پانی مانگا کہ چل اپنی لاٹھی کے سہارے اس چٹان پر اُس سے بہتے ہیں پھوٹ نکلے ہیں بارہ چشمے اُن میں ہر ایک نے اپنا گھاٹ جان لیا کھاؤ اور پیو خدا کی دی ہوئی رزق سے اور زمین پر مفسد ہو کر نافرمانی مت کرو

جب تمنے کہا کہ اے موسی ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے پہر اپنے پروردگار سے دعا مانگ کہ ہمارے لئے وہ چیزیں نکالے جو زمین اُگاتی ہے ترکاری اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز اور لہسن موسی نے کہا کیا تم بدلنا چاہتے ہو بُرے کو بہلے سے جا اُترو شہر میں کہ تم کو ملے گا جو تم مانگتے ہو۔

اور ہم بنی اسرائیل کو دریا سے نکال لے گئے پھر وہ ایک ایسی قوم کے پاس آئے جو اپنے بتوں کی سیوا کرتے تھے بنی اسرائیل نے کہا کہ اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایسے معبود بنا جیسے اُنکے معبود ہیں موسیٰ نے کہا کہ بیشک تم جاہل قوم ہو یہہ خراب حالت ہے جس میں یہہ لوگ ہیں اور غلط ہے جو یہہ کرتے ہیں اور جب ہمنے تم سے کہا کہ داخل ہو اس شہر میں پھر کھاؤ اُس میں سے جو چاہو پیٹ بہر کر اور داخل ہو دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہو کہ ہم معافی چاہتے ہیں بخش دینگے ہم تمہاری سب خطائیں اور نیکی کرنیوالوں کو زیادہ دینگے پھر ظالموں نے بات بدل دی اُس کے سوا جو اُن سے کہی گئی تھی پھر ہمنے اُنکی بدکاری کے سبب اُنپر آسمان سے آفت بھیجی اور جب موسیٰ ہمارے وقت مقررہ پر آیا اور اُس کے پروردگار نے اُس سے بات کی تو اُس نے کہا کہ تو مجھکو اپنے تئیں دکھا دے تاکہ میں تجھکو دیکھوں خدا نے کہا کہ تو مجھکو ہرگز نہیں دیکھ سکتا لیکن تو اس پہاڑ کو دیکھ پھر اگر یہہ پہاڑ اپنی جگہہ ٹھیرا رہا تو تو مجھکو دیکھ سکے گا پھر جب اُس کے پروردگار نے پہاڑ پر تجلی کی تو اُسکو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور موسیٰ بیہوش ہو کر گرا پھر جب ہوش میں آیا تو کہا کہ تو پاک ہے اے اللہ میں توبہ کرتا ہوں تیرے سامنے اور میں پہلا ایمان لانیوالا ہوں خدا نے کہا اے موسی میںنے تجھکو اور لوگوں پر اپنا رسول کرنے اور خود کلام کرنے سے برگزیدہ کیا ہے پھر جو میں تجھکو دیتا ہوں اُس کو لے اور شکر کرنیوالوں میں ہو۔ اور جب تمنے کہا اے موسی ہم تجھپر ایمان نہ لاوینگے جب تک کہ علانیہ خدا کو نہ دیکھیں۔ اور موسیٰ نے ہمارے

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۵۰)

خود قرآن مجید سے پایا جاتا ہے کیونکہ یہی قصہ انہی الفاظ سے سورہ طٰہٰ میں بھی آیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ "فاضرب لھم طریقا فی البحر" میں ایک جگہہ لفظ "فی" مذکور ہے تو یہی قرینہ

وقت مقررہ پر حاضر ہونے کے لئے اپنی قوم میں سے ستر آدمی چھانٹے تھے تمکو بجلی کی کڑک نے پکڑ لیا اور یہہ سب باتیں تم دیکھتے تھے پھر ہمنے تم کو تمھارے مرجانے (بیہوش ہو جانے) کے بعد اُٹھایا کہ شاید تم شکر کرو پھر جب اُن کو کپ کپاہٹ نے پکڑا تو موسیٰ نے کہا اے پروردگار اگر تو چاہتا تو اُس سے پہلے ہی اُنکو اور مجھکو بھی مار ڈالتا۔ اور جب ہمنے تم سے قول لیا اور ہمنے تمھارے اوپر پہاڑ کو بلند کیا کہ مضبوط پکڑو جو کچھ ہمنے تمکو دیا ہے اور یاد رکھو جو کچھ اُس میں ہے شاید کہ تم بچ جاؤ اور جب ہمنے اُن پر پہاڑ کو اُٹھایا گویا کہ وہ سائبان تھا اور اُنھوں نے گمان کیا کہ وہ اُن پر گریگا مضبوطی سے پکڑو جو ہمنے تم کو دیا ہے۔ ہمنے موسیٰ سے کہا کہ کیوں تو جلدی کر کے چلا آیا اپنی قوم کے پاس سے کہا وہ بھی میرے پیچھے ہیں اور میں تیرے پاس جلدی چلا آیا ہوں تاکہ اے پروردگار تو راضی ہو، اور وعدہ کیا ہمنے موسیٰ سے تیس رات کا اور ہمنے پورا کیا اُسکو دس سے پھر تمام ہو گئی میعاد اُس کے پروردگار کی چالیس رات، اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ میری قوم میں میرا خلیفہ ہو اور اصلاح کر اور مفسدوں کے طریق کی پیروی مت کر موسیٰ کی قوم نے اُس کے بعد اپنے زیور سے ایک بچھڑے کا پتلا بنایا جس میں سے آواز نکلتی تھی۔ خدا نے موسیٰ سے کہا کہ ہمنے تیرے بعد تیری قوم کو فتنہ میں ڈالا اور سامری نے اُنکو گمراہ کر دیا پھر سامری نے اُنکے لئے بچھڑے کا پتلا بنایا جس میں آواز نکلتی تھی پھر وہ بولے کہ یہہ ہی تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا موسیٰ تو بھول گیا، کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ اُنکی بات کا اُلٹ کر جواب نہیں دیتا اور نہ اُنکے لیے ضرر اور نہ نفع پہونچانیکا مالک ہے، اور پہلے ہی سے ہارون نے اُن سے کہا تھا کہ اے قوم اسکے سوا کچھ نہیں کہ تم اس سے فتنہ میں ڈالے گئے ہو اور بیشک تمھارا پروردگار رحم والا ہے میری پیروی کرو اور میرے حکم کی اطاعت کرو اُنھوں نے کہا کہ ہم اسی کی پوجا کیا کرینگے جب تک کہ موسیٰ لوٹ کر نہ آوے پھر موسیٰ اپنی قوم کے پاس لوٹ کر آیا غصہ میں بھرا ہوا افسوس کرتا ہوا موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تمنے بچھڑے بنانے میں اپنی جانوں پر ظلم کیا تو بہ کرو اللہ کے سامنے اور مار ڈالو اپنی جانوں کو کہ یہی تمھارے حق میں تمھارے خدا کے نزدیک بہتر ہے جن لوگوں نے بچھڑا بنایا قریب ہے کہ اُنکے پروردگار کا غصہ اُن تک پہونچیگا اور ذلت دنیا کی زندگی میں موسیٰ نے کہا کہ اے میری قوم کیا تم سے خدا نے وعدہ نہیں کیا تھا اچھا وعدہ اور کیا ایک لمبا زمانہ تم پر گذر گیا تھا بلکہ تم نے چاہا کہ تم پر تمھارے پروردگار کا غصہ اوترے اس لئے تم نے میرے وعدے کے برخلاف کیا۔

کہ شاید تم راہ پر آؤ (۵۰)

باقی مقامات میں اُس کے محذوف ہونے کا ہے۔ اسی آیت میں فعل ''اضرب'' کے بلاواسطہ حرف جر متعدی الی المفعول ہونے کی مثال بھی موجود ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے

موسیٰ نے کہا کہ بہت بُرا کیا تم نے میرے بعد کیا جلدی کی تم نے اپنے پروردگار کے حکم میں اور پھینک دیا الواح توریت کو اور اپنے بھائی کے سر کے بال پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اُس نے کہا کہ اے میرے ماجائے ان لوگوں نے مجھکو کمزور جانا تھا اور مجھکو مارے ڈالتے تھے پھر میرے دشمنوں کو مت خوش کرو اور مت کر مجھکو ان ظالم لوگوں کے ساتھ۔ مجھکو یہہ ڈر تھا کہ تو یہہ کہیگا کہ تو نے تفریق ڈال دی بنی اسرائیل میں اور نہ انتظار کیا تو نے میری بات کا۔ اُنھوں نے کہا کہ ہمنے تو اپنے اختیار سے تیرے وعدہ کے خلاف نہیں کیا بلکہ ہم قوم قبطی کے زیور کا بوجھ اُٹھا رہے تھے پھر ہمنے اُسکو پھینکدیا اور اسی طرح پھینکدیا سامری نے پھر سامری نے بچھڑے کی صورت بنائی جس میں سے آواز نکلتی تھی موسیٰ نے کہا کہ اے سامری تیرا کیا حال ہے اس نے کہا کہ مجھے وہ بات سوجھائی جو انکو نہیں سوجھائی پھر میں نے پیغمبر کے پاؤں تلے کے نشان کی مٹی لی پھر میں نے بچھڑے میں ڈالدی اور اسیطرح کرنا میرے دل نے مجھے اچھا بتایا موسیٰ نے کہا کہ دور ہو تجھکو اس دنیا میں یہی سزا ہے کہ تو کہتا رہیگا کہ میرے پاس مت آؤ۔ پھر جب موسیٰ کا غصہ تھما تو اُس نے الواح کو اُٹھالیا اور اُس میں اُنکے لئے ہدایت اور رحمت تھی جو ڈرتے ہیں۔ پھر ہمنے موسیٰ کو کتاب دی جو لوگ نیکی کرنے والے ہیں اُن پر نعمت پوری کرنے کو اور ہر چیز کی تفصیل بتانے کو اور ہدایت اور رحمت کرنیکو کہ شاید وہ اپنے پروردگار سے ملنے پر ایمان لاویں۔ اور جب ہمنے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا اور اُن میں سے بارہ سردار کھڑے کئے اور خدا نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم قائم کرتے رہوگے نماز اور تم دیتے رہوگے زکوۃ اور تم ایمان لاتے رہوگے میری رسولوں پر اور تم مدد کرتے رہوگے اُنکی اور تم قرض دیتے رہوگے اللہ کو قرض حسنہ۔

جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا تم کو یہہ حکم کرتا ہے کہ ذبح کرو بیل کو انھوں نے کہا کہ کیا تو ہم سے ہنسی کرتا ہے موسیٰ نے کہا میں تو اللہ سے پناہ مانگتا ہوں جاہل قوم سے اُنھوں نے کہا کہ اپنے پروردگار سے پوچھ کہ ہمکو تبلادے کہ وہ کیسا بیل ہو کہا وہ بیل نہ بوڑھا ہو اور نہ بچہ میانہ سال اِن دونوں کے بیچ میں کرو جو تمکو حکم دیا جاتا ہے اُنہوں نے کہا کہ ہمارے لئے اپنے پروردگار سے پوچھ کہ تبلاوے کیا ہو اُس کا رنگ موسیٰ نے کہا کہ خدا کہتا ہے کہ وہ بیل ڈھڈھا تے زرد رنگ کا ہو اُسکا رنگ خوش کرتا ہو دیکھنے والوں کو اُنھوں نے کہا کہ پوچھ ہمارے لئے اپنے پروردگار سے کہ تبلاوے وہ کیسا ہے کہ ہمپر بیل مشتبہ ہو گئے ہیں اور اگر خدا نے چاہا تو ہم ہدایت پاوینگے موسیٰ نے کہا کہ خدا کہتا ہے وہ ایسا بیل ہو جو نہ جوتا ہو کہ زمین کو پھاڑے یا کھیتی کو پانی دے اُس کے تمام اعضا

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ

اس آیت کا ترجمہ یہہ کیا ہے کہ "پس برو برائے ایشان در راہ خشک" یعنی شاہ صاحب نے "ضرب" کے معنی زدن کے نہیں لئے رفتن کے لئے ہیں جو لازمی ہے اور لفظ "طریقاً" اس آیت میں "اضرب" کا مفعول ہے اور بلا واسطہ حرف جر متعدی الی المفعول ہوا ہے۔

جغرافیہ کے نقشوں کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ خلیج عرب اور بحر احمر عدن کے پاس مل گئے ہیں دونوں طرف پہاڑ ہیں اور اُنکے بیچ میں نہایت تنگ رستہ ہے، جو جہاز خلیج عرب سے بحر احمر میں جاتے ہیں وہ اسی تنگ رستہ میں ہوکر گذرتے ہیں اس رستہ کو طے کرنے کے بعد بحر احمر ملتا ہے جو نہایت بڑا اور وسیع سمندر ہے جب اُس کے شمال کیطرف چلے جاؤ تو اخیر کو اسکی دو شاخیں ہوگئی ہیں، اگر تم اپنے دہانے ہاتھ کو چت کر کر سب اُنگلیاں بند کر دو اور صرف بیچکی اُنگلی اور کلمہ کی اُنگلی کھول دو اور دونوں کو پھیلا کر رکھو تو بحر احمر کی شاخوں کی بالکل صورت بن جاوے گی کلمہ کی اُنگلی دہائین طرف رہے گی اور بیچ کی اُنگلی بائیں طرف اور اُن دونوں کے بیچ میں ایک مثلث کی صورت دکھائی دے گی بحر احمر کی دہائین شاخ جو جانب شرق ہے چھوٹی ہے جیسے کہ کلمہ کی اُنگلی چھوٹی ہے اور بائین شاخ جو جانب غرب ہے کسی قدر بڑی ہے جیسے کہ بیچ کی اُنگلی بڑی ہے اور یہہ جھوکنا بیچ کی اُنگلی یعنی بڑی شاخ کے بائیں طرف مصر ہے اور اُن دونوں اُنگلیوں کے بیچ میں جو مثلث جگہ ہے وہ جگہہ

مسلم ہوں اور اُس میں کوئی دہبہ نہو اُنھوں نے کہا اب تو نے ٹھیک بات بتائی پھر اُنھوں نے ذبح کیا اور کرتے نہیں لگتے تھے۔

اے لوگو تم اُس پاک زمین میں داخل ہو جو خدا نے تمھارے لئے لکھ دی ہے اور مت پھرو اپنے پیٹ کے بل پیچھے پھر پلٹو گے نقصان اُٹھانیوالے اُنھوں نے کہا اے موسیٰ اُس میں تو بہت زبردست قوم رہتی ہے ہم ہرگز اُس میں نہیں جائیں گے جب تک کہ وہ اُس میں سے نہ نکل جاویں جب وہ اُس میں سے نکل جاویں گے تب ہم اس میں داخل ہونگے اُن میں سے دو آدمیوں نے کہا جو خدا سے ڈرتے تھے جن پر خدا نے نعمت کی تھی کہ اے لوگو جا گھسو اُس قوم کے دروازے میں جب تم جا گھسو گے تو تم ہی غالب ہوگے اور خدا ہی پر بھروسا کرو اگر تم ایمان والے ہو، اُنھوں نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز اس میں نہیں گھسینگے جب تک کہ وہ اُس میں ہیں تو جا اور تیرا پروردگار تم دونوں لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں موسیٰ نے کہا اے میرے پروردگار مجھکو اختیار نہیں مگر اپنی جان پر

اور (یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا

اُن جنگلون اور پہاڑون کی ہے جہان بنی اسرائیل چالیس برس تک ٹکراتے پڑے پھرے او ر اُسی جگہہ کوہ سینا یا کوہ طور ہے جس پر حضرت موسیٰ کو تجلی ہوئی اور توریت ملی -

جس زمانہ میں بنی اسرائیل مصر میں رہتے تھے اور فرعون مشہور بادشاہ تھا اُس زمانہ میں اُس کا دارالسلطنت شہر رامیس تھا اُس کے بائیں طرف تھوڑے فاصلہ پر دریاے نیل تھا اور دائین طرف یعنی جانب شرق تین منزل کے فاصلہ پر بحر احمر کی بڑی شاخ تھی حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو شہر رامیس سے لیکر نکلے پہلی منزل "سکوت" میں ہوئی دوسری منزل "ایتام" میں تیسری منزل "فہاحیروت" میں یہہ مقام بحر احمر کی بڑی شاخ کے بائین کنارہ پر یعنی جانب غرب اُس شاخ کی نوک کے پاس واقع تھا ، جب فرعون نے مع اپنے لشکر کے بنی اسرائیل کا تعاقب کیا تو راتون رات حضرت موسیٰ بنی اسرائیل سمیت بحر احمر کی بڑی شاخ کی نوک میں سے جہاں ہمنے نقشہ میں نقطوں کا نشان کر دیا ہے پار اُتر گئے معلوم ہوتا ہے کہ اُسوقت بسبب جوار بھاٹے کے جو سمندر میں آتا رہتا ہے اس مقام پر کہیں خشک زمین نکل آتی تھی اور کہیں پایاب رہ جاتی تھی بنی اسرائیل پایاب و خشک راستہ سے راتون رات بامن اُتر گئے یہی مطلب صاف اُس آیت سے پایا جاتا ہے جو سورہ دخان میں ہے کہ "واترك البحر رهوا" جس کا ٹھیک مطلب یہہ ہے کہ چھوڑ چل سمندر کو ایسی حالت میں کہ اترا ہوا ہے صبح ہوتے فرعون نے جو دیکھا کہ بنی اسرائیل پار اُتر گئے اُس نے بھی اُن کا تعاقب کیا اور لڑائی کی گاڑیان و سوار و پیادے غلط رستے پر سب دریا میں ڈال دئے اور وہ وقت پانی کے بڑہنے کا تھا لمحہ میں پانی بڑہ گیا جیسے کہ اپنی عادت کے موافق بڑہتا ہے اور ڈوبا ؤ ہو گیا جس میں فرعون اور اُسکا لشکر ڈوب گیا -

علماے اسلام کا زمانہ گیارہ بارہ سو برس سے سمجھنا چاہیئے اُن بزرگون نے جو اپنے ہوش سے بحر احمر اور اُسکی اُس شاخ کو جس میں سے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل نے عبور کیا تھا نہایت عمیق اور ایک قہار سمندر دیکھا ہے

اور اپنے بھائی پر پھیر ہم میں اور اس بدکار قوم میں فرق کر خدا نے فرمایا کہ وہ حرام کر دی گئی ہے اُن پر چالیس برس تک وہ ٹکراتے پھرینگے زمین میں اور تو رنج مت کر اس بدکار قوم پر -

يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ

اور اُن کے خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ کیسا ہی بڑا جوار بھاٹا آوے وہ جگہہ کبھی پایاب نہیں ہو سکتی اس لئے اُنھوں نے قرآن مجید کی صاف صاف عبارت اور الفاظ کو جو صریح جوار بھاٹے اور خشک زمین کے نکل آنے پر دلالت کرتی تھی اُلٹ پلٹ کر اس واقعہ کو بطور ایک عجیب واقعہ کے بنایا اور ایسا معجزہ جو قانون قدرت کو بھی توڑ دی ٹھیرا دیا۔ مگر حقیقت حال یہہ نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں جب بنی اسرائیل نے عبور کیا بحر احمر ایسا تھاہ سمندر نہ تھا جیسا کہ اب ہے گو اُس زمانہ کا صحیح جغرافیہ ہمکو نہ ملے مگر بہت پرانا جغرافیہ جو بطلیموس نے بنایا تھا مع اُس کے نقشجات کے جو بطلیموس کے جغرافیے کے مطابق بنائے گئے ہیں خوش قسمتی سے ہمارے پاس موجود ہے اور اُس میں بحر احمر کا بھی نقشہ ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بطلیموس کے زمانہ تک بحر احمر میں تیس چھوٹے بڑے جزیرے موجود تھے اور یہہ صاف دلیل اس بات کی ہے کہ اُس زمانہ میں بحر احمر ایسا تھاہ سمندر نہ تھا جیسا کہ اب ہے یا جیسا کہ ہمارے علماے اسلام بارہ سو برس سے اُسکو دیکھتے آئے ہیں بحر احمر کی اس حالت پر خیال کرنے سے بالکل یقین ہو جاتا ہے کہ وہ مقام جہاں سے بنی اسرائیل اُترے بلاشبہ جوار بھاٹے کے سبب رات کو پایاب اور دن کو عمیق ہو جاتا ہوگا مزید توضیح کے لئے بطلیموس کے جغرافیے میں سے بعینہ بحر احمر کے نقشہ کو ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں یہہ جغرافیہ ہماری پاس اصل یونانی زبان میں جس میں بطلیموس نے لکھا تھا مع لیٹن ترجمہ کے موجود ہے جو سنہ ۱۶۱۸ع میں لوئیس سیزدہم شہنشاہ فرانس کے عہد میں چھپا تھا اور اس میں وہ تمام جزیرے جو بحر احمر میں موجود تھے مندرج ہیں مورخین کے قول کے بموجب بنی اسرائیل سنہ عیسوی سے دو ہزار پانسو تیرہ برس قبل بحر احمر کی شاخ سے اُترے تھے اور بطلیموس جس نے جغرافیہ لکھا اور جس کو گلاڈیوس ٹالمی لکھتے ہیں سنہ عیسوی کی دوسری صدی میں تھا پس بنی اسرائیل کے عبور کرنے کے دو ہزار سات سو برس بعد تک وہ جزیرے موجود تھے۔ یہہ بطلیموس یونانی تھا مگر مصر میں رہتا تھا اور اس لئے بحر احمر کا جو حال اُس نے لکھا ہے زیادہ اعتبار کے لایق ہے سمندر کے جزیرے مدت تک نکلے رہتے ہیں اور پھر کسی زمانہ میں اُن اسباب سے جن کا ذکر علم جیالوجی میں ہے دفعتہً زمین میں بیٹھہ جاتے ہیں اور جہاں

نقشہ بحر احمر

دریائے نیل

مقام عبور موسیٰ
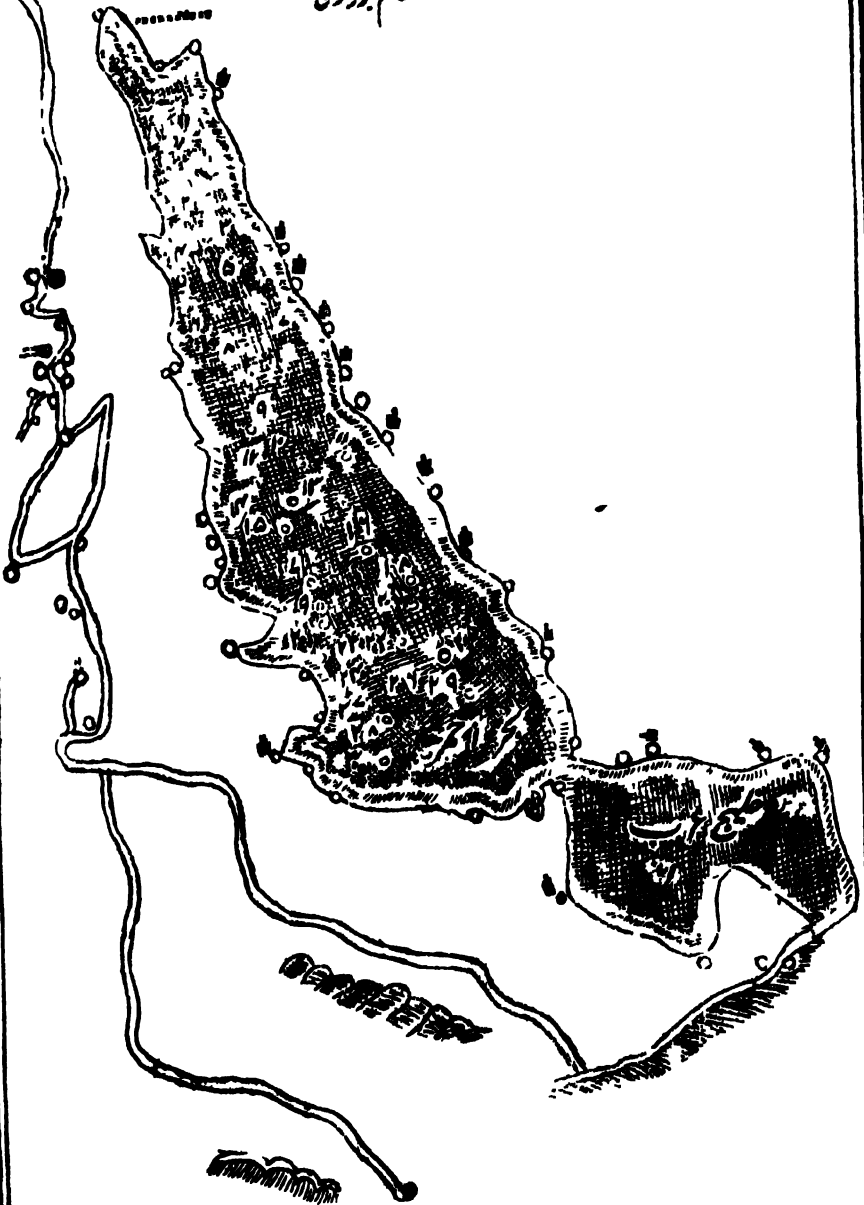
اسمای جزیرہ ہائے بحر احمر

۱ ممی جنیس
۲ ونرس
۳ زجبینیا
۴ اگئی ٹھونس
۵ ذمیونم
۶ اسارٹی
۷ بالی پیچ
۸ ایراپلیڈس
۹ جبسی لٹس
۱۰ گوماڈیرم
۱۱ جرکیم
۱۲ سینٹی رورم
۱۳ کیٹی ٹھری
۱۴ میرونس
۱۵ ٹھرب ڈی ڈلیس
۱۶ ساکرٹیٹس
۱۷ مجورم
۱۸ گارڈی ہیڈ
۱۹ ڈیف نین
۲۰ ایری
۲۱ اکبن تخین
۲۲ کیم سبتا
۲۳ مکبرنیا
۲۴ ارنیان
۲۵ ملیاکی
۲۶ بیکائیی
۲۷ اڈینی
۲۸ ڈایودوراے
۲۹ ہینس
۳۰ اسی ڈس

کہ اے میری قوم تم نے اپنی جانون پر بچھڑا بنا کر ظلم کیا

لوگ بستے تھے اور جن پایاب مقامات پر لوگ چلتے تھے وہان دفعۃً میلوں گہرا پانی ہوجاتا ہے اسی طرح بطلیموس کے زمانہ کے بعد کسی وقت میں یہہ جزیرے بھی جو بحر احمر میں تھے غایب ہو گئے ہیں اور اب ہم کو اتنا بڑا تھا سمندر دکھائی دیتا ہے مگر موسیٰ کے عہد میں ایسا نہ تھا اور اس بات پر یقین کرنے کی بہت سی وجوہات ہیں کہ حضرت موسیٰ کو اس مقام پر سمندر کے پایاب ہو جانے کا حال معلوم تھا اور اسی سبب سے یہہ رستہ اُنہوں نے اختیار کیا تھا کیونکہ سمندر کے پار ایسے جنگل و پہاڑ تھے جس میں فرعون کو لشکر لے جانا اور بنی اسرائیل کا تعاقب کرنا غیر ممکن تھا۔

(۵۱) (عجل) بچھڑا بنانے کا واقعہ اُسوقت ہوا تھا، جب کہ حضرت موسیٰ چالیس دن رات پہاڑ پر جا کر رہے تھے بنی اسرائیل نے بچپن سے مصریون میں پرورش پائی تھی، اور دیکھا کرتے تھے کہ وہ ساری قوم بتون کی اور جانورون کی پرستش کرتی ہے، مصری بندر، اور سانپ اور بیل اور اور بہت قسم کے جانوروں کی پوجا کیا کرتے تھے، جب بنی اسرائیل سمندر کے پار ہوئے تو وہان بھی اُنھون نے بتون کی پرستش کرتے ہوئے لوگون کو پایا، اور موسیٰ سے کہا کہ ہمکو بھی ایسے ہی معبود بنا دے (یہہ قصہ سورہ اعراف میں ہے) گمان غالب ہوتا ہے کہ وہ لوگ بچھڑے ہی کی مورت کی پوجا کیا کرتے ہونگے، اور اُسی کی نقل پر بنی اسرائیل نے بھی بچھڑے کی مورت بنائی تھی جس کے سبب خدا کی خفگی ہوئی۔

(فاقتلوا) اس آیت سے یہہ بات نہیں پائی جاتی کہ بنی اسرائیل میں سے کسی ایک نے بھی اپنے آپ کو مار ڈالا تھا کیونکہ یہہ کہنا کہ، مار ڈالو اپنے آپکو حضرت موسیٰ کا قول ہے اور یہہ کہنا ایسی طرح کا کہنا ہے، جیسے کوئی بزرگ کسی کو نفرین کرتے وقت کہے کہ ڈوب مر ایسا کرنے سے تو تیرا مر جانا بہتر ہے، پس بنی اسرائیل پر خود حضرت موسیٰ کی غصہ کے یہہ الفاظ ہیں خدا نے اُنکو اپنے تئیں آپ مار ڈالنے کا حکم نہیں دیا تھا نہ اُن میں سے کسی نے اپنے تئیں آپ مار ڈالا تھا، یہہ مطلب اس آیت کے پچھلے حصہ سے جس میں معاف کر دینے کا ذکر ہے زیادہ تر صاف ہو جاتا ہے، کیونکہ جن لوگوں نے گوسالہ پرستی کی تھی اُنھی کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ، پھر خدا نے تمکو معاف کیا،۔

(۵۲) (نری اللہ جہرۃ) انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے کی خواہش تین طرح پر پیدا ہوتی ہے، اُسکا حال اور اُس

فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿٥١﴾ وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ﴿٥٢﴾ ثُمَّ بَعَثْنَاكُم مِّن بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٣﴾

سننے سے، یا دل میں کسی خاص قسم کا ذوق و شوق پیدا ہو جانے سے، یا اُسکا حال کہنے والے کی بات پر یقین نہ کرنے سے موسیٰ کو بھی خدا کے دیکھنے کا شوق ہوا مگر وہ شوق دوسری قسم کا تھا جسکے غلبہ میں انسان کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے، اور ہونی اور نہ ہونی بات کہہ اُٹھتا ہے، بنی اسرائیل نے بھی خدا کا دیکھنا چاہا مگر یہہ اُنکا سوال تیسری قسم کا تھا، وہ موسیٰ کی اس بات پر کہ خدائے پروردگار عالم موجود ہے اور اُس نے موسیٰ کو اپنا پیغامبر کیا ہے کیا یقین نہیں لاتے تھے اور اس بنا پر اُنھوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو دکھا دے، جب تک ہم علانیہ خدا کو نہ دیکھہ لیوینگے تجھ پر ایمان نہ لاوینگے، حضرت موسیٰ اپنے شوق کے سبب جس میں انسان کو ذہول ہو جاتا ہے بھول گئے کہ خدا ان آنکھوں سے دکھائی نہیں دے سکتا، اور بنی اسرائیل نے اپنی حماقت سے یہہ چاہا کہ علانیہ خدا کو ہم دیکھہ لیں اور یہہ نہ سمجھے کہ نہ خدا اپنے تئیں کسی کو دکھا سکتا ہے، اور نہ کوئی خدا کو دیکھہ سکتا ہے، ہر کوئی اُس کی قدرت کا کرشمہ دیکھتا ہے اور اُسی سے اُس کی ذات کے موجود ہونے پر یقین لاتا ہے۔

(صاعقہ) کے معنی لغت میں، موت، کے بھی ہیں اور "عذاب مہلک" کے بھی ہیں، مگر اس سے یہہ لازم نہیں آتا کہ اُس عذاب سے کوئی ہلاک ہوے بغیر رہے ہی نہیں، اور عذاب یا بلا آنے کی سنسناہٹ اور گڑگڑاہٹ اور کڑک کے معنی بھی آئے ہیں اور بجلی اور آسمان پر سے گرنیوالی آگ کے معنی بھی ہیں اور "صعق" بکسر العین کے معنی ہیں "غشی علیہ" یعنی بیہوش کیا گیا۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ اس جگہہ "واخذتکم الصاعقۃ" کے کیا معنی ہیں "موت" کے معنی تو یہاں ہو نہیں سکتے اس لیے کہ "وانتم تنظرون" کا مطلب غلط ہو جاتا ہے کیونکہ موت کی نسبت وانتم تنظرون نہیں کہہ سکتے، امام فخرالدین رازی بھی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ یہاں "صاعقہ" کے معنی موت کے نہیں ہیں

پھر معافی چاہو اپنے پروردگار سے، پس مار ڈالو اپنے آپ کو، یہہ اچھا ہے تمھارے لئے تمھارے پروردگار کے نزدیک، پھر (خدا نے) تم کو معاف کیا، ہاں وہ بڑا معاف کرنیوالا بڑا مہربان ہے (۵۱) اور (یاد کرو) جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم تجھ پر یقین نہیں کرینگے، جب تک کہ ہم علانیہ خدا کو نہ دیکھ لیں، پھر تم کو گرج نے پکڑ لیا اور تم دیکھتے تھے (۵۲) پھر ہم نے تم کو اٹھایا تمھارے مردہ ہونے کے بعد، شاید تم شکر کرو (۵۳)

کیونکہ موت کی نسبت تنظرون، نہیں آسکتا اور اس کے سوا خدا نے سورہ اعراف میں فرمایا ہے کہ "وخر موسیٰ صعقا" اور پھر فرمایا ہے کہ "فلما افاق" اور افاقہ موت سے نہیں ہوتا بلکہ غشی سے ہوتا ہے۔ سورہ اعراف میں "صاعقہ" کی جگہہ "رجفہ" فرمایا ہے جس کے معنی کپکپاہٹ کے ہیں غرض کہ اس جگہہ "صاعقہ" کے معنی موت کے نہیں ہیں بلکہ ٹھیک معنی گرج اور گڑگڑاہٹ کے ہیں خواہ وہ گرج بجلی کی ہو خواہ وہ گڑگڑاہٹ بادل کی ہو یا کسی آتشین پہاڑ کی۔ یہہ کہا جاسکتا ہے کہ جب کہ اسی آیت میں ہے کہ "ثم بعثنا کم من بعد موتکم" تو یہہ ایک قوی ثبوت اس بات کا ہے کہ یہاں، صاعقہ کے معنی موت کے ہیں مگر مفسرین اور خصوصاً امام فخرالدین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ کبھی "بعث" کا اطلاق لابعد الموت بھی ہوتا ہے جیسے کہ خدا نے فرمایا ہے کہ "فضربنا علی اذانهم فی الکهف سنین عددا ثم بعثناهم" پس "بعثنا" کے لفظ سے تو "صاعقہ" کے معنی موت کے لینے پر استدلال نہیں ہوسکتا رہا لفظ "موت" کا اس کی نسبت مفسرین نے نہایت سہل رستہ اختیار کیا ہے، جو ہمکو نہایت ہی مشکل اور پیچیدہ معلوم ہوتا ہے، اُنھوں نے فرمادیا کہ محققین کا یہہ قول ہے کہ "صاعقہ" سے مراد تو سبب موت ہے، اور موت کے معنی موت ہی کے ہیں، خدا نے اُن لوگوں کو جو خدا کو دیکھنے گئے تھے صاعقہ سے جو سبب اُن کی موت کا ہوا مار ڈالا، اور پھر حضرت موسیٰ کی دعا سے اور گڑگڑا کر یہہ کہنے سے کہ یہہ تو ستر کے ستر مر گئے، اب بنی اسرائیل کو میں کیا جواب دونگا، اور میری نبوت کی گواہی کون دیگا، خدا نے اُنکو پھر زندہ کردیا۔

مگر میری سمجھ میں خدائے پاک کا کلام ایسا بودا نہیں ہے، بلکہ جیسا اُسکا قانون قدرت مستحکم اور مضبوط ہے!

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ

ویسا ہی اُس کا کلام بھی مضبوط ہے - جبکہ ہمکو یہہ ثابت ہو گیا کہ صاعقہ، کے معنی، موت کے نہیں ہیں، بلکہ اس مقام پر یہہ بھی نہیں سکتے، اور بعث، کا اطلاق، لا بعد الموت، پر بھی آتا ہے تو ہم لفظ موت کو اُسکے حقیقی معنون پر یعنی بدن سے جان سے نکل جانے پر اطلاق نہیں کر سکتے، بلکہ مردے کی مانند ہو جانے پر اطلاق کرتے ہیں، اور اس کی دلیل خود قرآن مجید میں موجود ہے، اس لیئے کہ جو واقعہ اس مقام پر بیان ہوا ہے وہی واقعہ سورہ اعراف میں بھی آیا ہے، اور وہاں یہہ فرمایا ہے کہ، "فلما اخذتهم الرجفة قال رب لو شئت اهلكتهم من قبل واياى" یعنی بنی اسرائیل میں سے ستر آدمی جو خدا کے دیکھنے کے لئے گئے تھے ڈر کے مارے کانپنے لگے تو حضرت موسیٰ نے کہا کہ اے پروردگار اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی اُنکو اور مجھکو بھی مار ڈالتا، اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اُنکے مرنے تک نوبت نہ پہونچی تھی، یا بیہوش ہو گئے تھے یا اُنکی حالت مردے کی سی ہو گئی تھی، اور اسی سبب سے یہان اُنپر مردہ کا اطلاق کیا گیا ہے - علاوہ اسکے حضرت موسیٰ پر بھی پروردگار کی تجلی ہوئی تھی جس کے سبب پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا وہان یہہ لفظ ہیں کہ، "وخر موسى صعقا"، یعنی موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑا، سورہ احزاب* میں خود خدا تعالیٰ نے خوف کی حالت کو موت کی بیہوشی کی حالت سے تشبیہ دی ہے، پس ان سب آیتون کے ملانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر بھی ایسی حالت گذری تھی -

موت کے لفظ کا نہایت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے امام فخر الدین رازی اور صاحب تفسیر ابن عباس نے سورہ زمر کی تینتالیسویں آیت میں لفظ موت کو بمعنی، نوم، قرار دیا ہے اور "حين موتها"، کی تفسیر "تين منامها" کی ہے، اور قرآن مجید میں رنج میں پڑے رہنے پر بھی موت کے لفظ کا استعمال ہوا ہے جہان سورہ آل عمران میں فرمایا ہے کہ، "قل موتوا بغيظكم"، یعنی اپنے غصہ سے مر جاؤ یعنی اُس میں مبتلا رہو، ویسے ہوئے شہر غیر آباد یا فصل گذری ہوئی زمین پر بھی موت کا استعمال ہوتا ہے، بیجان یا معدوم شی پر بھی موت کا لفظ بولا جاتا ہے، جہان فرمایا ہے کہ، "كنتم امواتا فاحياكم ثم يميتكم ثم يحييكم" اور جگہ فرمایا ہے کہ "يخرج الحي من الميت ويخرج الميت من الحي"، غرضکہ جہان تک غور کیا جاتا ہے اس مقام پر لفظ، "موت" کا سے جو قرآن مجید میں آیا ہے

* فاذا جاء الخوف رايتهم ينظرون اليك تدور اعينهم كالذي يغشى عليه من الموت (احزاب) ایت ۱۹

اور چھا دیا ہمنے تم پر بادل

ان لوگون کے فی الحقیقت مرجانے پر استدلال نہیں ہو سکتا۔

یہہ تمام واقعات موسیٰ و بنی اسرائیل پر سینا کے مقام میں گذرے تھے، وہان ایک سلسلہ پہاڑ دنکا ہی جسکو طور سینا یا طور سینین کہتے ہیں، اور کبھی صرف طور، ہی اُسکا نام لیتے ہیں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں وہ کوہ آتش فشان تھا، جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ ہم علانیہ خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں، تو وہ بجز اُسکی قدرت کاملہ کے ایک عظیم الشان کرشمہ کے اور کچھ اُن کو نہیں دکھا سکتے تھے، پس وہ اُن کو اُس پہاڑ کے قریب لے گئے جس کی آتش فشانی اور گڑگڑاہٹ اور زور شور کی آواز اور پتھرون کے اُڑنے کے خوف سے وہ بیہوش یا مردے کی مانند ہو گئے، خدا تعالیٰ اُن تمام کامون کو جو اُس کے قانون قدرت سے ہوتے ہیں خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے، جن کے منسوب کرنے کا بلاشبہہ وہ مستحق ہے، اسی طرح ان واقعات عجیبہ کو بھی اُس نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

اس بات کے آثار کہ کوہ سینا درحقیقت آتش فشان تھا، اب تک پائے جاتے ہیں اور ہر شخص اب بھی جا کر دیکھ سکتا ہے، ایک بہت بڑا عالم شخص یعنی کپتان اسٹینلی حال میں بطور سیاحت اُس وادی میں گئے تھے جہاں سے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل نے گذر کیا تھا، اُنھون نے اس پہاڑ کا حال اسطرح پر لکھا ہے کہ چٹانون کی راہ سے جو بطور زینہ کے بنی ہوئی تھیں ہم ایک وادی میں پہونچے جو سرخ پتھر کے پہاڑون کے درمیان تھا یہان پر عجیب و غریب پہاڑ دیکھنے میں آئے جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا سرخ و سیاہ مادہ کی گرم نہرین اُنپر بہتی ہیں۔ درحقیقت آتشی مادہ اوپر بہہ آیا تھا جبکہ وہ زمین سے اُٹھتے تھے، یہہ راستہ ایسی جگہہ ہو کر گذرتا تھا جہاں بجز جلے ہوئے مادون اور خاکستر کے اور کچھ نہ تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ہتھیار ڈھالنے کے کارخانہ میں ڈھیر ہوتے ہیں، یہان اکثر ایسی چیزین دیکھنے میں آئین جن کو کوئی نیا آدمی آتش فشان پہاڑ کے آثار تصور کرے، لیکن یہہ غلط فہمی ہے، جلے پہاڑون کی مانند جو بڑے بڑے ڈھیر معلوم ہوتے ہیں وہ صرف لوہے کے ریزے ہیں جو بھربھرے پتھرون کی بناوٹ میں ملے ہوئے ہیں، سرخی مائل پتھر کی چٹانیں جو آتشی عمل کے آثار پائے جاتے ہیں، وہ اُنکی ابتدائی اوٹھان سے متعلق ہیں، نہ کسی بعد کے انقلاب سے ہر جگہہ پانی کے عمل کے آثار ہیں آگ کے کہیں نہیں ہیں۔

وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى

کپتان اسٹینلی بہت بڑے پادری اور عیسائی مذہب کے پیشوا ہیں، عیسائیوں کا یہہ عقیدہ ہے کہ درحقیقت خدا ہی آگ کی صورت میں پہاڑ پر اترا تھا، اسلئے اُنھوں نے اپنی تحریر میں اُس پہاڑ کو آتشین پہاڑ کہنے سے بہت بچایا ہے مگر جو شے کہ موجود ہے اسکو کوئی شخص ہیر پھیر کر بیان کرنے سے معدوم نہیں کر سکتا، خود توریت میں جو کچھ اِس پہاڑ کی نسبت بیان ہوا ہے (اگر صحیح تسلیم کیا جاوے) تو کچھ شبہہ نہیں رہتا کہ وہ آتش فشان پہاڑ تھا، کتاب خروج باب نوزدہم میں لکھا ہے کہ "بوقت طلوع صبح رعدہا و برقہا و غمامہ مظلمہ بالاے کوہ نمایاں شد و آواز کرنا بحدے شدید شد کہ تمامی قومی کہ در اُردو بودند لرزیدند ٭ ٭ و تمامی کوہ سینی را دود فرا گرفت ٭ ٭ و دودش مثل دود تنور متصاعد بود و تمامی کوہ بغایت متزلزل شد"، یہہ تمام حالتیں وہ ہیں جو کوہ آتش فشان میں واقع ہوتی ہیں، اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں وہ آتش فشان تھا، اور کپتان اسٹینلی کی یہہ تاویل کہ وہ نشانیاں اُس پہاڑ کی بناوٹ ہی کی ہیں صحیح نہیں ہو سکتی۔

خدا کی تجلی ہر چیز میں ہے جس کو اُس نے اپنی قدرت کاملہ سے بنایا اور پیدا کیا، ہم بلا شبہ کہہ سکتے ہیں کہ "فلما تجلی ربنا علی الجبل، فلما تجلی ربنا علی البحر، فلما تجلی ربنا علی الانسان، فلما تجلی ربنا علی الحمار، فلما تجلی ربنا علی البعوضۃ وما فوقہا، فقد وقع کذا"، مگر کسی مادی یا فانی صورت میں نہ خدا آسکتا ہے نہ سما سکتا ہے پس ہم توریت کے اس لفظ پر کہ "خداوند در آتش بران نزول نمود" یقین نہیں لاسکتے گو کپتان اسٹینلی کو یقین ہو ہاں اگر ان لفظوں کے معنی بھی تجلی اور ظہور قدرت کے لئے جاویں تو پھر مقام انکار نہیں رہتا۔

(۵۴) (وظللنا علیکم الغمام) توریت میں بنی اسرائیل پر بادلوں کی چھاؤں ہونے کا واقعہ عجیب طرح سے لکھا ہے کہ بادل تمام دن بنی اسرائیل[1] کو راہ بتانے کے لئے اُنکے آگے آگے چلتا تھا، اور جہاں ٹھیر جاتا تھا وہاں بنی اسرائیل مقام کرتے تھے، اور رات کو وہی بادل روشنی کا ستون ہو جاتا تھا، مگر اس پر کیونکر یقین ہو سکتا ہے جبکہ چالیس برس تک بنی اسرائیل کو منزل مقصود تک پہونچنے کا رستہ نہیں ملا۔ ہمارے علما مفسرین نے بھی اپنی عادت کے موافق یہودیوں کی پیروی کی ہے اور اس آیت کی تفسیر میں

[1] دیکھو کتاب خروج باب ۱۳۔ ورس ۲۱ و ۲۲ و باب ۴۰ ورس ۳۶-۳۸

اور اوتارا ہمنے تم پر من وسلویٰ

ایسی قسم کی باتیں جن کا اشارہ تک اس آیت میں نہیں ہے بیان کی ہیں۔

قرآن مجید سے بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ بادل کا پھرنا نہیں معلوم ہوتا ہے، اس آیت سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت دھوپ اور گرمی کی سختی میں بادل آجانے سے خدا نے انکی تکلیف کو دور کردیا، جس کا بطور ایک احسان کے ذکر کیا ہے۔ بڑی غلطی لوگوں کے خیال میں یہہ ہے کہ جو امور موافق قانون قدرت کے ظہور میں آتے ہیں، اُنکو نہ معجزہ سمجھتے ہیں، نہ احسان جتلانی یا ماننے کے قابل جانتے ہیں، اور اس لئے اُس میں بالطبع ایسی باتیں شامل کرلیتے ہیں جو قانون قدرت سے خارج ہوں حالانکہ خدا تعالیٰ نے تمام قرآن مجید میں جابجا بندوں پر انھی باتوں سے اپنا احسان جتلایا ہے اور انھی کو بطور معجزہ کے جتلایا ہے، جن کو اُس نے اپنی قدرت کاملہ سے موافق قوانین قدرت کے پیدا کیا ہے۔

جب بنی اسرائیل بحر احمر کی شاخ کو پار کر گئے، جسکا پانی بسبب جوار بھاٹے کے اُترتا چڑہتا رہتا تھا، تو اُس پار پتھر اور ریگستان کا ایک مسطح بیابان ہے، وہان اکثر ریگ کا طوفان رہتا ہے جو اُس ملک کے ساتھ مخصوص ہے، اور حال کے سیاحوں نے بھی اُسکو دیکھا ہے، اس ریت کے میدان میں دھوپ کی شدت سے بنی اسرائیل کو بڑی تکلیف ہوئی ہوگی، خصوصاً اس وجہ سے کہ ریت بھی بھوبل کی مانند گرم ہوگی جس پر چلنا اور بیٹھنا نہایت مشکل ہوگا، ایسے وقت میں ابر کا آجانا بلاشبہہ بنی اسرائیل کے حق میں بہت بڑی نعمت تھی، جسکو اس مقام پر بطور احسان کے خدا نے یاد دلایا ہے۔

(من وسلوی) من ایک چیز ہے جو بطور ترنجبین کے ایک خاص قسم کی جھاڑیوں پر جم جاتی ہے، اور سلویٰ بٹیر کی قسم کا جانور ہے، جو اُس جنگل میں جہان بنی اسرائیل گئے تھے بکثرت پایا جاتا تھا اور وہان وہی اُن کی غذا تھی، پس اُسی کا ذکر قرآن مجید میں ہے، باقی عجائبات من کے جو توریت میں بیان ہوئے ہیں اور جن پر یقین کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے کہ قانون قدرت سے انکار کرنا، انکا کچھ ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے، گو مفسرین نے اور انبیاء کے قصے لکھنے والون نے یہودیون کی پیروی سے اپنی تصنیفات میں اُن کا ذکر کیا ہے۔

حال کے سیاحون نے بھی اُس جنگل میں، من کو پایا ہے، کپتن اسٹینلی لکھتے ہیں کہ، "چشمہ

كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٥٤﴾ وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ ۚ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٥﴾ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿٥٦﴾

مرہ سے گذر کر دو وادیاں دیکھیں جس میں سے ایک یقیناً ایلم ہوگی۔ عام صورت اُس وسیع میدان کی یہ تھی کہ ایک ریگستان تھا اور جابجا پانی کے سے راستے جیسے کوئی دریا خشک ہوجاتا ہے بنے ہوئے تھے۔ اُن وادیوں کے راستہ راستہ جاکر عجیب سیاہ و سفید پہاڑ ملتے ہیں۔ یہ بیابان بغیر درخت اور گھاس کے تھا لیکن اُن دو وادیوں میں جن پر ایلم کا شبہ ہوتا ہے، درخت اور جھاڑیاں موجود تھیں۔ یہاں کے کھجور کے درخت چھوٹے چھوٹے تھے، اور یہاں پر "ترنبک" کے درخت بھی تھے جن کے پتوں پر وہ شے پائی جاتی ہے جس کو اہل عرب "من" کہتے ہیں۔"

(۵۵) (واذقلنا ادخلوا) اس آیت میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ حضرت موسیٰ کے وقت کا قصہ نہیں ہے، بلکہ بنی اسرائیل کا حال ہے، جب کہ وہ حضرت یوشع کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے تھے اُس شہر کا نام قرآن مجید میں مذکور نہیں ہے مگر قدیم نام اُسکا "یریحو" ہے جسکو یونانی میں "جریکو" کہتے ہیں اور مسلمان مفسروں نے اُس کو "اریحا" لکھا ہے۔

(وادخلوا الباب سجدا) سجدہ سے مراد حقیقی سجدہ کرنا نہیں ہے جس میں ماتھا زمین پر ٹیکنا ہوتا ہے، بلکہ خضوع و خشوع سے خدا کا شکر کرتے ہوئے داخل ہونا مراد ہے۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ "المراد بہ الخضوع و ھو الاقرب" یعنی سجدہ سے مراد عاجزی ہے

کھاؤ پاکیزہ چیزون میں سے جو کچھ ہمنے تم کو دیں ہیں اور اُنھون نے ہمارا کچھ نقصان نہیں کیا بلکہ اپنا آپ نقصان کرتے تھے ﴿۵۴﴾ اور (یاد کرو) جب ہمنے کہا کہ اس شہر میں جاؤ پھر اُس میں سے سیر ہو کر کھاؤ جہان چاہو اور دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے گھسو اور کہو کہ ہم معافی چاہتے ہیں، ہم تمھارے قصور معاف کر دینگے اور اچھے لوگون کو زیادہ دینگے ﴿۵۵﴾ پھر ظالمون نے اُس کے سوا جو ہمنے اُنسے کہی تھی بات بدلدی، پھر ہمنے اُن پر جنھون نے ناانصافی کی تھی آسمان سے بُرائی بھیجی اسلئے کہ وہ بُرے کام کرتے تھے ﴿۵۶﴾

اور یہی معنی اس جگہہ زیادہ اچھے ہیں۔

﴿۵۶﴾ (فبدل) اس تبدیل سے کسی لفظ کا بدل دینا مراد نہیں ہے، کیونکہ اُن کو الفاظ نہین بتائے گئے تھے، بلکہ استغفار یعنی گناہون سے معافی چاہنے کا حکم تھا، مگر اُنھون نے اُس حکم کو بدل ڈالا، اور توبہ و استغفار کی کچھ پروا نہ کی، بلکہ فتح کے سبب مغرور و متکبر ہوگئے، امام فخر الدین رازی نے بھی یہ معنی اختیار کئے ہیں، چنانچہ اُنھون نے لکھا ہے کہ "لما امروا بالتواضع وسوال المغفرة لم یمتثلوا امر الله ولم یلتفتوا الیه،" یعنی جبکہ اُنکو تواضع اور استغفار کرنے کا حکم دیا گیا تھا تو اُنھون نے اللہ کے حکم کی تعمیل نہ کی، اور اُس پر التفات نہ کیا، اور بیضاوی میں بھی یہی مطلب تسلیم کیا گیا ہے کہ،، بدلوا بما امروا به من التوبة والاستغفار طلب ما یشتهون من اعراض الدنیا، یعنی اُنھوں نے بدل دیا حکم توبہ و استغفار کا جو اُن کو دیا گیا تھا دنیاوی چیزون کے چاہنے سے جس کے وہ خواہشمند تھے؛

﴿۵۷﴾ (فانفجرت) اس آیت میں بھی ایک امر بحث کے لایق تھا کہ پانی کے بارہ چشمے کیونکر پیدا ہوئے تھے اور اس بحث کو ہمنے سینتالیسوین آیت ✝ کی تفسیر میں بالاستیعاب بیان کیا ہے، پہلے اُس ملک کو

✝ دیکھو صفحہ ۹۳ لغایت ۹۸۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (۵۷) وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ

اہل عرب حجر کہتے ہیں جیسے کہ عرب الحجر یعنی عرب کا پہاڑی حصہ اسی طرح "فاضرب بعصاک الحجر" میں لفظ حجر کا استعمال ہوا ہے، بحر احمر کی شاخ کو عبور کرنے کے بعد ایک وادی ملتا ہے جس کا قدیم نام ایشام ہے وہاں پانی نہیں ملتا توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک چشمہ تھا جس کا پانی نہایت تلخ تھا اور پی نہیں سکتے تھے اسی لئے اسکا نام "مرہ" رکھا ہے حال کے زمانہ کے سیاحوں نے بھی وہاں ایک چشمہ پایا ہے جسکو وہ مرہ خیال کرتے ہیں، یہی مقام ہے جہاں بنی اسرائیل نے حضرت موسی سے پانی مانگا تھا اس مقام کے پاس پہاڑیاں ہیں جن کی نسبت خدا نے حضرت موسی سے کہا کہ "فاضرب بعصاک الحجر" یعنی اپنی لاٹھی کے سہارے سے اس پہاڑی پر چڑھ چل، "اس پہاڑی کے پرے ایک مقام ہے جسکو توریت میں "ایلم" لکھا ہے وہاں بارہ چشمے پانی کے جاری تھے جسطرح پہاڑی ملک میں پہاڑوں کی جڑ یا چٹانوں کی دراڑوں میں سے جاری ہوتے ہیں جنکی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ"

اور یاد کرو اُس وقت کو) جبکہ موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی چاہا تو ہمنے کہا کہ چل اپنی لاٹھی کے سہارے سے اس چٹان پر اُس سے پھوٹ نکلے ہیں بارہ چشمے، بیشک جان لیا ہر شخص نے اپنا گھاٹ کھاؤ اور پیو خدا کے دئے ہوئے رزق میں سے اور مت پھرو زمین میں (یعنی ملک میں) فساد مچاتے (۵۷) اور (یاد کرو) جبکہ تمنے کہا کہ اے موسیٰ ہم ایک کھانا کھانے پر صبر نہ کرینگے پس اپنے پروردگار سے ہمارے لئے مانگ کہ پیدا کرے ہمارے لئے اُن چیزوں میں سے جن کو زمین اگاتی ہے اُس کے ساگ اور اُسکی ککڑی اور اُسکے گیہوں اور اُسکی مسور اور اُسکی پیاز میں سے، موسیٰ نے کہا کہ کیا بدلتے ہو اُسکو جو گھٹیا ہے اُس سے جو اچھا ہے، اُترپڑو کسی شہر میں پھر بیشک تمھارے لئے وہ چیز ہے جو تم مانگتے ہو، اور ڈالی گئی اُنپر

،، فانفجرت منه اثنتا عشرة عينا ،، یعنی اُس سے پھوٹ نکلے ہیں بارہ چشمے اگر ہم توریت کی عبارت پر یقین کریں تو اُس سے بھی پایا جاتا ہے اور اُس کی یہہ عبارت ہے کہ ؂ بعد از ان به ایلیم آمدند و در انجا دوازده چشمهٔ آب یافتند و هفتاد درخت خرما بود و در انجا به پهلوے آب اردو زدند،،

یہہ مقام اب بھی موجود ہے، اور سیاحوں نے دیکھا ہے مگر اب وہاں پانی کے چشمے نہیں بہتے کیونکہ پہاڑی چشمے انقلاب زمانہ سے سوکھ جاتے ہیں، جیسے کہ مکہ معظمہ میں زمزم کا چشمہ خشک ہوگیا ہے، مگر ایسے مقاموں کو ہمیشہ لوگ مقدس سمجھتے ہیں، اور اس کی یادگار یا نشان قایم رکھنے کو وہاں کنوئیں کھود دیتے ہیں، جس طرح کہ مکہ معظمہ میں چاہ زمزم کھودا گیا ہے، اُس مقام پر بھی جہاں حضرت موسیٰ کو بارہ چشمہ پانی کے ملے تھے، لوگوں نے کسی زمانہ میں کنوئیں کھود دئے ہیں، اور اب وہاں سترہ کنوئیں موجود ہیں، اور وہ مقام عیون موسیٰ کے نام سے مشہور ہے، اس مقام پر بھی تمرسک کے درخت ہوتے ہیں جنکے پتوں پر من جم جاتا ہے۔

؂ کتاب خروج باب ۱۵- ورس ۲۷-

الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۵۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۵۹﴾

(۵۸) (واذ قلتم یاموسیٰ) اس آیت کی تفسیر میں مفسرون نے دو زمانے کی جدا جدا باتون کو خلط ملط کر دیا ہے، یہہ بہت لمبی آیت ہے اور اِسکے جداگانہ دو حصے ہیں، ایک حصہ اُس سوال وجواب کا ہے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ سے کیا تھا، اور دوسرا حصہ اُن واقعات کا ہے جو بعد حضرت موسیٰ بلکہ اُس سے بھی بہت زمانہ کے بعد بنی اسرائیل پر واقع ہوئے تھے۔

جن جنگلون اور میدانون میں بنی اسرائیل پڑے پھرتے تھے، وہان بجز جنگل کے جانورون کو شکار کے یا اُس مویشی کے گوشت کے جو بنی اسرائیل کے ساتھ تھے اور کوئی چیز کھانے کو میسر نہ ہوتی تھی، اور ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے کھاتے بنی اسرائیل دق ہو گئے تھے، جسکی شکایت اُنھون نے حضرت موسیٰ سے کی، اور زمین کی پیداوار کھانی مانگی، جو شکار کے گوشت یا پالو جانورون کے گوشت سے ادنیٰ درجہ کی تھی، حضرت موسیٰ کا اصلی مقصد فلسطین میں جانا اور وہان کے شہرون پر قبضہ کرنیکا تھا، مگر بنی اسرائیل عمالقیون اور کنعانیون سے ڈرتے تھے، اور لڑنے اور ملک کے فتح کرنے پر آمادہ نہوتے تھے پس جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے زمین کی پیداوار کا کھانا ملنے کی خواہش کی تو اُنھون نے جواب دیا کہ کسی شہر میں چل پڑو اور جا اترو وہان سب کچھ ملیگا، پس اس سے یہہ سمجھنا کہ اُنکے سفر میں کوئی شہر پڑا تھا اور حضرت موسیٰ نے یا خدا نے اُس میں اُترنے کا حکم دیا تھا ایک صریح غلط فہمی ہے۔

دوسرا حصہ آیت کا اُن واقعات کے بیان میں ہے، جبکہ بنی اسرائیل فلسطین میں پہونچ گئے اور شہرون کو فتح کر لیا اور اُس میں آباد ہو گئے، اور پھر اُن کی بدیون اور برائیون اور انبیاء کے قتل

ذلت اور مسکنت اور مستحق ہوئے اللہ کے غصہ کے اور یہہ اسلئے کہ وہ نہ مانتے تھے اللہ کی نشانیوں کو اور مار ڈالتے تھے پیغمبرونکو ناحق، اور یہہ اسلئے ہوا کہ اُنھوں نے نافرمانی کی، اور وہ حد سے تجاوز کر جاتے تھے (۵۸) اس میں کچھ شک نہیں کہ جو ایمان لائے ہیں اور جو لوگ یہودی ہوئے ہیں اور عیسائی اور صائبین جس نے یقین کیا اللہ اور اخیر دن پر اور اچھے عمل کئے تو انکے لئے انکی مزدوری اُنکے پروردگار کے پاس ہے اور نہ اُنکو کچھ اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہونگے (۵۹)

کے سبب اُنپر آفت پڑی، اور ذلیل و خوار اور مسکین بے یار و مددگار ہوگئے اور باوجودیکہ اُن میں سے بادشاہ ذی شان پیدا ہوئے، مگر تمام قوم میں سے وہ شان و شوکت یک لخت جاتی رہی اور اسوقت تک انکا یہی حال ہے۔

(۶۰) (ورفعنا) یہہ مضمون دو مقام میں آیا ہے ایک تو اسی آیت میں ہے کہ، ہمنے تمھارے اوپر پہاڑ کو اونچا کیا، اور سورہ اعراف میں یہہ لفظ ہیں، ''واذ نتقنا الجبل فوقھم کانہ ظلۃ وظنوا انہ واقع بھم'' ان دونوں مقاموں میں چار لفظ ہیں جن کے معنی حل ہونے سے مطلب سمجھ میں آویگا۔ رفع۔ فوق۔ نتق۔ ظلۃ

''رفع'' کے معنی اونچا کرنیکے ہیں، مگر اس لفظ سے یہہ بات کہ جو چیز اونچی کی گئی ہے وہ زمین سے بھی معلق ہوگئی ہو لازم نہیں آتی دیوار اونچا کرنیکو بھی ''رفعنا'' کہہ سکتے ہیں حالانکہ وہ زمین سے معلق نہیں ہوتی۔

''فوق'' کے لفظ کو بھی اُس شے کا زمین سے معلق ہونا لازم نہیں ہے۔

''نتق'' کا لفظ البتہ بحث طلب ہے جسکے معنی مفسرین نے مذہبی عجائبات بنانیکو، قلع کے بھی لئے ہیں، جس کو زمین سے یا جگہہ سے علیحدہ کرلینا لازم ہے، اور رفع کے بھی لئے ہیں جس کو علیحدہ کرلینا لازم نہیں ہے، بیضاوی میں لکھا ہے، ''واذ نتقنا الجبل فوقھم'' ای قلعناہ ورفعناہ'' مگر قاموس میں اُسکے معنی ہلادینے کے لکھے ہیں، ''نتقہ زعزعہ'' اور ''زعزع'' کے معنی ہلادینے کے ہیں، ''الزعزعۃ تحریک الریح الشجرۃ ونحوھا او کل تحریک شدید'' یعنی زعزع کے معنی ہوا کا درخت کو ہلانے کے ہیں اور ہر جنبش شدید کو بھی زعزعہ کہتے ہیں پس صاف طور سے ''نتقنا'' کے معنی ہلادینے کے ہیں یعنی ہمنے پہاڑ کو ہلادیا اور الفاظ'' وظنوا انہ واقع

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۰﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿۶۱﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۲﴾

یھو" زیادہ تر پہاڑ کے ہلا دینے کے جس سے انکو اُس کے گر پڑنے کا گمان ہوا مناسب ہیں۔

"ظلہ" کے معنی سائبان کے بھی ہو سکتے ہیں، چھتری کے بھی ہو سکتے ہیں، اور جو چیز کہ ہم پر سایہ ڈالے اُس کے بھی ہو سکتے ہیں، اور اُس چیز کا زمین سے معلق ہمارے سر پر ہونا ضرور نہیں ہے۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے "الظلة کل ما اظلك من سقف بيت او سحابة او جناح حايطة" یعنی ظلہ ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو سایہ ڈالے گھر کی چھت ہو یا ابر کا ٹکڑا یا احاطہ کا بازو یعنی دیوار۔ پس ظلہ کے لفظ سے بھی یہہ بات لازم نہیں آتی کہ وہ معلق سر کے اوپر ہو۔

اب غور کرنا چاہیئے کہ واقعہ کیا تھا، بنی اسرائیل جو خدا کے دیکھنے کو گئے تھے طور یا طور سینین کے نیچے کھڑے ہوئے تھے، پہاڑ اُنکے سر پر نہایت اونچا اوٹھا ہوا تھا، وہ اُسکے سایہ کے تلے تھے اور طور بسبب آتش فشانی کے شدید حرکت اور زلزلہ میں تھا، جس کے سبب وہ گمان کرتے تھے کہ اُن کے اوپر گر پڑیگا پس اُس حالت کو خدا تعالیٰ نے اِن لفظوں میں یاد دلایا ہے کہ "ورفعنا فوقكم الطور"، "نتقنا الجبل فوقهم كانه ظلة وظنوا انه واقع بهم" پس اِن الفاظ میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو عجیب ہو یا مطابق واقع اور موافق قانون قدرت نہو، ہاں مفسرین نے اپنی تفسیروں میں اس واقعہ کو عجیب و غریب واقعہ بنا دیا ہے اور ہمارے مسلمان مفسر (خدا اُن پر رحمت کرے) عجائبات دور از کار کا ہونا مذہب کا فخر اور اسکی عمدگی

اور یاد کرو جبکہ ہمنے تمہارا قول لیا اور ہمنے تمہارے اوپر پہاڑ کو اونچا کیا کہ پکڑو جو چیز کہ تم کو دی جاتی ہے مضبوطی سے اور یاد رکھو جو کچھ اُس میں ہے تاکہ تم پرہیزگار رہو (۶۰) پھر تم پھر گئے اِس کے بعد پھر اگر تم پر خدا کا فضل اور اُسکی رحمت نہ ہوتی تو تم ٹوٹے میں پڑنے والوں میں سے ہوتے، اور بیشک تم اُنکو جانتے ہو جنھوں نے تم میں سے سبت کے دن زیادتی کی پھر ہمنے اُنکو کہا کہ ہو جاؤ بندر ذلیل و خوار (۶۱) پھر ہمنے اس واقعہ کو اُس قوم کے لئے جو اُس واقعہ کے زمانہ میں تھی اور اُس کے لئے جو اِس واقعہ کے بعد آویگی بطور عبرت کے بنا دیا اور بطور نصیحت کے پرہیزگاروں کیلئے (۶۲)

سمجھتے تھے، اسلیئے اُنھوں نے تفسیروں میں لغو و بیہودہ عجائبات بھر دی ہیں بعضوں نے لکھا ہے کہ کوہ سینا کو خدا اُنکے سر پر اُٹھا لایا تھا کہ مجھ سے اقرار کرو نہیں تو اسی پہاڑ کے تلے کچل دیتا ہوں، اور بعضوں نے کہا کہ نہیں بیت المقدس کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ کو اُکھاڑ کر ہوا میں اُڑا لایا تھا، اور پانچ میل کا چوڑا اور پانچ میل کا لنبا تھا، اتنی بڑائی اُس کی اس لئے تھی کہ کل لشکر بنی اسرائیل کا اُسکے تلے ایک ہی دفعہ میں کچل جاوے، یہ تمام خرافاتین لغو و بیہودہ ہیں اور خدائے پاک کا کلام پاک ایسی بیہودہ باتوں سے پاک ہے۔

(۶۱) (کونوا قردۃ) ہو جاؤ بندر، اس کی تفسیر میں بھی ہمارے علمائے علما مفسرین نے عجیب و غریب باتیں بیان کی ہیں، اور لکھا کہ وہ لوگ سچ مچ صورت و شکل و خاصیت میں بھی بندر ہو گئے تھے، بعضوں کا قول ہے کہ وہ سب تیسرے دن مر گئے۔ اور بعضے کہتے ہیں کہ یہہ بندر جو اب درختوں پر چڑھتے اور ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر اُچھلتے پھرتے ہیں اُنھی بندروں کی نسل میں سے ہیں۔

مگر یہہ تمام باتیں لغو و خرافات ہیں، خدائے پاک کے کلام پاک کا یہہ مطلب نہیں ہے۔ یہودیوں کی شریعت میں سبت کا دن عبادت کا تھا، اور اُس میں کوئی کام کرنا یا شکار کھیلنا منع تھا، مگر ایک گروہ یہودیوں کا جو دریا کے کنارہ پر رہتا تھا فریب سے سبت کے دن بھی شکار کھیلتا تھا، اُنکی قوم کے مشائخوں نے منع کیا، جب نہ مانا تو اُنکو قوم سے منقطع برادری سے خارج کھانے پینے سے الگ میل جول سے علحدہ

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً
قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا
بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿۶۳﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا
بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿۶۴﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ
يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ
لَمُهْتَدُونَ ﴿۶۵﴾ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا ذَلُولٌ تُثِيرُ
الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيهَا

کردیا، اور وہ توریت پر نہ چلنے والوں کو ایسا ہی کیا کرتے تھے، اور اسی لئے اُنکی حالت بندروں
کی سی حالت ہو گئی تھی، جس کی نسبت خدا نے فرمایا کہ "کونوا قردۃ خاسئین" یعنی جسطرح بندر
بلا پابندی شریعت حرکتیں کرتے ہیں جسطرح انسانوں میں بندر ذلیل و خوار ہیں اسی طرح تم بھی انسانوں
سے علاحدہ اور ذلیل و خوار و رسوا رہو، جس کے سبب اُس زمانے کے لوگوں کو عبرت ہو، اور آیندہ
آنے والے اُنکی ذلت و رسوائی کا حال سُن کر عبرت پکڑیں۔

یہہ کہنا کہ وہ لوگ سچ مچ کے بندر ہو گئے تھے، بجز اہل الجنۃ کے اور کوئی تسلیم نہیں کرسکتا
تھا، اسی سبب سے بعض مفسرین نے بھی اُنکے سچ مچ کے بندر ہوجانے سے

اور (یاد کرو) جبکہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا تمکو حکم دیتا ہے کہ ایک بیل کو ذبح کر ڈالو، بولے
کہ کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے؟ (موسیٰ نے) کہا کہ خدا کی پناہ کہ میں نادانوں میں سے ہو جاؤں
بولے کہ ہمارے لئے اپنے پروردگار سے پوچھ، ہمکو بتاوے کہ وہ کیسا ہے؟ (موسیٰ نے)
کہا کہ وہ یہ کہتا ہے کہ ایک بیل ہے نہ بڈہا اور نہ بچا، اِنکے درمیان درمیان ہے، پھر کرو جو حکم
تمکو دیا گیا ہے (۶۳) بولے کہ ہمارے لئے اپنے پروردگار سے پوچھ، ہمکو بتاوے کہ
کیا اُسکا رنگ ہے (موسیٰ نے) کہا کہ وہ یہ کہتا ہے کہ وہ زرد ڈہڈہاتے رنگ کا بیل
ہے دیکھنے والونکو خوش آتا ہے (۶۴) بولے کہ ہمارے لئے اپنے پروردگار سے پوچھ
ہمکو بتاوے کہ وہ کیا ہے بات یہ ہے کہ ہمکو وہ بیل مشتبہ ہو گیا ہے اور بیشک
اگر خدا نے چاہا تو ہم ٹھیک بات پا لیوینگے (یعنی جس بیل کے ذبح کرنیکا حکم دیا ہے اُسکو
ٹھیک جان لینگے) (۶۵) (موسیٰ نے) کہا کہ وہ یہ کہتا ہے کہ وہ ایک بیل ہے نہ سدہا ہوا زمین جوتنے
کو اور کھیتی میں پانی دینے کو سالم ہے (یعنی کان وغیرہ کٹی ہوئی یا کوئی عضو ناقص نہیں ہے) نہ اُسمیں کوئی
دہبا ہے (یعنی یک رنگ ہے)

انکار کیا ہے جسکو ہم بطور تائید اپنے کلام کے اس مقام پر نقل کرتے ہیں، بیضاوی میں لکھا ہے "وقال مجاهد ما مسخت
صورتهم ولكن قلوبهم فمثلوا بالقردة كما مثلوا بالحمار في قوله كمثل الحمار يحمل اسفارا"، یعنی مجاہد کا قول ہے کہ
انکی صورتیں بندر کی سی نہیں ہو گئیں تہیں، بلکہ اُنکے دل بندروں کے سے ہو گئے تھے اور اسی لئے بندروں کے ساتھ
انکو تشبیہ دی ہے، جیسے کہ خدا نے گدہے کے ساتھ اپنے اس قول میں کہ انکی مثال گدہے کی ہے جس پر کتابیں لدی ہوں تشبیہ دی ہے
(۶۳) (تذبحوا بقرة) یہ قصہ توریت میں بھی ہے* مگر اُس میں بنی اسرائیل کا موسیٰ سے اُسکا اتا پتا پوچھنا مذکور نہیں ہے

* دیکھو کتاب اعداد باب ۱۹ -

قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ (۶۶)
وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (۶۷)

اور اُسکے ذبح کے بعد جو قصہ توریت میں ہے وہ قرآن مجید میں نہیں ہے بہر حال اتنی بات کہ خدا نے ایک بیل کے ذبح کرنیکا حکم دیا قرآن اور توریت دونوں میں موجود ہے" بقرۃ" بالتحریک ومع التا گاے اور بیل دونوں پر بولا جاتا ہے" اور قرآن مجید کے یہ الفاظ کہ" لا ذلول تثیر الارض ولا تسقی الحرث" صاف اُسکے بیل ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ قرآن کے تمام الفاظ سے اور اُن پتوں اور نشانوں سے جو بتائے گئے ہیں صاف پایا جاتا ہے" کہ وہ بیل بت پرستوں یا کافروں کے طریقہ پر بطور سانڈ کے چھوڑا ہوا تھا" تفسیر کبیر میں بھی مسلمہ کی تفسیر" ای وحشیۃ مرسلۃ من الحبس" لکھی ہے" جو ٹھیک چھوڑے ہوئے سانڈ کی ہے" اور اُسی کے ذبح کر ڈالنے کا موسیٰ نے حکم دیا تھا" اور بنی اسرائیل چاہتے تھے کہ وہ ذبح ہونے سے بچ جاوے" اسی لئے اُسکے اتے پتے پوچھتے تھے" پس اس قصہ میں کوئی اعجوبہ بات نہیں ہے" جس بچھڑہ کو بنی اسرائیل نے پوجا تھا اُسکا معدوم کرنا اور جس بیل کو بطور سانڈ کے چھوڑا تھا کہ وہ بھی ایک قسم کی پرستش ہے" اُسکو ذبح کر ڈالنا اُس شرک وکفر کے مٹانیکے لئے تھا" ہمارے مفسرین نے بلاشبہ غلطی کی ہے جو یہہ سمجھا ہے کہ یہہ قصہ اگلی آیت" واذ قتلتم نفساً" سے متعلق ہے۔ اور پہلی آیت کو خدا نے پیچھے کر دیا ہے۔

(۶۷) (واذ قتلتم) اس قصہ کو پہلے قصہ سے کچھ تعلق نہیں ہے" بیل کے ذبح کرنیکا قصہ ختم ہو چکا" یہہ دوسرا قصہ ہے" کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص مارا گیا تھا اور قاتل معلوم نہ تھا" اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے دل میں یہہ بات ڈالی کہ سب لوگ جو موجود ہیں اور انھی میں قاتل بھی ہے مقتول کے اعضا سے مقتول کو ماریں" جو لوگ درحقیقت قاتل نہیں ہیں وہ بسبب یقین اپنی بے جرمی کے ایسا کرنے میں کچھ خوف نہ کرینگے" مگر اصلی قاتل بسبب خوف اپنے جرم کے جو از روے فطرت انسان کے دل میں اور بالتخصیص جہالت کے زمانہ میں اس قسم کی باتوں سے ہوتا ہے ایسا نہیں کریگا" اور اُسیوقت معلوم ہو جاویگا" اور وہی نشانیاں جو خدا نے

:. او(ہذہ القصۃ) ای قصۃ واذ قال موسیٰ لقومہ) قولہ تعالیٰ واذ قتلتم نفسا فادارءتم فیہا وانما فک عنہ وقدمت لاستقلا
(الخ بیضاوی)

بولے اب تونے ٹھیک پتا بتا دیا پھر انھوں نے اسکو ذبح کر ڈالا اور کرتے ہوئے لگتی نہ تھی (۶۶)
اور (یاد کرو) جبکہ تمنے ایک شخص کو مار ڈالا پھر اسکو ایک دوسرے پر دھرنے لگے
اور اللہ اسکو ظاہر کرنے والا ہے جسکو تم چھپاتے تھے (۶۷)

انسان کی فطرت میں رکھی ہیں لوگون کو دکھاوے گا اس قسم کے حیلون سے اس زمانہ میں بھی بہت سے
چور معلوم ہو جاتے ہیں، اور وہ بسبب خوف اپنے جرم کے ایسا کام جو دوسرے لوگ بلا خوف بہ تقویت
اپنی بے جرمی کے کرتے ہیں نہیں کر سکتے، پس یہہ ایک تدبیر قاتل کے معلوم کرنے کی تھی اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھا
ہمارے مفسرین نے ان آیتوں کی یہہ تفسیر کی ہے، کہ پچھلا اور پچھیلا ایک ہی قصہ ہے، اور پچھلی آیتون
میں جو بیان ہوا ہے وہ باعتبار وقوع کے مقدم ہے اور قصہ یون قرار دیا ہے، کہ بنی اسرائیل نے ایک
شخص کو قتل کیا تھا اسکا قاتل معلوم کرنیکو خدا نے ایک بیل کے ذبح کرنیکا حکم دیا اور یہہ کہا کہ اس مذبوح
بیل کے اعضا سے مقتول کو مارو، انکے مارنے سے مقتول زندہ ہو گیا اور اسنے اپنے قاتل کو بتلا دیا۔
مگر اس تفسیر میں متعدد نقصان ہیں، اول تو پچھلی آیتون کو مقدم قرار دینے اور دونون قصون کو ایک
کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ دوسرے "کذلک یحیی اللہ الموتیٰ" کے معنی جب مربوط ہوتے ہیں جب
اسکے پہلے یہہ جملہ "فاحیاہ اللہ" مقدر مانا جاوے، اور ایسے جملہ کو جو خارج از عقل اور خلاف عادت
باری تعالیٰ ہے، اپنی طرف سے بغیر موجود ہونے کسی یقین یا اشارہ صریح کے مقدر ماننا عبارت قرآن
میں اضافہ کرنا ہے تیسرے یہہ کہ باوجود اس اضافہ کے یہہ ماننا پڑیگا کہ "کذلک یحیی اللہ الموتیٰ"
سے مراد احیاء اموات بروز بعث و نشر ہے اور اس جگہہ بعث و نشر کے حال کے بیان کرنیکا کوئی محل و
موقع نہیں ہے اور نہ کوئی مباحثہ بعث و نشر کی بابت ہے۔
جو سیدھے سادے صاف صاف معنی آیتون کے ہمنے بیان کئے ہیں، اور جن میں نہ آیتون کی
ترتیب الٹنی پڑتی ہے اور نہ کسی جملہ خلاف از عقل و بغیر سند نقل کے اپنی طرف سے بڑھانے کی حاجت ہوتی ہے
اور جو صاف طور پر قرآن مجید سے پایا جاتا ہے، شاید اس کی نسبت بھی بعض لوگ کچھ شبہہ کرینگے۔ اول تو یہ کہ "
"اضربوہ" میں ضمیر مذکر کی ہے اور "ببعضہا" میں ضمیر مونث کی اور دونوں کا مرجع ہمنے مقتول ٹھیرایا
ہے۔ مگر یہہ اعتراض کسی طرح صحیح نہیں ہونیکا اس آیت سے پہلے "واذ قتلتم نفسا" واقع ہے

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۸﴾ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۱﴾ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۲﴾

اور بعضہا کی ضمیر نفس کی جانب راجع ہے اور نفس مونث ہے اور اسکے لئے مونث ہی کی ضمیر ہونی چاہیئے "اضربوہ" کی ضمیر کو بھی تمام مفسرین نے نفس ہی کی طرف راجع کیا ہے مگر باعتبار شخص مقتول کے اسکا مذکر لانا جائز قرار دیا ہے چنانچہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے "الہا فی قولہ تعالیٰ فاضربوہ ضمیر وھو اما ان یرجع الی النفس وحینئذ یکون التذکیر علی تاویل الشخص والانسان واما الی القتیل وھو الذی دل علیہ قولہ ما کنتم تکتمون"
دوسرا یہ شبہ کرینگے کہ "یحیی" اور "موتی" کے لفظ کے بھی وہ معنی نہیں لئے جو صریح ان لفظوں سے پائے جاتے ہیں

پھر ہمنے کہا کہ اُسی مقتول کو اُسی کے ٹکڑے یعنی اعضا سے مارو اسطرح اللہ زندہ کر دیتا ہے (یعنی ظاہر کر دیتا ہے) مرے ہوئے (یعنی نامعلوم قاتل) کو اور اپنی نشانیاں تمکو دکھلاتا ہی تاکہ تم سمجھو (۶۸) پھر اسکے بعد بھی تمھارے دل سخت ہوگئے پس وہ پتھر کی مانند ہیں بلکہ اُس سے بھی زیادہ سخت اور ہاں پتھروں میں سے تو ایسا بھی ہے کہ پھوٹ نکلتی ہیں اُس سے نہریں اُنھی میں سے ایسا بھی ہے کہ پھٹ جاتا ہے پھر اُس سے پانی نکلتا ہی اور اُنھی میں سے ایسا بھی ہے کہ خدا کے خوف سے گر پڑتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اُس سے بے خبر نہیں ہے (۶۹)

اے (مسلمانوں) کیا تم اُس بات کی توقع رکھتے ہو کہ (یہودی) تم کو مان لینگے حالانکہ بلا شبہہ اُنھی میں کا ایک گروہ تھا جو خدا کا کلام سنتا تھا اور پھر اُسکو سمجھنے کے بعد بدلدیتا تھا اور خود بھی جانتے تھے (۷۰) اور جب وہ اُن لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے کے پاس اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا تم اُنسے کہدیتے ہو وہ چیز جو خدا نے تم پر ظاہر کی ہی تاکہ وہ اُسی بات سے جو تمھارے خدا کے پاس سے آئی ہے تم سے حجت کریں کیا تم سمجھتے نہیں (۷۱) کیا وہ نہیں جانتے کہ بیشک اللہ جانتا ہی جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں (۷۲)

ل

مگر یہہ اعتراض ہی صحیح نہوگا اسلئے کہ ہمنے اِن لفظوں کے وہی معنی لئے ہیں جن معنوں میں خود خدا نے اِن لفظوں کو استعمال کیا ہے جہاں فرمایا ہے ✱ وکنتم امواتا فاحیاکم " یعنی تم مردہ یعنی معدوم یا غیر موجود یا نامعلوم تھے پھر ہمنے تم کو زندہ یعنی مخلوق یا موجود یا ظاہر کیا پس اسی دلیل سے ہمنے یہاں سے کے یحیی اور موتی کے یہی معنی لئے ہیں کہ نامعلوم

✱ دیکھو صفحہ ۴۳

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ
فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ
اللّٰهِ لِيَشْتَرُوا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ
وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ ﴿۷۹﴾ وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا
مَّعْدُودَةً قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ
أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۸۰﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ
أَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيئَتُهٗ فَأُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيهَا
خٰلِدُونَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أُولٰٓئِكَ
أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ ﴿۸۲﴾ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ لَا
تَعْبُدُونَ إِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ
الْمَسٰكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ
ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿۸۳﴾

قاتل معلوم ہوگیا ۱۱ اوران معنوں کی صحیح ہونے پر خود اسی مقام میں خدا تعالیٰ نے اشارہ کیا ہے اوپر کی آیت میں لفظ واللہ مخرج
آیا ہے اُسی کے مقابل اس آیت میں یحیی اللہ کا لفظ آیا ہے اوپر کی آیت میں تکتمون کا لفظ آیا ہے اُسی کے مقابل اس آیت میں موتٰی
کا لفظ آیا ہے پس علانیہ ثابت ہے کہ یحیی اللہ سے ظاہر ہونا قاتل کا اور موتیٰ سے نامعلوم یا غیر ظاہر ہونا قاتل کا مراد ہے نہ

اور اُنھی میں بعضے ان پڑہ ہیں لکھنا بھی نہیں جانتے بجز زبانی پڑہنے کے اور وہ کچھ نہیں ہیں بجز اسکے (کہ خدا کی طرف سے اُس کے ہونیکا) گمان کرتے ہیں پھر افسوس ہی اُن لوگون پر جو اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں ایک نوشتہ پھر کہتے ہیں کہ یہہ اللہ کی طرف سی ہی تا کہ لیلیوین اُس کے بدلے تھوڑی سی قیمت پھر افسوس ہی اُنکے لئے اُسپر جو اُنکے ہاتھون نے لکھا اور افسوس ہے اُنکے لئے اُسپر جو وہ کماتے ہیں (۷۳) اور کہتے ہیں کہ بجز چند گنتی کے دنون کے ہمکو آگ نہیں چھونے کی تو اُن سے کہہ کیا تمنے اللہ سے کوئی اقرار لیلیا ہے کہ اللہ اپنے اقرار سے ہرگز خلاف نہیں کرنیکا یا خدا پر وہ بات کہتے ہو جو نہیں جانتے (۷۴) ہان جسنے بُرائی کمائی اور گھیر لیا اُسکو اُسکی خطاؤن نے پھر وہی آگ میں پڑنے والی ہیں وہ ہمیشہ اُس میں رہیں گے (۷۵) اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے وہ جنت میں جانے والے ہیں وہ ہمیشہ اُس میں رہیں گے (۷۶) اور (یاد کرو) جبکہ ہمنے بنی اسرائیل سے قول لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو اور ماباپ کے ساتھ احسان کرو اور قرابت مندون اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ، اور کہو لوگون کے لئے اچھی بات اور پڑہتے رہو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ پھر تم پھر گئے بجز چند کے تم میں سی اور تم پھر جانیوالے ہو (۷۷)

مقتول کا زندہ ہونا خدا اپنی قدرت اور اپنی حکمت کو اُنھی باتوں میں جو انسان روزمرہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں ظاہر کرتا ہی مگر انسان کا خیال اُس پر قناعت نہیں کرتا، اور دور از کار باتون کو پسند کرتا ہے۔

تیسرا شبہہ یہہ کرینگے کہ "کذلک یحیی اللہ الموتی" کے قبل ہمکو یہہ جملہ کہ "فاظھر اللہ" مقدر ماننا پڑیگا، مگر یہہ جملہ نہ خلاف عقل ہی نہ خلاف قرآن اور نہ خلاف سیاق کلام خدا، کیونکہ خود خدا اُسنے فرمایا ہی "واللہ مخرج" برخلاف اُس پہلے جملہ کے کہ نہ وہ زمین کا ہے نہ آسمان کا۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۸﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۹﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ

(۸۱) (واٰتینا عیسی ابن مریم البینات) بینات صفت ہے اور جہاں صرف لفظ بینات ہے وہاں اُسکا موصوف جسکی وہ صفت ہے مقدر رہے پس خدا ہی کے کلام پر غور کر کر موصوف مقدر کو قرار دینا چاہیئے خدا کے کلام میں ہمیشہ بینات کا موصوف آیات کا لفظ آیا ہے جیسے کہ اِسی سورہ میں آنحضرت صلعم کی نسبت فرمایا ہے،، ولقد انزلنا الیک ایات بینات،، اسلئے جو معنی آیات بینات کے ہیں وہی معنی صرف بینات کے بھی ہیں کیونکہ آیات اُسکا موصوف وہاں مقدر رہے اور جو مراد لفظ آیات سے ہے وہی مراد لفظ

اور (یاد کرو) جبکہ ہمنے تمھارا قول لیا کہ آپس میں خونریزی مت کرو اور اپنے لوگوں کو اپنے گھروں سے مت نکالو پھر تمنے اقرار کیا اور تم شاہد ہو (۷۸) پھر تم ہی وہ ہو کہ مار ڈالتے ہو اپنے لوگوں کو اور نکال دیتے ہو اپنے گروہ کو اُنکے گھروں سے اُنپر گناہ اور زیادتی سے ایک دوسرے کے مددگار ہوتے ہو اور اگر وہ غیر قوم کے قیدی ہو کر تمھارے پاس آتے ہیں تو فدیہ دیکر چھوڑا لیتے ہو اور اُنکا نکال دینا بھی تو تم پر حرام ہے پھر کیا ایمان لاتے ہو کتاب کی ایک ٹکڑے پر اور انکار کرتے ہو اُسکے دوسرے ٹکڑے سے پھر کیا سزا ہے اُس شخص کی جو تم میں سے ایسا کرے بجز خواری کے دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دن سخت تر عذاب میں ڈالی جاویں اور جو کچھ تم کرتے ہو اُس سے خدا بے خبر نہیں ہے (۷۹) یہہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے لیلیا ہے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے پھر نہ اُنپر سے عذاب کی تخفیف ہوگی اور نہ اُنکی مدد کی جاوے گی (۸۰) اور بے شبہہ ہمنے دی موسیٰ کو کتاب اور اُسکے بعد پے در پے بھیجے ہمنے پیغمبر اور ہمنے دین عیسیٰ مریم کے بیٹے کو نشانیاں

بینات سے ہے امع اُس صفت کے جسپر لفظ بینات دلالت کرتا ہے۔

(ایۃ) کے معنی لغت میں علامت یعنی نشانی کے ہیں اور علامت ہمیشہ اُس پر جس کی وہ نشانی ہو دلالت کرتی ہے، پس آیت کے معنی دلالت کرنے والے کے ہوئے، جیسے کہ امام فخرالدین رازی نے بھی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھا ہے "ان الایۃ ھو الدالۃ" اور جو کہ قرآن مجید کے فقرے بھی خدا کی

وَاَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ

وحدانیت اور انبیا کی نبوت اور احکام شریعت پر دلالت کرتے ہیں اس لئے اُسکے ہر فقرے کو بھی آیت کہتے ہیں، جیسے کہ تفسیر معالم التنزیل میں" ولقد انزلنا الیک آیات بینات" کی تفسیر میں لکھا ہے، "واضحات مفصلات بالحلال والحرام والحدود والاحکام" اور جبکہ فقرات قرآن پر اسلئے کہ وہ احکام پر دلالت کرتے ہیں آیات کا اطلاق ہوا، تو آیات سے خود احکام بھی جو اُس شخص کے وجود اور عظمت وجلال اور قدرت وسطوت و اختیار پر دلالت کرتے ہیں، جسنے وہ احکام صادر کئے ہیں، مراد لئے جا سکتے ہیں، درحقیقت آیات کے لفظ سے قرآن مجید کی آیتیں یا احکام جو خدا نے اُن آیتوں میں نازل فرمائے ہیں مراد لینا ایک ہی بات ہے

قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال کبھی تو خدا کی جانب سے ہوا ہے، جیسے کہ اس آیت میں" ولقد انزلنا الیک ایات بینات" اور کبھی بطور قول کفار یا اہل کتاب کے ہوا ہے، جیسے کہ اس آیت میں ہے"، "وقالوا لولا یاتینا بایۃ من ربہ" پس جہاں قرآن میں اس لفظ یعنی آیۃ، یا آیات، یا بینات، یا آیات بینات کا استعمال خدا کی جانب ہی سے ہوا ہے، اُس سے ہمیشہ وہ احکام یا نصائح اور مواعظ مراد ہیں، جو خدا تعالیٰ نے بذریعہ اپنے کلام یا وحی کے انبیا پر نازل فرمائے ہیں اُن احکام ومواعظ میں سے بعضے خفی ہیں جن کی حکمت بہ تامل وتدقیق نظر سمجھ میں آتی ہے، اور بعضے ایسے ہیں جو نہایت صاف اور واضح بدیہی ہیں، اسی لئے خدا نے کبھی صرف آیات سے اور کبھی آیات بینات سے اور کبھی زیادہ تر بدیہی ہونے کے سبب سے صرف بینات سے اُنکو تعبیر کیا ہے۔

اِس بیان سے ظاہر ہے کہ، ہم آیات بینات سے جہاں کہ وہ خدا کی طرف سے بولا گیا ہے، وہ چیز مراد نہیں لیتے جسکو لوگ معجزہ یا معجزات کہتے ہیں، گو مفسرین نے نے اکثر مقامات میں بلکہ قریباً کل مقامات میں ان الفاظ سے معجزات ہی مراد لئے ہیں، مگر یہہ غلطی ہے، معجزہ پر آیت یا آیات کا اطلاق ہو نہیں سکتا، کیونکہ معجزہ امر مطلوب پر یعنی اثبات نبوت یا خدا کی طرف سے ہونے پر دلالت نہیں کرتا، اور نہ وہ بصفت بینات موصوف ہو سکتا ہے، اِس لئے کہ اُس میں اگر وہ ہو بھی تو بھی کوئی ایسی وضاحت جس سے اُسکا حق اور واقعی ہونا اور خدا کی طرف سے ہونا پایا جاوی کبھی نہیں ہوتی، صرف احکام ہی ہیں جو بینات کی صفت سے موصوف ہو سکتے ہیں۔

اور ہمنے اُسکی تائید کی روح قدس سے

معجزہ نبوت کے ثبوت کی کیونکر دلیل ہوسکتا ہے؟ اثبات نبوت کے لیئے اول خدا کا وجود اور اُس کا متکلم ہونا اور اُس میں اپنے ارادہ سے کام کرنے کی قدرت کا ہونا اور اُسکا تمام بندون کا مالک ہونا ثابت کرنا چاہیئے۔ پھر اُسکا ثبوت چاہیئے کہ وہ اپنی طرف سے رسول و پیغمبر بھیجا کرتا ہے، پھر یہہ ثابت ہونا چاہیئے کہ جو شخص دعوی نبوت کرتا ہے وہ درحقیقت اُسکا بھیجا ہوا ہے۔ ہم پہلی دو باتون سے قطع نظر کرتے ہیں کیونکہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں ایسے مقامات پر اکثر اہل کتاب مخاطب ہیں جو اُن دونوں پہلی باتونکو مانتے تھے، اور اس لئے معجزات سے صرف تیسری بات کا ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے۔

مگر وہ تیسری بات بھی معجزے سے ثابت نہیں ہوسکتی۔ قاضی ابی الولید محمد بن رشد نے اپنی کتاب میں جسکا نام "کتاب الکشف عن مناہج الادلہ فی عقائد الملۃ" ہے بعثت انبیائ پر نہایت لطیف مباحثہ لکھا ہے، جسکا ماحصل ہم بھی اس مقام پر لکھتے ہیں، انھون نے لکھا ہے کہ خدا کی طرف سے رسولون کے آنے میں دو چیزیں غور طلب ہیں۔ اول رسول کے ہونے کا ثبوت۔ دوسرے وہ چیز جس سے ظاہر ہو کہ یہہ شخص جو رسول ہونے کا دعوی کرتا ہے رسولون میں سے ایک رسول ہے، اور اپنے دعوی میں جھوٹا نہیں ہے۔ انسانون میں سے ایسے انسان کے ہونے پر متکلمین نے دنیا کے حالات پر قیاس کر کر استدلال کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہہ بات تو ثابت ہوچکی ہے، کہ اللہ تعالی متکلم ہے اور صاحب ارادہ، اور بندون کا مالک ہے، اور دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ ایسا شخص مجاز ہے کہ اپنے مملوک بندون کے پاس اپنا ایلچی یا رسول بھیجے، تو خدا کی نسبت بھی ممکن ہے کہ اپنے بندون پاس اپنا رسول بھیجے۔ اور یہہ بات بھی دنیا میں دیکھی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ میں بادشاہ کا ایلچی ہوں اور بادشاہی نشانیاں اُسکے پاس ہون تو واجب ہوتا ہے کہ اُسکا ایلچی ہونا قبول کیا جاوے۔ متکلمین کہتے ہیں کہ یہہ نشانیاں رسولون کے ہاتھ سے معجزون کا ہونا ہے۔ ابن رشد فرماتے ہیں کہ یہہ دلیل عام لوگون کے لئے کسیقدر مناسب ہو، مگر جب غور سے دیکھا

أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ﴿٨١﴾ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَل لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٢﴾ وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُم مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ ۚ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٨٣﴾

جاوے تو ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ جو شخص بادشاہ کے ایلچی ہونیکا دعوی کرتا ہے اُسوقت تک اُسکو سچا نہیں مانا جاسکتا جب تک کہ یہہ نہ معلوم ہو کہ جو نشانیاں وہ دکھاتا ہے وہی نشانیاں بادشاہ کے ایلچی ہونے کی ہیں، اور یہ بات دو طرح سے ہو سکتی ہے یا تو خود بادشاہ نے اپنی رعیت سے کہدیا ہو کہ جس شخص کے پاس تم میری اِن خاص نشانیوں کو دیکھو تو اُسکو میرا ایلچی یا رسول جانو یا بادشاہ کی عادت سے یہہ بات معلوم ہو گئی ہو کہ وہ ایسی نشانیاں بجز اپنے ایلچی یا رسول کے اور کسی کو نہیں دیتا، جبکہ یہہ بات ہے تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی کہ بعض انسان کی ہاتھ سے معجزوں کا ہونا رسول ہونے کی خاص نشانی ہے کیونکہ دو حال سے خالی نہیں، یا یہ بات شرع سے جانی گئی ہو گی یا عقل سے، شرع سے جاننا تو غیر ممکن ہے کیونکہ شرع تو رسول ثابت ہونے کے بعد ٹھیرے گی اور اب تک رسول ہونا ہی ثابت نہیں ہوا ہے اور عقلاً بھی اسبات کا قرار دینا کہ یہ نشانیاں مخصوص رسولوں کی ہیں غیر ممکن ہے ہاں اگر وہ نشانیاں بہت سی دفعہ اُنہیں لوگوں سے ظاہر ہوتیں جو رسول ہونیکا دعوی کرتے ہیں، اور اُنکے سوا اور کسی سے نہ ہوئی ہوتیں تو جو لوگ رسولوں کے ہونے کو مانتے ہیں اُنکے لئے دلیل ہو سکتی، اور اُسوقت یہہ کہا جاسکتا کہ اس شخص نے جو رسول ہونیکا دعوی کرتا ہے معجزے دکھائے ہیں، اور جو شخص کہ معجزے دکھاتا ہے وہ رسول ہوتا ہے، اور اسلئے یہہ شخص بھی رسول ہے، مگر یہہ ماننا کہ اس شخص نے جو رسول ہونیکا دعوی کرتا ہے معجزے دکھائی ہیں اُسیوقت ہو سکتا ہے جبکہ اول تسلیم کرلیا جاوے کہ ایسی باتیں انسان سے ہو سکتی ہیں اور درحقیقت اُنکا ہونا

کیا جب کبھی کوئی پیغمبر تمھارے پاس وہ چیز لایا جسکو تمھارا جی نہ چاہتا تھا تو تم نے اُس سے سرکشی نہیں کی پھر ایک گروہ کو تمنے جھٹلایا اور ایک گروہ کو تمنے مار ڈالا (۸۱) اور بولی کہ ہمارے دل (ایمان سے) ڈہکے ہوئے ہیں (نہیں) بلکہ اُنپر اُنکے کفر کے سبب اللہ نے لعنت کی ہی پس ذرا بھی ایمان نہ لائینگے (۸۲) اور جب اُنکے لئے اللہ کے پاس سی کتاب (یعنی قرآن) آئی سچ بتانیوالی اُس چیز کو جو اُنکے پاس ہی (مانا نکہ اُس سے پہلے اُسی سے) اُن لوگوں پر جو کافر تھے فتح پانی چاہتے تھے پھر جب اُنکے پاس آئی وہ چیز جسکو وہ جانتے تھے اُس سی انکار کیا پس لعنت ہی خدا کی انکار کرنیوالونپر (۸۳)

بخوبی محسوس ہوا ہو، اور یقین ہو گیا ہو کہ وہ کسی لاگ سے اور کسی حکمت سے اور خواص اشیاء سی نہیں ہوئیں، اور جو دکھائی دیا ہے وہ ڈہٹ بندی نہتی بلکہ حقیقت میں واقع ہوا ہے۔ اور یہہ کہنا کہ جو شخص معجزے دکھاتا ہے وہ رسول ہوتا ہے جب صحیح ہو گا کہ پہلے رسولوں کا وجود اور یہہ بات کہ وہ معجزے بجز رسولوں کے اور کسی نے نہیں دکھائے مان لیا جاوے، کیونکہ اس قسم کی منطقی دلیل کا جس میں دو مقدمے ملاکر نتیجہ نکالا جاتا ہے یہہ خاصہ ہے کہ وہ دونوں مقدمے مان لئے گئے ہوں، مثلاً جس شخص کے سامنے یہہ دلیل کی جاوے کہ "العالم محدث" تو ضرور ہے کہ اُسکو یہہ بات معلوم ہو کہ عالم موجود ہے اور محدث بھی ہے، پس اب ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ یہہ بات جو شخص معجزے دکھاتا ہے وہ رسول ہوتا ہے کہاں سے ثابت ہوئی ہے کیونکہ اب تک رسالت ہی کا وجود ثابت نہیں ہوا ہے، اور دو مقدموں کو ملاکر نتیجہ نکالنے کے لئے اول اُن دونوں کا ثابت ہو جانا ضرور تھا۔ اور یہہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ جب رسولوں کا ہونا عقلاً ممکن ہے تو اُنکے ہونے پر عقل دلالت کرتی ہے کیونکہ وہ امکان اس قسم کا امکان نہیں ہے جو موجودات کی طبیعت میں پایا جاتا ہے جسطرح کہ ہم کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ مینہہ برسے اور نہ برسے، اسلئے کہ جو امکان موجودات کی طبیعت میں مانا جاتا ہے وہ اسلئے مانا جاتا ہے کہ وہ شے کبھی موجود ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی ہی جیسے کہ مینہہ کا حال ہے کہ کبھی برستا ہے اور کبھی نہیں برستا اور

ف،، فقلیلا ما یومنون یعنی لا یومنون قلیلا ولا کثیرا و یقال ما یومنون بقلیل ولا بکثیر (تفسیر ابن عباس)

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ یَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْیًا اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ﴿۸۴﴾ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَ یَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِیَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۸۵﴾

اسلئے عقل بطور قاعدہ کلیہ کے یہہ بات کھتی ہے کہ مینہہ کا برسنا ممکن ہے۔ اور واجب کا حال اسکے برخلاف ہے اور وہ وہ ہے جو ہمیشہ موجود اور محسوس ہو اور اسلئے اُسکی نسبت عقل بطور قاعدہ کلیہ کے یہہ بات کھتی ہے کہ اُسکا متغیر ہونا اور بدلجانا ممکن نہیں ہ پس جو شخص کسی ایک رسول کے ہونیکا بھی قایل ہوگیا ہو تو اُسکے مقابل میں کھا جاسکتا ہے کہ رسولوں کا ہونا ممکن ہے، اگر جو شخص رسول ہونیکا قایل ہی نہ ہو تو اُسکے مقابل میں اُسکا امکان کھنا جہالت ہیء اور لوگوں کی طرف سے ایلچی کا ہونا ممکن مانا گیا ہے، تو اس سبب سے مانا گیا ہے کہ اُنکے ایلچیوں کا وجود ہمنے پایا ہے، اگر یہہ کہا جاوے کہ لوگوں کی طرف سے ایلچیوں کے وجود کا ہونا اسبات کی دلیل ہے کہ خدا کی طرف سے بھی رسولوں کا ہونا ممکن ہو جیسے کہ عمرو کے ایلچی کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ زید کی طرف سے بھی ایلچی کا ہونا ممکن ہے تو یہہ بھی ٹھیک نہیں ہوگا اسلئے کہ ایسی صورت میں عمرو اور زید دونوں کی طبیعتوں کا مساوی ہونا ضرور ہے اور یہہ مساوات خدا اور بندوں میں نہیں ہے، اور اگر آیندہ کے لئے رسول ہونیکا امکان فی نفسہ مان لیا جاوے، تو یہہ تسلیم ایک امکانی امر کی تسلیم ہوگی نہ اُسکے وقوع کی، اور یہہ نہ معلوم ہوگا کہ اُسنے بھیجا بھی ہے یا نہیں، جیسے کہ اسبات میں شک ہوتا ہے کہ عمرو نے کسی گذشتہ زمانہ میں ایلچی بھیجا ہے یا نہیں، اور آیندہ زمانے میں بھیجنے میں شک کرنا کہ آیندہ بھی وہ بھیجیگا یا نہیں گذشتہ زمانیکے

بری چیز ہے جو کچھ کہ آپ اُنھوں نے اپنے لئے لی کہ انکار کریں اُس چیز سے یعنی قرآن سے جسکو خدا نے بھیجا ہے اِس ضد سے کہ خدا اُسکو بھیجے اپنے فضل سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے پھر مستحق ہوئے غصہ پر غصہ کے اور کافروں کیلئے سخت عذاب ہی (۸۴) اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اُس چیز پر ایمان لاؤ جو خدا نے بھیجی ہی تو کہتے ہیں کہ ہم تو اُس پر ایمان لائے ہیں جو ہمپر اُتری ہی اور اُسکے سوا کسی کو نہیں مانتے حالانکہ وہ سچ ہی اور سچ بتاتی ہی اُس چیز کو جو اُنکے پاس ہی (اے محمد) تو اُن سے کہہ (کہ اگر تم اُسی کو مانتے ہو جو تمھارے پاس ہی) تو پھر تم نے کس لئے اگلے زمانے میں اللہ کے نبیوں کو مار ڈالا اگر تم ایمان والے تھے (۸۵)

شک کرنے سے بالکل مختلف ہے۔ پھر جب ہمکو یہہ بات معلوم نہیں ہے کہ زید نے گذشتہ زمانہ میں کوئی ایلچی بھیجا ہے یا نہیں تو ہمکو یہہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ جسکے پاس زید کی نشانیاں ہوں وہ زید کا ایلچی ہے جب تک کہ ہم یہہ نہ جان لیں کہ یہہ نشانیاں اُسکے ایلچی ہونے کی نشانیاں ہیں" اور یہہ بات جب ہوگی جب ہم جان چکے ہوں کہ اُسنے اپنا ایلچی بھیجا ہے۔ پس جب کہ ہمنے یہ تسلیم بھی کر لیا کہ رسالت ہوتی ہے اور معجزے بھی ہوتے ہیں، تو کس طرح ہمکو یہہ بات معلوم ہوگی کہ جسنے وہ معجزے دکھائے ہیں وہ رسول ہے کیونکہ اُسکے رسول ہونے کا ثبوت خدا کی طرف سے تو اُسوقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُسکا رسول ہونا ثابت نہ ہولے ورنہ تصحیح الشئی بنفسہٖ لازم آتی ہی جو باطل ہے اور تجربہ اور عادت سے بھی اُسکے رسول ہونیکا ثبوت نہیں ہو سکنے کا بجز اسکے کہ معجزے رسول ہی دکھایا کریں اور کوئی نہ دکھا سکے حالانکہ خرق عادت جسکا ایک نام معجزہ بھی ہے رسول اور غیر رسول دونوں دکھا سکتے ہیں۔ ان تمام مشکلات کے سبب متکلمین نے اُن سب باتوں کو چھوڑ کر صرف یہہ بات کہی کہ جس شخص کے پاس معجز یعنی عاجز کرنیوالی چیز ہو وہ رسول ہی مگر یہہ بھی صحیح نہ ہوگا بجز اسکے کہ وہ شئے معجز فی نفسہٖ رسالت اور رسول پر دلالت نہ کرے" اور عقل میں یہہ قوت نہیں ہے کہ وہ جب کوئی عجیب خرق عادت دیکھے تو یہہ جان لے کہ وہ ربانی ہے اور رسالت پر دلیل قاطع، ہاں یہہ ہو سکتا ہے کہ دیکھنے والا یہ اعتقاد کرے کہ جس شخص

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

شخص سے یہہ خرق عادت ہوئی ہے، وہ ایک بڑا شخص ہے اور بڑا شخص جھوٹ نہیں بولیگا، بلکہ اُسکے رسول ماننے کو یہہ بھی کافی نہ ہوگا جب تک کہ یہہ بھی نہ مان لیا جاوے کہ رسالت درحقیقت ایک چیز ہے اور ایسی خرق عادات بجز رسول کے اور کسی بڑے شخص سے نہیں ہوتی۔ شئی معجز بھی رسالت پر دلالت نہیں کرتی، کیونکہ عقل نہیں جان سکتی کہ رسالت اور شئے معجز میں کیا علاقہ ہے، جب تک یہہ نہ مان لیا جائے کہ اعجاز، رسالت کے افعال میں سے ایک فعل ہے، جیسے کہ بیمار کا اچھا کرنا طب کے افعال میں سے ایک فعل ہے، اور جو شخص بیمار کو اچھا کر دیتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ طب کا وجود ہے، اور یہہ شخص طبیب ہے پس یہہ تمام دلیلیں بودی ہیں۔ اور اگر ہم بطور تنزل کے رسالت کی امکان عقلی کو امکان وقوعی فرض کر لیں اور معجزہ کو بھی اُس شخص کے سچا ہونے کی دلیل مان لیں جو رسالت کا دعوی کرتا ہے، تو بھی اُن لوگوں کے نزدیک جو کہتے ہیں کہ رسول کے سوا اور سے بھی شئے معجز ظاہر ہوتی ہے رسالت پر معجزہ کی دلالت لازمی نہیں ہونے کی، اور متکلمین اسبات کے قایل ہیں کہ شئے معجز کبھی جادو گر سے اور ولی سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اور اِس مقام پر جو انھوں نے یہہ شرط لگائی ہے کہ شئے معجز اُسی وقت رسالت پر دلالت کرتی ہے، جبکہ وہ رسالت کی دعوی کے مقارن ہو، اور جو شخص رسول نہیں ہی اور وہ یہ دعوی کرے کہ میں رسول ہوں شئی معجز کو دکھانا چاہے تو نہ دکھا سکے گا یہہ ایک ایسی بات ہے جس پر کوئی دلیل نہیں نہ تو اُسکا نشان منقولات میں پایا جاتا ہے، اور نہ عقل سے معلوم ہو سکتا ہے، اور یہہ کہنا کہ شئی معجز ایک بڑے شخص سے

بیشک تمھارے پاس موسیٰ کھلی ہوئی نشانیاں لیکر آیا پھر اُسکے بعد تمنے بچھڑے اپنا لیا اور تم
ظالم ہو (۸۶) اور (یاد کرو) جب ہمنے تم سے اقرار لیا اور ہمنے تم پر طور کو اونچا کیا کہ مضبوط پکڑو اُس
چیز کو جو ہمنے تمکو دی ہی اور (اُسکو) مانو (اپنی زبان سے تو اُنھون نے) کہا کہ ہمنے مانا (مگر اُنکی
زبان حال اور کردار نے کہا کہ) ہمنے نہ مانا اور اُنکے دلون میں پلادی گئی تھی بچھڑے کی (محبت)
اُنکے کفر کے سبب کہہ دے بُری بات ہی جسکے کرنیکو تمھارا ایمان تمکو حکم دیتا ہے اگر
تم ایمان والے ہو (۸۷)

ظاہر ہوتی ہے، اور جو شخص جھوٹا دعوی کرے وہ بڑا شخص نہیں ہے، اور اسلئے اُس سے ظاہر نہ ہوگی، اسلئے
غلط ہو جاتا ہے کہ متکلمین جادوگر سے شئے معجز کا ظاہر ہونا تسلیم کرتے ہیں، اور جادوگر بڑا شخص تسلیم نہیں کیا جا سکتا
ان سب خرابیون پر خیال کر کے بعض لوگون نے یہ کہا ہی کہ یہہ اعتقاد ٹھیک ہی کہ خرق عادت بجز
انبیا کے اور کسی سے نہیں ہوتا، اور سحر صرف ایک دہشت بندی ہے، نہ قلب عین شی، یعنی معجزہ سی لکڑی
سچ مچ کا سانپ بن جاتی ہے، اور سحر سے وہ سانپ نہیں بنتی، بلکہ لوگون کو سانپ دکھائی دیتی ہی، اور
اسی وجہہ سے اُن لوگون نے کرامات اولیا سے انکار کیا ہی (واضح ہو کہ اسی خیال پر شاہ ولی اللہ صاحب
نے بھی حجتہ اللہ بالغہ میں کرامات اولیا سے انکار کیا ہے) مگر قاضی ابن رشد اس اعتقاد کی بھی تردید کرتے ہیں
اور کہتے ہیں کہ تم کو رسول خدا صلعم کے حال سے ظاہر ہوگا، کہ آنحضرت نے نہ کسی ایک شخص کے اور نہ
کسی ایک گروہ کے ایمان پر دعوت کرتے وقت یہہ نہیں کیا، کہ اُس سے پہلے اُسکے سامنے کوئی خرق
عادت کی ہو، اور ایک چیز کو دوسری چیز میں بدل دیا ہو، یعنی لکڑی کا سانپ اور سانپ کی لکڑی اور سونے کو
مٹی اور مٹی کو سونا بنا دیا ہو، اور اسلام لانے کی دعوت کے وقت کوئی کرامات اور کوئی خوارق عادات آنحضرت
صلعم سے ظاہر نہیں ہوئی، اگر ظاہر ہوئی ہے تو معمولی حالات میں، بغیر اسکے کہ کرامات اور خرق عادت کا دعوی
کیا ہو، اور اسکا ثبوت خود قرآن مجید ہی میں پایا جاتا ہی، جہاں خدا نے آنحضرت صلعم سے فرمایا ہی کہ کافر کہتے ہیں

قالوا لن نؤمن لک حتی تفجر لنا من الارض ینبوعا او تکون لک جنۃ من نخیل وعنب فتفجر الانھار	ہم تجھ پر ایمان نہیں لانے کے جبتک تو زمین پھاڑ کر ہمارے لئے چشمہ نہ نکالے یا تیرے پاس کھجور اور انگور کا باغ نہو جسکے بیچ میں تو بہتی ہوئی نہریں نہ نکالے زور سے بہتی

قُلْ إِن كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِندَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّن دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿۸۸﴾ وَلَن يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿۸۹﴾

خلالها تفجیرا او تسقط السماء کما زعمت علینا کسفا او تاتی باللہ والملائکۃ قبیلا او یکون لک بیت من زخرف او ترقی فی السماء ولن نومن لرقیک حتی تنزل علینا کتابا نقراہ قل سبحان ربی هل کنت الا بشرا رسولا وما منعنا ان نرسل بالایات الا ان کذب بها الاولون۔

یا تو ہمپر آسمان کے ٹکڑے نہ ڈالے یا خدا اور فرشتون کو اپنے ساتھ نہ لاوے، یا تیرے لئے کوئی مزین گھر نہو، یا تو آسمان پر چڑہ نہ جاوے اور ہم تو تیرے منتر پر ہرگز ایمان نہیں لاوینگے، جب تک کہ ہمپر ایسی کتاب نہ اُترے جو ہم پڑہلیں واسپر خدا اپنے پیغمبر کہتا ہے کہ، تو اُنسے کہدے کہ پاک ہی میرا پروردگار میں تو کچھ نہیں ہوں مگر رسول (اور خدا نے فرمایا کہ) نہیں روکا ہمکو آیات کے بھیجنے سے مگر یہہ کہ جھٹلایا اُنکو اگلون نے۔

غرضکہ قاضی ابن رشد نے معجزات کو مثبت نبوت قرار نہیں دیا، اور اُسکے بعد صرف قرآن کو مثبت نبوت قرار دیا ہے، اور قریب قریب وہی لکھا ہے ۞ جو اس بحث میں ہم لکھ چکے ہیں، مگر وہ بحث اس مقام سے متعلق نہیں ہے۔ قاضی ابن رشد نے جو اتنی بڑی بحث لکھی ہے اُسکا حاصل یہہ ہے کہ اگر خدا کو موجود و مرید و متکلم و قادر و مالک عباد تسلیم بھی کر لیا جاوے اور یہہ بھی مان لیا جاوے کہ وہ رسول بھیجا کرتا ہے اور معجزات کا بھی وقوع قبول کر لیا جاوے، تب بھی معجزات کے وقوع سے یہہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وہ شخص خدا کا رسول ہے، مختصر طور پر اس کی یہہ دلیلیں ہیں۔

(۱) جو امر کہ واقع ہوا اُسکی نسبت اس امر کے لزوم کا ثبوت نہیں ہوتا کہ جس شخص سے وہ واقع ہو وہ رسول ہوتا ہے۔

(۲) کوئی خرق عادت ایسی معلوم نہیں ہے جو بطور خاصہ رسولوں سے مخصوص ہو۔

(۳) کچھ ثبوت نہیں ہے کہ خرق عادت سے رسالت کو کیا تعلق ہے۔

(۴) اسکا ثبوت نہیں ہوتا کہ اُسکا وقوع قانون قدرت کے مطابق نہیں ہوا کیونکہ بہت سے عجائبات

۞ دیکھو صفحہ ۱۳۰ لغایت ۳۴۔

کہدے کہ اگر آخرت کا گھر خدا کے نزدیک اور لوگوں کے سوا بالتخصیص تمھارے ہی لئے ہے تو موت کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو (۸۸) اور ہرگز کبھی اُسکی آرزو نہ کرینگے اُسکے سبب سے جو اُنکے ہاتھوں نے پیش کیا ہے (یعنی بسبب اپنے اعمال بد کے) اور اللہ جانتا ہے ظالموں کو (۸۹)

اب بھی ایسے ظاہر ہوتے ہیں جو فی الحقیقت اُنکا وقوع قانون قدرت کے مطابق نہیں ہوتا ہے مگر وہ قانون الٰہی لامعلوم ہے۔

(۵) اسکا کچھ ثبوت نہیں ہوتا کہ جو امر واقع ہوا وہ خواص نفس انسانی سے جو ہر ایک انسان میں ہے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔

(۶) غیر انبیاء سے جو اُمور خرق عادات کے واقع ہوتے ہیں اور جو انبیاء سے واقع ہوتے ہیں اُن دونوں میں کوئی مابہ الامتیاز نہیں ہے۔

(۷) یہاں تک کہ اہل ہنر سے جو اُمور واقع ہوتے ہیں اُنمیں و خرق عادت میں امتیاز نہایت مشکل ہوتا ہے کوئی معترض غلطی سے کہہ سکتا ہے کہ قرآن مجید میں جسطرح آیات بینات کا اطلاق قرآن کی آیتوں یا احکام و نصایح و مواعظ قرآنی پر ہوا ہے اسیطرح معجزات پر ہوا ہے، اور دو آیتیں قرآن کی غلط فہمی سے اِس کی دلیل میں پیش کر سکتا ہے، پس مناسب ہے کہ ہم اِس مقام پر بتا دیں کہ اُن آیتوں میں سے آیات بینات سے معجزے مراد نہیں ہیں۔

پہلی آیت سورہ مائدہ کی ہے جہاں خدا تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کی نسبت فرمایا ہے کہ "اذ ایدتک بروح القدس تکلم الناس فی المھد و کھلا۔ و اذ علمتک الکتاب والحکمۃ والتوراۃ والانجیل۔ و اذ تخلق من الطین کھیئۃ الطیر باذنی فتنفخ فیھا فتکون طیرا باذنی و تبرئ الاکمہ والابرص باذنی واذ تخرج الموتی باذنی و اذ کففت بنی اسرائیل عنک اذ جئتھم بالبینت فقال الذین کفروا منھم ان ھذا الا سحر مبین" اس آیت میں مفسرین کے نزدیک حضرت عیسیٰ کے معجزات کا بیان ہے اور پھر کہا گیا ہے کہ کافروں نے کہا کہ یہہ تو کھلا ہوا جادو ہے اِس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ بینات سے جو اِس آیت میں ہے معجزے مراد ہیں جنکو کافروں نے جادو کہا۔ صاحب تفسیر بیضاوی نے بھی ہذا کا اشارہ "الذی جئت بہ" کی طرف کیا ہے جس سے صاحب بیضاوی کے نزدیک بھی اِس جگہہ بینات سے معجزے ہی مراد ہیں۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿٩٠﴾ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٩١﴾

مگر یہ قاعدہ کلیہ صحیح نہیں ہے اول تو ان ہذا کا مشار الیہ الذی حجت بہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ظرف واقع ہوا ہے کفعت کا جیسے کہ خود صاحب بیضاوی نے بھی اسکو تسلیم کیا ہے "ان ہذا کا مشار الیہ ما کفعت ہے نہ الذی حجت بہ کیونکہ الذی بہ متعلق ظرف او حجت ظرف ہے جو کلام میں مقصود بالذات نہیں ہوتا اور کفعت وہ فعل ہے جو مقصود بالذات ہے اور اسی لئے ہذا اشارہ اسی کی طرف ہوا ہے۔

علاوہ حضرت عیسیٰ کا یہودیوں کے حملہ سے بچ جانا جو انھوں نے انکے قتل کے ارادہ سے اسوقت کیا تھا جبکہ وہ احکام خدا انکو سناتے تھے ان فرقوں سے بچ رہا اور بتایا کہ بینات کے لفظ سے اسکو کچھ تعلق نہیں ہے دوسرے یہ کہ جب سیاق کلام سے تمام اس آیت پر نظر ڈالی جاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ پر جو انعام کئے تھے انکو اول ذکر کر کے بیان کیا ہے اور اخیر کو جو قول کافروں کا تھا اسکا ذکر کیا ہے۔ پس وہ قول انہی چیزوں سے متعلق ہے جن سے کہ وہ متعلق ہو سکتا ہے نہ یہ کہ اس سے کوئی خاص معنی لفظ بینات کے ثابت ہو سکتے ہیں۔

دوسری آیت سورہ بنی اسرائیل کی ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے "وما منعنا ان نرسل بالآیات الا ان کذب بہا الاولون وآتینا ثمود الناقة مبصرة فظلموا بہا وما نرسل بالآیات الا تخویفا" اس آیت سے قاضی ابن رشد نے استدلال کیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے ادعائے نبوت کے ساتھ کوئی معجزہ کسی کو نہیں دکھلایا جیسے کہ اوپر بیان ہوا ہے اور اس سے پایا جاتا ہے کہ قاضی ابن رشد نے اس آیت میں جو لفظ آیات ہے اس سے معجزات مراد لئے ہیں صاحب تفسیر

اور بیشک تو انکو پاویگا سب آدمیوں سے زیادہ حریص زندگی پر اور ان لوگوں سے بھی زیادہ (حریص) جو مشرک ہیں ہر ایک ان میں کا چاہتا ہے کہ کاش اسکو ہزار برس کی عمر دیجاوے اور لمبی عمر ہونا بھی اسکو عذاب سے بچانے والا نہیں' اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں (۹۰) کہدے جو کوئی دشمن ہے جبرئیل کا کہ بیشبہ اسنے ڈالا ہے تیرے دل پر اللہ کے حکم سے (وہ کلام جو) سچ بتاتا ہے اس چیز کو جو اس سے پیشتر ہے' اور ہدایت اور خوشخبری ہے ایمان والوں کے لئے (۹۱)

بیضاوی نے بھی یہہ سمجھا ہے کہ جو معجزات قریش نے طلب کئے تھے اس آیت میں لفظ آیات سے وہی معجزے مراد ہیں مگر اس تفسیر میں چند نقصان ہیں اول تو یہہ سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا نے لوگوں کے نہ ماننے یا جھٹلانے سے کیوں معجزوں کا بھیجنا بند کر دیا- دوسرے یہہ کہ آدم سے عیسی تک برابر کیوں بھیجتا رہا' اور کیوں ایسی بیرحمی سے اگلوں کو غارت کرتا رہا' اسلئے میری سمجھ میں ان تمام پچھلی آیات کے معنی معجزات کے لینا صحیح نہیں ہیں' یہاں بھی احکام ہی کے معنی ہیں' جو حکم خاص کسی کو یا کسی قوم کو دیا گیا ہے وہ بھی آیت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے' جیسے کہ سورہ آل عمران سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ذکریا سے جب خدا نے کہا کہ تیرے بیٹا ہوگا' تو انہوں نے عرض کیا "رب اجعل لی آیۃ" یعنی اے پروردگار میرے لئے خاص آیت یعنی حکم مقرر کر' خدا نے کہا "ایتک الا تکلم الناس ثلثۃ ایام الا رمزا" یعنی تیری آیت یعنی تیرے لئے یہہ حکم ہے کہ تین دن تک بجز اشارے کے کسی آدمی سے بات نہ کر ... احکام حضرت صالح نے نسبت ناقہ کے بتائے تھے ... اس پر بھی آیت کا اطلاق ہوا ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے "ھذہ ناقۃ اللہ لکم آیۃ"' کیونکہ وہ اونٹنی بذاتہ کوئی معجزہ نہ تھی-

پس اب اس آیت پر غور کرنا چاہئے جس پر بحث ہے خدا تعالی نے تمام قرآن میں کوئی حکم خاص نسبت کسی شخص کے یا کسی خاص قوم کے مخصوص نہیں کیا ہے' بلکہ تمام انسانوں کے لئے یکساں حکم ہیں' اور نہ کسی حکم میں کوئی خاص بات یا کسی امر کی نشانی کا ہونا بتایا ہے' برخلاف اسکے بعض اگلی امتوں پر بعض احکام خاص خاص بطور نشانی کے تھے' پس خدا فرماتا ہے کہ ہم نے وہ احکام اسلئے نہیں

[illegible]

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ

جیسے کہ اگلی قومیں جن پر وہ احکام تھے وہ اُسکو بجا نہیں لاسکیں۔ اور اُسی کے ساتھ بطور تمثیل کے قوم ثمود کا ذکر کیا ہے جنکو حکم تھا کہ اونٹنی کو کھاتا پیتا پڑا پھرنے دیں اور کسی طرح ستاویں نہیں اور پھر اخیر کو بتا دیا کہ وہ خاص احکام صرف اُنکو قایم رکھنے کے لئے تھے نہ مقصود بالذات۔

(۹۲) (وجبریل ومیکال) یھودیوں نے فرشتوں کے لئے نام مقرر کئے تھے اور اُنکے ہاں سات فرشتے نہایت مشہور فرشتوں میں ہیں مگر اسکا ثبوت نہیں ہے کہ کسی نبی نے اُنکو بتایا تھا کہ یہہ فرشتوں کے نام ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحف انبیا میں کوئی صفت صفات باری میں سے کسی خاص لفظ کے ساتھ تعبیر کی گئی تھی اور پھر رفتہ رفتہ وہ لفظ فرشتہ کا نام متصور ہونے لگا، قرآن مجید میں انکا استعمال اُسی طرح پر ہوا ہے جس طرح کہ یھودی خیال کرتے تھے مگر ہمارے ہاں کے علما نے بھی یہودیوں کی تقلید سے انکو فرشتوں کے نام قرار دئے ہیں قرآن مجید میں صرف دو فرشتوں یعنی جبرئیل و میکائیل کا نام آیا ہے، وہ دونوں فرشتے یہودیوں کے ہاں بھی اسی نام سے مشہور ہیں، صرف تلفظ کا فرق ہے، کیونکہ یہہ دونوں نام دراصل عربی نہیں بلکہ عبرانی ہیں۔

(جبرئیل) عبری زبان میں اس لفظ کے معنی قوۃ اللہ یا قدرت اللہ کے ہیں یہہ لفظ دانیال پیغمبر کی کتاب میں آیا ہے۔ حضرت دانیال نے سینگ دار مینڈھے اور سینگ دار بکرے کی لڑائی کا ایک خواب دیکھا تھا، اُسی خواب میں ایک شخص نے دریا کے کنارے سے پکار کر کہا کہ اے جبرئیل اس شخص یعنی دانیال کو اُسکے خواب کی تعبیر سمجھا دے اور ایک اور دفعہ وہی شخص جس کا نام خواب میں حضرت دانیال نے جبرئیل سُنا تھا اُنکا خواب سمجھانے کو اُنکے پاس آیا تھا۔ لوقا نے جو انجیل ✝ لکھی ہے اُسکے پہلے باب میں جبرئیل کا ذکر ہے جس نے الیشبع حضرت ذکریا کی بیوی کو حاملہ ہونے کی بشارت دی اور پھر حضرت مریم کو بھی بیٹا ہونے کی خوشخبری سنائی، علمای یہود کے نزدیک جبرئیل بنی اسرائیل کے لئے قابض ارواح ہیں اور اونکی روحیں اُنہی کے پاس رہتی ہیں، تالمد میں اُنکو ملک النار لکھا ہے، اور یہہ لکھا ہے کہ رعد پر

✝ دانیال باب ۸ ورس ۱۶ و باب ۹ ورس ۲۱۔

✝✝ لوقا باب ۱ ورس ۱۹ و ۲۶۔

جوکوئی خدا کا دشمن ہے

انکی حکمرانی ہے' اور میؤوں کا یکا نام ان سے متعلق ہے علماے یہود یہہ بھی سمجھتے ہیں کہ جبرئیل بڑے زباندان ہیں' اور بابل میں جو لوگوں کی زبانیں ستر قسم کی ہوگئی تہیں اُن سب کو یہہ جانتے ہیں' اور حضرت یوسف کو وہ سب زبانیں انہیں نے سکھادی تہیں' اور کلدانی اور سریانی زبان سواے جبرئیل کے اور کسی فرشتہ کو نہیں آتی غالباً زباندانی میں اِن کے مشہور ہونے کے سبب مسلمانوں نے تصور کیا ہے کہ یہی خدا کی وحی یعنی قرآن کی آیتیں خدا سے سنکر یاد کر لیتے تھے' اور آنحضرت کو آکر سناتے تھے۔

(میکائیل) کے معنی عبری میں ''من کا اللہ'' کے ہیں دانیال * کی کتاب میں اور انکی خوابوں میں یہہ لفظ بھی آیا ہے' مشاہدات ‡ یوحنا میں بھی یہہ لفظ ہے اور لکھا ہے کہ آسمان پر لڑائی ہوئی' میکائیل اور اُسکے فرشتے اژدہے سے لڑے' اور اژدہے اُسکے فرشتوں سے لڑے پس غالب نہ ہوئے' اور اُنکے لئے آسمان پر جگہہ نہ رہی' اور یہودا § نے میکائیل کی نسبت لکھا ہے کہ جب بڑے فرشتہ میکائیل نے شیطان کے ساتھ موسیٰ کی لاش کے حق میں تکرار کر کے گفتگو کی' تب اُس نے بدنامی کی نالش کرنے میں دلیری نہ کی' لیکن کہا اللہ تجھے ملامت کرے''۔

بہرحال ہمکو اس میں کچھ شبہہ نہیں ہے کہ جو الفاظ صفات باری پر مستعمل ہوئے تھے آخر کو انھی الفاظ کو فرشتوں کا نام سمجھنے لگے۔ یہودی خیال کرتے تھے کہ میکائیل قوم بنی اسرائیل کا محافظ و نگھبان ہے اور جبرئیل کو سمجھتے تھے کہ وہ بنی اسرائیل کا مخالف ہے۔ اسی سبب سے جبرئیل کو اپنا دشمن سمجھتے تھے اور اُس سے عداوت رکھتے تھے۔ اُسی کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ جو کوئی جبرئیل کا یا میکائیل کا دشمن ہے بے شک خدا اُسکا دشمن ہے۔ مگر جبرئیل و میکائیل کا اِس آیت میں صرف نام ہونے سے اُنکے الیسی وجود واقعی پر جیسا کہ یہودیوں نے اور اُنکی پیروی سے مسلمانوں نے تصور کیا ہے استدلال نہیں ہو سکتا' جیسے کہ فرشتوں کی بحث کے بعد اُسکو بیان کرینگے۔

* دانیال باب ۱۰ ورس ۱۳۔

‡ مشاہدات یوحنا باب ۱۲ ورس ۷۔

§ یہودا ورس ۹۔

وَمَلٰٓئِکَتِہٖ

(ملایکہ) فرشتون کی نسبت بھی جو بحث ہے وہ نہایت ہی غور طلب ہے* قرآن مجید میں فرشتوں کا ذکر آیا ہے، اور اسلئے ہر ایک مسلمان کو جو قرآن پر یقین رکھتا ہے فرشتوں کی موجود اور اُنکے مخلوق ہونے پر یقین کرنا ضرور ہے مگر جہاں تک بحث ہے اس پر بحث ہے کہ وہ کیسی مخلوق ہے عام خیال مسلمانوں کا اور علماے اسلام کا یہہ ہے کہ جسطرح انسان وحیوان جسم وصورت وشکل رکھتے ہیں اسی طرح وہ بھی جسم اور صورت وشکل رکھتے ہیں، اور اُنکے پر بھی ہیں جن سے وہ اُڑکر آسمان پر چلے جاتے ہیں اور زمین پر اُتر آتے ہیں، اور خدا کا پیغام پیغمبرون تک پہونچاتے اور دنیا کے کام جو اُن سے متعلق ہیں کرتے پھرتے ہیں۔ اور حیوانات کے جسم اور اُن کے جسم میں اتنا فرق ہے کہ اُن کا جسم محسوس نہیں ہوتا، نہ چھونے سے ہاتھ کو لگتا ہے، نہ دیکھنے سے آنکھ کو دکھائی دیتا ہے، اور باوجود اسقدر نازک ہونے کے وہ بہت بڑے بڑے اور نہایت مشکل کام کرتے ہیں، پہاڑ اُٹھا لیتے ہیں، زمین کو اُلٹ دیتے ہیں، اور اُن میں یہہ بھی طاقت ہے کہ کبھی اپنے جسم کو ایسا کر لیتے ہیں کہ اُنکی اصلی صورت جو بہت بڑی خیال کیگئی ہے دکھائی دیجاتی ہے، اور اُن میں یہہ بھی قدرت ہے کہ جس شخص کی صورت چاہیں بن جاویں، اور انسانون کی طرح انسانوں کے پاس آکر باتیں کریں۔

ہمارے پاس کسی ایسی مخلوق کے ہونے سے جو کسی قسم کا جسم وصورت بھی رکھتی ہو جو ہمکو نہ دکھائی دیتی ہو انکار کرنے کی کوئی وجہہ نہیں ہے، پس ہم کہتے ہیں کہ شاید ایسی مخلوق ہو، مگر ہم ایسی مخلوق کے ہونیکا دعوی بھی نہیں کرتے، اور جو افعال ایسی مخلوق کی نسبت منسوب کئے جاتے ہیں اُنکا بھی اقرار نہیں کرتے، کیونکہ اِن باتوں کے اثبات کے لئے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، قرآن مجید سے فرشتون کے اس قسم کے وجود کا اور اُنکے اس قسم کے جسم کا اور اُنکے اِن افعال کا جنکا اوپر ذکر ہوا کچھ ثبوت نہیں ہے فرشتوں کے اِس قسم کے وجود اور افعال کا ثبوت ضرور ہے کہ دلیل نقلی سے ہوگا، اور اسلئے قبل شروع کرنے اس بحث کے ہمکو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علماے علم کلام نے جو بحث نسبت دلیل نقلی کے کی ہے اس مقام پر اُسکو نقل کرین۔

---

* دیکھو صفحہ ۱۴۴۔

اور اُسکے فرشتون کا

شرح مواقف میں اس بات پر ایک بحث لکھی ہے کہ دلائل نقلیہ جنسے مطالب پر استدلال کیا جاتا ہے مفید یقین ہیں یا نہیں، معتزلہ اور جمہور اشاعرہ کا یہہ مذہب بیان کیا ہے کہ نہیں نہیں، اور اُسکی وجہ یہہ لکھی ہے کہ جن الفاظ سے استدلال کیا جاتا ہے اُنکی نسبت جاننا چاہیئے کہ وہ اُنہی معنوں کے لئیے وضع کیئے گئے ہیں جو معنی اُنسے لئے جاتے ہیں، اور اس بات کا بھی جاننا چاہیئے کہ یہی معنی اُن سے واجبی ہیں، پہلی بات کے جاننے کے اصول تین ہیں، لغت اور صرف و نحو، اور یہہ تینون اصول روایت احاد سے ہم تک پہونچے ہیں، مثلاً اصمعی اور خلیل و سیبویہ سے، اور اگر وہ صحیح بھی ہوں تو ممکن ہے کہ خود اہل عرب نے اُس میں غلطی کی ہو، اسلئے کہ امراء القیس جو سب سے بڑا شاعر زمانہ جاہلیت کا تھا اُس نے کئی جگہہ اِن باتوں میں غلطی کی ہے۔ اور اِن اصول کی فروعات قیاس پر مبنی ہیں اور روایت احاد و قیاس دونون ظنی دلیلیں ہیں۔

دوسری بات اس پر موقوف ہے کہ جن معنوں کے لئے وہ لفظ وضع ہوئے تھے اُن معنون سے کسی دوسرے معنی میں مستعمل نہیں ہوئے، اور نیز وہ لفظ مشترک المعنی بھی نہیں ہیں، کیونکہ اگر مشترک المعنی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ جو معنی ہمنے سمجھے ہیں اُنسے مراد نہوں، بلکہ دوسرے معنی مراد ہوں، اور نیز یہہ بھی معلوم ہو کہ وہ مجازی معنوں میں بھی نہیں بولے گئے ہیں، کیونکہ اگر مجازی معنوں میں بولے گئے ہوں تو اُنسے وہی معنی مراد ہونگے نہ حقیقی معنی جو اُنسے بادر ہوتے ہیں، اور یہہ بھی معلوم ہو کہ کلام میں کوئی مضمر بھی نہیں ہے کیونکہ اگر کوئی شی مضمر ہو تو اُسکے معنی بدل جاوینگے، اور نیز وہان کوئی تخصیص بھی نہ ہو کیونکہ اگر کوئی تخصیص ہوگی تو جن چیزوں پر وہ لفظ دلالت کرتا ہے اُن میں سے بعض مراد ہونگی نہ کل، اور یہہ کہ کلام میں تقدم و تاخر بھی نہ ہو، کیونکہ اگر کلام میں تقدم و تاخر ہوگا تو اُسکے معنی بھی پلٹ جاوینگے اور ان باتوں میں سے ہر ایک بات ایسی ہے جو فی الواقع کلام میں ہوتی ہے، اسلئے ضرور ہے کہ نقل مفید یقین نہیں ہوتی۔

ان سب باتون کے ہونے کے بعد اس بات کا جاننا بھی ضرور ہے کہ جس بات پر نقلی دلیل دلالت کرتی ہے اُس پر کوئی عقلی معارضہ بھی نہیں ہے، کیونکہ اگر کوئی عقلی معارضہ پایا جاویگا تو ضرور نقلی دلیل اُسکو

ورسلہ

ترجیح ہوگی، اور اُس نقلی دلیل کو ضرور دوسرے معنوں میں تاویل کرنا پڑیگا، مثلاً یہہ جو خدا کا قول ہی کہ "الرحمن علی العرش استوا" یہہ صاف دلالت کرتا ہے کہ خدا تخت پر بیٹھا ہوا ہے، اگر دلیل عقلی اسکی معارض ہے اور خدا کا تخت پر بیٹھا ہوا ہونا عقلی دلیل سے محال ہے، اسلئے اُس نقلی دلیل کی غلبہ یا بادشاہت سے تاویل کی گئی، اور اگر یوں نہ کیا جاوے تو اجتماع نقیضین یا ارتفاع نقیضین لازم آتا ہے، اور اگر دلیل نقلی کو عقل پر ترجیح دیں تو فرع سے اصل کا ابطال لازم آتا ہے، کیونکہ جو چیزیں نقلی ہیں اُنکا اثبات بھی بجز عقل کے اور کسیطرح ممکن نہیں، پس نقل کے لئے بھی عقل ہی اصل ہے، اسلئے نقل کو ترجیح دینے سے اصل سے فرع کا ابطال لازم آتا ہے، اور فرع بھی اُس سے باطل ہو جاتی ہے، کیونکہ صحت نقل تو متفرع تھی عقل پر جس میں فساد ہونا مانا گیا تو نقل بھی مقطوع الصحت نرہی عقلی معارضہ کا نہ ہونا بھی یقینی نہیں ہے، کیونکہ غایت الغایت یہہ ہے کہ باوجود تلاش کے کوئی معارض عقلی نہیں ملا، لیکن معارض عقلی کے نہ ملنے سے اُسکے نہ ہونے پر یقین نہیں ہوسکتا، اور اس سے ثابت ہوا کہ دلالت نقلی بلکہ عقلی بھی امور ظنی پر موقوف ہے، اور اسلئے دلالت نقلی اپنے مدلولات پر مفید یقین نہیں ہے۔

صاحب شرح مواقف نے ان دلیلوں کے لکھنے کے بعد یہہ لکھا ہے کہ یہہ دلیلیں ٹھیک نہیں ہیں، بلکہ حق یہہ ہے کہ دلائل نقلی شرعیات میں اُن قرائن سے جو منقول ہیں مشاہدہ ہوتی ہیں، اور بطور تواتر کے ہم تک پہونچی ہیں، اور جنسے تمام احتمالات مذکورہ بالا جاتے رہتے ہیں مفید یقین ہوتی ہیں، کیونکہ تمام اہل لغت کے بیان سے ہم جانتے ہیں کہ جن معنوں میں لفظ ارض و سما کا اور اسی کی مانند جو اور مستعمل لفظ ہیں رسول خدا علیہ السلام کے وقت میں اُنہی معنوں میں مستعمل تھے جو معنی کہ اب اُنسے لئے جاتے ہیں، اور اس میں شک کرنا سفسطہ ہے جسکے غلط ہونے میں کچہہ شبہہ نہیں، اور معارض عقلی کا نہ ہونا قایل کو یعنی پیغمبر کو صادق ماننے سے جانا جاتا ہے، کیونکہ اگر معارض عقلی کا ہونا خیال کیا جاوے تو قایل کا کذب لازم آتا ہے (ہذا محصل ما فی شرح المواقف)

مگر جو کچہہ نسبت دلیل نقلی کے مفید یقین ہونے کے شارح مواقف اور صاحب مواقف نے لکھا ہے

اور اُسکے رسولون کا

وہ کسی قدر زیادہ غور کے قابل ہے۔ اسلئے کہ الفاظ مستعملہ کے جو معنی بطور تواتر اور بنقل اہل لغت ہم تک پہونچے ہیں وہ مسمیات اُن الفاظ کے ہیں بالالحاظ اُنکی ماہیات کے، مثلاً ارض و سماء جو سب سے زیادہ مشہور و مستعمل الفاظ ہیں اُنکے معنی جو ہم تک بطور تواتر کے پہونچے ہیں وہ اسیقدر ہیں کہ جس چیز پر ہم رہتے ہیں وہ ارض ہے اور جو چیز ہمکو اپنے سر پر دکھائی دیتی ہے وہ آسمان ہے اور کچھ شبہ نہیں ہے کہ عرب قدیم اسقدر سے زیادہ اور کوئی معنی اُن لفظوں کے نہیں سمجھتے تھے، مگر اہل کلام نے اور فقہا اور علماے اسلام نے صرف اسیقدر پر قناعت نہیں کی بلکہ اُنکے معنوں میں وہ باتین بھی شامل قرار دی ہیں جنکا غالباً خیال بھی عرب قدیم کو نہیں تھا، اور اس صورت میں اُن الفاظ کی دلالت اُن معنون پر یقینی قطعی نہیں ہے۔

الفاظ مشترک المعنی کی نسبت کوئی قرینہ ایسا نہیں ہے کہ جس سے اُنکا کسی ایک معنی پر مستعمل ہونے کو قطعی دلیل موجود ہو۔

الفاظ کا مجازی معنون میں مستعمل ہونا ایک ایسا وسیع امر ہے جسکی نسبت نہ نقل سے اور نہ اہل لغت کے تواتر نقل سے تصفیہ ہوسکتا ہے، اور یہی حال اضمار اور تخصیص اور تقدیم و تاخیر کا ہے۔

ان سب سے زیادہ ایک اور امر ہے جس پر شارح مواقف اور صاحب مواقف بلکہ اور کسی نے بھی غور نہیں کیا، اور وہ کلام غیر مقصود ہے، مثلاً ایک شخص یہہ بات کہے کہ جب آفتاب مغرب سے نکلے یا اونٹ سوئی کے ناکہ میں سے نکل جاوے تب یہہ امر واقع ہوگا، اور مخاطب اُسکو یہہ جواب دے کہ آفتاب کے مغرب سے نکلنے اور اونٹ کے سوئی کے ناکہ میں سے نکل جانے پر بھی یہہ امر واقع نہ ہوگا۔ اس کلام میں آفتاب کا مغرب سے نکلنا اور اونٹ کا سوئی کے ناکہ میں سے نکل جانا کلام مقصود نہیں ہے بلکہ عدم وقوع اُس امر کا جسکے وقوع کا قایل مدعی تھا مقصود ہے، ورنہ اس کلام سے تسلیم اس بات کی کہ درحقیقت کبھی آفتاب مغرب سے نکلیگا، یا اونٹ سوئی کے ناکہ میں سے نکل جاویگا، لازم نہیں آتی، پس دلیل نقلی میں اس بات کا علم کہ وہ کلام غیر مقصود نہیں ہے اشد ضروریات میں سے ہے، اور بغیر اس کے کوئی نقلی دلیل مفید یقین نہیں ہوسکتی۔

قرآن مجید میں اس قسم کا کلام غیر مقصود نہایت کثرت سے ہے، مشرکین و اہل کتاب کے عندیہ میں بہت سی ایسی باتیں

وَجِبْرِيْلَ

سمائی ہوئی ہیں جنکا دراصل کچھ وجود نہ تھا، یا وجود تھا مگر اُس کی جو حقیقت کہ وہ سمجھے ہوئے تھے دراصل وہ نہ تھی یا وہ بات ظاہر میں دکھائی دیتی تھی اور بطور غلط العام یا باعتماد مشاہدہ اُسی کو واقعی سمجھتے تھے حالانکہ حقیقت اور اصلیت برخلاف اُسکے تھی۔ اور قرآن مجید کو اُس سے بحث مقصود نہ تھی اسلئے اُسکو اُسی طرح بیان کیا جس طرح مشرکین اور اہل کتاب خیال کرتے تھے، اور کبھی اُسی پر بطور حجت الزامی کے کلام مقصود کی بنا قایم کی، اور کبھی اُسکو بطور نظیر مسلمہ مخالف کے اور کبھی بطور ایک مسئلہ غلط العام کے اور کبھی بلحاظ مشاہدہ ظاہری کے اُسکو بیان کیا، اور کلام مقصود سمجھا یا گیا، پس کلام مقصود کے سوا جسقدر کلام ہے وہ سب کلام غیر مقصود ہے اور اُس سے کوئی ثبوت کسی امر کی واقعیت کا حاصل نہیں ہوتا، اور نہ وہ کسی امر کیلئے مفید یقین ہوتا ہے اور اسلئے دلیل نقلی کے مفید بالیقین ہونے کو قطع نظر اُن تمام باتوں کے جو شارح مواقف اور صاحب مواقف نے بیان کی ہیں اُس بات کا علم کہ وہ کلام غیر مقصود نہیں ہے واجب و ضرور ہے۔ یہ امر جو ہمنے بیان کیا اُسکو کچھ کلام اللہ ہی سے خصوصیت نہیں ہے، بلکہ عام کلام کا اور خود ہماری روزمرہ گفتگو کا، بلکہ تمام دنیا اور تمام قوموں کی باہمی گفتگو و کلام کا یہی طریقہ ہے کہ جو امر بحث اور مقصود سے خارج ہی اُس کے صحیح یا غیر صحیح ہونے سے قطع نظر کر کر کبھی بطور حکایت اور کبھی بطور تسلیم فرضی اور کبھی بغیر کسی خیال کے اُسکا ذکر اور بیان آجاتا ہے اور اُس سے بجز اسکے کہ اُسکے بعد کلام مقصود بیان کیا جاویگا اور کچھ مقصد نہیں ہوتا یہی سبب ہے کہ بعض اشخاص غلطی سے سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید میں بعض ایسی باتیں بیان ہوئی ہیں جو حقایق موجودہ کے برخلاف ہیں، اور بعضے اُس سے بھی زیادہ غلطی یہہ کرتے ہیں کہ اُسکو کلام مقصود سمجھ کر اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ وہی دراصل حقایق موجودہ ہیں۔ اور در اصل دونوں غلطی پر ہیں، قرآن مجید بلاشبہ کلام اللہ ہے، مگر انسانوں کی زبان اور انسانوں کے کلام کے طرز پر پس اُس کلام کو مثل ایک انسان کے کلام کے تصور کرنا چاہیئے، اور اُس سے معانی و مطالب و احکام و مقاصد اخذ کرنے اور اُس سے دلیلیں قایم کرنے میں اُسکو انسان کے کلام سے زیادہ کچھ رتبہ دینا نہیں چاہیئے۔

اب ہمکو ملک اور ملائکہ کے لفظ سے اور جس طرح پر کہ فرشتوں کا خیال انسانوں کے دل میں پیدا ہوا اور جسطرح کا خیال یہودیوں اور عیسائیوں میں فرشتوں کی نسبت تھا اور جسطرح سے کہ اُنکا بیان قرآن مجید

اور جبرئیل

میں ہوا ہے اُس پر بحث کرنی چاہیئے۔ قدیم زمانہ کی تمام دنیا کی قوموں کا یہہ حال تھا کہ جو امور عجیب و غریب اُنکے سامنے ایسے پیش آتے تھے جس کی علت اُنکی سمجھ سے باہر تھی اُسکو کسی ایسی قوت یا ایسے شخص سے منسوب کرتے تھے جو انسان سے برتر اور خدا سے کمتر تھی اسی خیال سے تمام بت پرست قوموں نے اپنے ہاں خیالی دیوتا اور دیبیاں اور خدا پرست قوموں نے اپنے ہاں فرشتے قایم کر لیئے۔

ملک کے لفظ کی + اہل لغت ملاک تباتے ہیں اور اُس کے معنی رسول یا پیغمبر یعنی پیغام پہونچانے والیکے کہتے ہیں مگر اس لفظ کا اطلاق اُس شے پر ہوتا ہے جسکو خدا تعالی نے اپنے مقاصد کے انجام کے واسطے یا اپنے وجود یا قدرت کے اظہار کے واسطے معین کیا ہو۔

توریت اور صحف انبیاء و انجیل میں فرشتہ کے لفظ کا استعمال نہایت وسیع معنوں میں آیا ہے کتاب دوم شموئیل باب ۲۴ ورس ۱۶ و ۱۷ میں اور کتاب دوم ملوک باب ۱۹ ورس ۳۵ میں اور زبور داؤد باب ۷۸ ورس ۴۹ میں وبا پر فرشتہ کا اطلاق ہوا ہے اور زبور داؤد باب ۱۰۴ ورس ۴ میں ہواؤں پر فرشتہ کا اطلاق کیا گیا ہے۔

کتاب ایوب باب ۱ ورس ۱۴ و کتاب اول شموئیل باب ۱۱ ورس ۳ - اور انجیل لوقا باب ۷ ورس ۲۴ - و باب ۹ ورس ۵۱ و ۵۲ میں فرشتہ کا لفظ عام ایلچیوں پر بولا گیا ہے کتاب اشعیا باب ۴۲ ورس ۱۹ و کتاب حجی باب ۱ ورس ۱۳ کتاب ملاکی باب ۳ میں فرشتہ کا لفظ پیغمبر یعنی انبیا کے معنوں میں آیا ہے اور کتاب واعظ باب ۵ ورس ۶ و کتاب ملاکی باب ۲ ورس ۷ میں فرشتہ کا لفظ بمعنی کاہن یا امام کے مستعمل ہوا ہے مشاہدات یوحنا باب ۱ ورس ۲۰ میں اور انجیل کے اور چند مقاموں میں فرشتہ کا لفظ حضرت عیسیٰ کے رسولوں پر بولا گیا ہے۔

توریت میں بہت جگہہ فرشتوں کو اس طرح بیان کیا ہے جیسے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو پاس آتے اور ملاقات کرے اور باتیں کرے توریت کی پہلی کتاب مسمی بہ کتاب پیدایش باب ۳۲ میں فرشتہ کا بطور ایک شخص کے تمام رات حضرت یعقوب سے کشتی لڑنے کا اور اخیر کو انکی ٹانگ مروڑ ڈالنے کا ذکر لکھا ہے اور ظاہرا

+ دیکھو صفحہ ۴۶ - لغایت ۵۱ -

وَمِیۡکٰلَ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس سے حضرت یعقوب کو بیماری نقرس یا وجع الورک کا ہونا مراد ہے' پس اگر یہ خیال صحیح ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ مرض پر بھی فرشتہ کا اطلاق ہوا ہے" اور اُسی کتاب کے باب ۱۹ میں حضرت لوط پاس دو فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے جو مسافر آدمیوں کی صورت میں آئے تھے" اور حضرت لوط نے اپنے گھر میں اُنکو مہمان رکھا اور اُنکی ضیافت کی اور نان فطیری اُنکے لئے پکائی اور اُنھوں نے کھائی' با این ہمہ بہت جگہ فرشتہ کا لفظ ایسے وجودہائے روحانی یا عقول فلکی کی نسبت مستعمل ہوا ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے اُسکے احکامات بجا لانے کے واسطے مامور ہیں۔

ارواح کی نسبت قدیم یہودیوں کا خیال اس زمانہ کے خیال سے کسیقدر مختلف تھا' اس زمانہ میں روح سے غیر مادی چیز خیال کیجاتی ہے" اور مادہ کو ضد روح اور روح کو ضد مادہ سمجھا جاتا ہے" مگر یہودی عبری لفظ "روح" سے غیر مادی شئے مراد نہیں لیتے تھے' بلکہ غیر مرئی جسم سمجھتے تھے" اور اُنکے جوہر کو خالص ہوا یا رقیق آگ تصور کرتے تھے" اور اِس لئے جب قدیم یہودی فرشتوں کو ارواح کہتے تھے تو اُنکی ذی جسم ہونے سے اُنکو انکار نہ تھا' بلکہ صرف مادہ غلیظ کی نجاستوں سے مبرّا ہونا سمجھتے تھے" سنٹ پال ہونے جو اپنے نامہ اول موسومہ کرنتھیان باب ۱۵ ورس ۴۴ میں لکھا ہے" اُس سے پایا جاتا ہے کہ وہ بھی روحانی اجسام کو تسلیم کرتے تھے یہودیوں اور عیسائیوں کی کتب مقدسہ میں روحانی عقول کا اکثر ذکر پایا جاتا ہے جنکی حالت وجود جداگانہ ہے' اور ایک آسمانی جماعت قرار دی گئی ہے جسکا سردار خود خدا ہی کتاب دانیال باب ۷ ورس ۱۰ و انجیل متی باب ۲۶ ورس ۵۳ و انجیل لوقا باب ۲ ورس ۱۳ و نامہ عبرانیان باب ۱۲ ورس ۲۲ و ۲۳ سے کروڑہا بلکہ کروڑہا در کروڑہا فرشتوں کا ہونا معلوم ہوتا ہے" اتنے بڑے جم غفیر کے اندر مختلف درجے اور مختلف صفتیں موجود ہونی ضرور ہیں' تاکہ انسان سے لیکر خدا تک ایک ایسا سلسلہ وجود کا قائم ہو جاوے جو خالق اور کمترین ذی عقل مخلوق کی تفاوت کو مرلوط کر دے یہودیوں کی مقدس کتابوں میں فرشتوں کا ایسی جماعتوں میں منقسم ہونا مذکور ہی جنکی عزت اور قوت درصفت غیر مساوی ہے" اور اُنپر سردار اور حکام بھی ہیں۔

اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ یہودیوں کی قدیم کتب مقدسہ میں یعنی اُن کتابوں میں جو قید بابل سے پیشتر لکھی گئی ہیں یہ خیال صاف صاف بیان نہیں ہوا' بلکہ جو کتابیں جلاوطنی کے زمانہ میں

اور میکائیل کا

اور اُسکے بعد کو لکھی گئی ہیں اُن کتابوں میں اس خیال نے صورت پکڑی ہے، اور خصوصاً حضرت دانیال اور حضرت زکریا کی تحریرات میں اس خیال کا پتہ ملتا ہے، کتاب زکریا باب ۱ ورس ۱۱ میں ایک فرشتہ سب سے اعلیٰ درجہ کا ہے جو خدا کے روبرو کھڑا رہتا ہے، اور اور فرشتوں سے بطور اپنے کارندوں کے کام لیتا ہے، حضرت دانیال نے حضرت میکائیل فرشتہ کو بہت بڑے بڑے لقب عطا فرمائے ہیں تا نامہ یہوداہ ورس ۹ اور اول نامہ تھسلینی کے باب ۲۱ ورس ۱۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہہ راے کہ فرشتے مختلف درجہ رکھتے ہیں صرف یہودیوں ہی کے ساتھہ مخصوص نہ تھی، بلکہ حضرت عیسیٰ کے حواریوں کا بھی یہی خیال تھا، ہاں اسقدر ٹھیک ہے کہ متاخرین یہودیوں نے جو رتبے کی تقسیم فرشتوں میں قایم کی ہے وہ حواریوں کے وقت میں نہ تھی۔

یہودیوں کی کتب مقدسہ میں فرشتے ہمیشہ مجسم ہو کر انسانی صورت میں دکھائی دیتے تھے، اور کسی جگہہ اس بات کا اشارہ نہیں ملتا کہ یہہ اجسام حقیقی نہ تھے، متقدمین یہودی بیشک یہہ جانتے تھے کہ ان اجسام کا مادہ ہمارے اجسام کے مادہ کی مانند نہیں ہے، کیونکہ فرشتوں میں یہہ قدرت ہے کہ جب چاہیں اپنے تئیں لوگوں کو دکھلادیں اور جب چاہیں نگاہوں سے غائب ہوجاویں، عیسائی بھی اس سے انکار نہیں کرسکتے، کیونکہ وہ یقین کرتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ مصلوب ہونے کے بعد اُٹھے تو کبھی اُن کا جسم حواریوں کو دکھائی دیتا تھا اور کبھی نگاہ سے غائب ہوجاتا تھا، اگرچہ وہ ہمیشہ انسان ہی کی صورت پر دکھائی دیتے تھے، مگر یہودیوں نے اُس سے یہہ بات لازم نہیں تصور کی تہی کہ فرشتے انسان ہی کی صورت رکھتے ہیں، بلکہ متقدمین یہودی یہہ اعتقاد رکھتے تھے کہ جو چیز خالص روح نہیں ہے کوئی نہ کوئی شکل ضرور رکھیگی ممکن ہے کہ انکی صورت انسان ہی کی سی ہو یا اور کسی شکل کی۔

یہودیوں کی کتب مقدسہ میں اناث ملائکہ کا ذکر نہیں پایا جاتا، اور عیسائی بھی بدلیل انجیل متی باب ۲۲ ورس ۳۰ بطور استنباط کے یہی سمجھتے ہیں کہ فرشتوں میں ذکور اور اناث کی کچھ تمیز نہیں ہے۔ کتب مقدسہ میں غالباً اسوجہہ سے کہ مذکر کا صیغہ زیادہ معزز ہے فرشتوں کی نسبت مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے، مگر اکثر بت پرست قومیں فرشتوں کو ذکور اور اناث قرار دیتی ہیں، اور دیوتا اور دیبی کا ماننا اُن خیالات کو ظاہر کرتا ہے۔

فَاِنَّ اللّٰہَ

عیسائی اور یہودی دونوں فرشتوں میں ان صفات کو تسلیم کرتے ہیں۔ انسان سے اُنمیں عقل کا زیادہ ہونا۔ اُن کا قوت اور قدرت میں زیادہ ہونا۔ انکا پاک اور برگزیدہ ہونا۔ اور یہہ بات کہ فرشتے خدا تعالی کے منشا اور مرضی کے اظہار کے ذریعے ہیں۔ کتب مقدسہ یہودیوں اور عیسائیوں سے بخوبی معلوم ہوتی ہے اور اسی سبب سے بعض کاموں کو اُن کتابوں میں بالکل فرشتوں ہی کیطرف منسوب کیا ہے۔ انسانوں کے مقسوم کے متعلق امورات میں بھی اُنکی وساطت ہوتی ہے۔ یہودی اور عیسائی یہہ بھی خیال کرتے ہیں کہ گو فرشتوں کی وساطت ہماری نظروں سے پوشیدہ ہو تب بھی اُنکی وساطت تسلیم ہو سکتی ہے کیونکہ عبرانیون کے خط کے باب اول ورس ۱۴ اور زبور داؤد باب ۳۴ ورس ۔ و باب ۹۱ ورس ۱۱ و انجیل متی باب ۱۸ ورس ۱۰ میں لکھا ہے کہ خدا تعالی فرشتوں کو نجات کے وارثوں کی خدمت کے لئے بھیجتا ہے۔

قدیم عیسائی سمجھتے تھے کہ ہر فرد بشر کے ساتھ ایک فرشتہ ہے جو اُسکی حفاظت پر متعین ہے۔ مشرکین کا بھی اسی کے قریب قریب عقیدہ تھا۔ یونانی اپنے محافظ دیوتا کو "ڈیمن" اور رومی جینیس کہتے تھے۔ اور یہودی اور قدیم عیسائی یہہ بھی سمجھتے تھے کہ ہر انسان پر دو فرشتے متعین ہوتے ہیں ایک نیکی کا اور ایک بدی کا۔ عام یہودی بھی فرشتوں کی نسبت یہی اعتقاد رکھتے ہیں۔ مگر ایک فرقہ یہودیوں کا جو صدوقی کے نام سے مشہور تھا وہ فرشتوں کا منکر تھا۔

بعض لوگوں کا یہہ بھی خیال تھا کہ یہودیوں کا یہہ دستور ہے کہ خدا کی عظمت اور قدرت کے ہر ظہور کو فرشتوں کی وساطت کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اسلئے وہ فرشتوں کے وجود اصلی کو نہیں مانتے اور یہہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی قدرت کی غیر معلوم قوتوں کا نام فرشتہ رکھدیا ہے۔ جیسے کہ مشرک ہر چیز کو جو عجیب و غریب ہوتی ہے اور جس کی حالت [illegible] ہوتی ہے دیوتاؤں کے کاموں کی طرف منسوب کرتے ہیں مگر عیسائی مذہب کے عالم اسکی تردید میں یہودیوں کی کتب مقدسہ اور انجیل کی وہ آیتیں پیش کرتے ہیں جن میں فرشتوں کے ایسے کام بیان کئے گئے ہیں جو کسی طرح اس رائے کے مطابق نہیں ہو سکتے۔ وہ بڑی دلیل یہہ پیش کرتے ہیں کہ

* کتاب پیدایش باب ۱۶ ورس ۷ و ۱۲ کتاب قضاۃ باب ۱۳ ورس ۱ و ۲۱۔ انجیل متی باب ۸ ورس ۲ و ۲۴ و باب ۲۲ ورس ۳۰ و اعمال باب ۱۰ ورس ۳

توبیتک اللہ

حضرت عیسیٰ کی نسبت کہا گیا ہے کہ وہ فرشتوں سے برتر ہیں سب اگر فرشتوں کا کوئی وجود اصلی نہو تو یہ کہنا مہمل ہو جاتا ہے۔

اب ہمکو اسبات کی تلاش کرنی ہے کہ قدیم مشرکین عرب کا یعنی اُس زمانہ کے عربوں کا جبکہ یہودیوں کا میل جول عرب میں نہیں ہوا تھا فرشتوں کی نسبت کیا خیال تھا، اور آیا وہ لفظ ملک اور ملائکہ کو انہیں معنوں میں خیال کرتے تھے جن معنوں میں کہ یہودی خیال کرتے تھے یا نہیں جہاں تک کہ ہمنے تفتیش کی ہے قدیم عربوں کا لفظ ملک اور ملائکہ کی نسبت ایسا خیال ہے اگر یہودیوں کا ہے ثابت نہیں ہوا،

مشرکین عرب بلاشبہہ ارواح فلکی کو یا ارواح فرضی کو یا ارواح اشخاص متوفی کو بطور خدا کے پوجتے تھے، اور انکو مجسم و متحیز سمجھتے تھے اور انکے بت اور انکے نام کے تھان اور انکے نام سے ہیکل اور مندر بناتے تھے مگر انپر کبھی لفظ ملک یا ملائکہ کا اطلاق نہیں کرتے تھے جہاں تک کہ ہمسے ہو سکا ہمنے اشعار جاہلیت پر بھی جسقدر کہ ہمکو دستیاب ہوئے غور کی ہے کوئی شعر بھی ایسا نہیں ملا جسمیں لفظ ملک یا ملائکہ کا اُن ارواحوں پر جنکو وہ پوجتے تھے اطلاق کیا گیا ہو ہمکو قرآن مجید میں بھی کوئی ایسی سند نہیں ملی جسمیں منقولاً بزبان مشرکین لفظ ملک یا ملائکہ کا اُن ارواحوں پر اطلاق کیا گیا ہو، ہاں یہہ بات تو تسلیم کی جاسکتی ہے کہ لغت کی کتابوں میں لفظ ملک کے معنی ایلچی یا رسول یا پیغامچی کے لکھے ہیں مگر یہہ تسلیم نہیں ہو سکتا کہ قدیم مشرکین عرب اُسکا اطلاق اُس قسم کے رسولوں پر کرتے تھے جنکو یہودی ملک یا ملائک کہتے تھے، ہاں اسقدر بات تسلیم ہو سکتی ہے کہ قدیم عرب اور نیز رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے عرب بھی ملائکہ کا اطلاق اُن قوا پر جنسے از روئے قانون قدرت دنیا کے امورات انجام پاتے ہیں کرتے تھے جیسے کہ ابو عبیدہ جاہلی کے اس شعر میں ہے ؎

لست لانسی ولکن لملاک	تنزل فی جو السماء بصوب

صوب کہتے ہیں مینہہ کو اسلئے اس شعر سے پایا جاتا ہے کہ مینہہ برسانے کی جو قوت ہے اُسکو فرشتہ سمجھتے تھے یہہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عرب فرشتوں کو متحیز بھی سمجھتے تھے جیسے کہ امیہ ابن صلت جاہلی کے اس شعر میں ہے۔

فکان برقع والملائک حوله	سدر تواکله القوائم اجرب

مگر اس بات کا کہ وہ اُنہیں معنی اور مراد میں استعمال کرتے تھے جن میں کہ یہودی استعمال کرتے ہے

عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝۹۲

ہنوز ثبوت طلب ہے، اس خیال کے ثبوت پر ایک بڑی دلیل یہہ ہے کہ فرشتوں کا کوئی نام بھی عربی زبان کا نہیں ہے، اور جبرئیل و میکائیل یہہ دو نام جو قرآن میں آئے ہیں وہ عبری ہیں اور اسرافیل و عزرائیل اور اور نام جو مسلمانوں میں مشہور ہیں سب عبرانی زبان کے ہیں، پس انہی اصول پر جو شارح مواقف اور صاحب مواقف نے قرار دئے ہیں، اہل لغت کا یہہ لکھنا کہ "الملائک الملک لانہ یبلغ عن اللہ تعالیٰ" مفید یقین نہیں۔

فقہ اللغۃ میں ملائکہ کی نسبت اہل عرب کا جو خیال لکھا ہے وہ بالکل ہمارے اس بیان کے مطابق ہے، اُس میں ابی عثمان الجاحظ کا قول لکھا ہے کہ "عرب جن کے درجے قرار دیتے تھے، جبکہ وہ عام طور پر جنکا ذکر کرتے تھے تو صرف لفظ جن بولتے تھے، اور جب ایسے جن کا ذکر کرتے تھے جو انسانوں کے ساتھہ رہتا ہو تو اُسکے لئے عامر کا لفظ بولتے تھے، جسکی جمع عمار ہے، اور جب ایسے جن کا ذکر کرتے تھے جو بچوں کو ستاتا ہے تو اُسکے لئے ارواح کا لفظ بولتے تھے، اور جبکہ وہ خبیث ہوتا اور تکلیف دیتا تھا تو اُسپر شیطان کا اطلاق کرتے تھے، اور جب اس سے بھی سخت تکلیف دیتا تھا تو اُسکو مارد کہتے تھے، اور جو اُس سے بھی زیادہ قوی ہوتا تھا اُسکو عفریت کہتے تھے، اور اگر وہ پاک ستھرا ہوتا تھا اور بالکل بھلائی اُس سے پہنچتی تھی تو اُسکو ملک کہتے تھے، اور ایک اَور مقام میں لکھا ہے "کہ حکم بن ابان نے عکرمہ سے اور اُنھوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے "کہ قریش جن کے سرداروں کو بنات الرحمن یعنی خدا کی بیٹیاں کہتے تھے"، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ عرب اُن غیر مرئی چیزوں کو جن کو نیک و پاکیزہ سمجھتے تھے، اور جن سے خالص بھلائی اور نیکی پہونچنے کا خیال کرتے تھے اُن کو ملک کہتے تھے، مگر وہ معنی اور مراد جو ملک کے لفظ سے مودیان سلف تہ... لئے تھے یا جو زمانہ اسلام کی کئی صدی بعد کی مصنفہ کتب لغت میں لکھہ دئے گئے ہیں اُن معنی و مراد میں عرب لفظ ملک کو استعمال نہیں کرتے تھے۔

عن ابی عثمان الجاحظ قال العرب تنزل الجن مراتب فاذا ذکروا الجنس قالوا جن واذا ارادوا انہ یسکن مع الناس قالوا عامر والجمع عمار فاذا کان ممن یتعرض للصبیان قالوا ارواح فان خبث وتعرم قالوا شیطان فان زاد علی ذلک قالوا مارد فان زاد علی القوۃ قالوا عفریت فان طہر ونظف وصار خیرا کلہ قالوا ملک، فی مقام آخر روی الحکم بن ابان عن عکرمہ عن ابن عباس ان قریشا کانت تقول سروات الجن بنات الرحمن

دشمن ہی کافروں کا (۹۲)

قرآن مجید میں کلام مقصود میں کسی جگہہ لفظ ملک یا ملائکہ کا اُس مراد سے استعمال نہیں ہوا ہے جو مراد کہ یہودیوں نے قرار دی تھی، جس کی تفسیر ہم ہر ایک مقام پر لکھینگے، بلکہ برخلاف اسکے ملائکہ کا اطلاق اُن قدرتی قوا پر جن سے انتظام عالم مربوط ہے، اور اُن شیون قدرت کاملہ پروردگار پر جو اُس کی ہر ایک مخلوق میں بہ تفاوت درجہ ظاہر ہوتی ہیں ملائکہ کا اطلاق ہوا ہے، سورہ والنازعات سے اُسکا بخوبی ثبوت ہوتا ہے، اُسکے پہلے چار جملوں کی نسبت مفسرین میں اختلاف ہے، مگر پانچویں جملہ، فالمدبرات امرا، کی نسبت کسی کو اختلاف نہیں، اور جملہ مفسرین متفق ہیں کہ مدبرات سے ملائکہ مراد ہیں، پس اب غور کرنا چاہیئے کہ مدبرات امور کون ہیں، یہی قوا ہیں جنکو خدا تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے تمام امور عالم کا مدبر مخلوق کیا ہے۔

ان آیتوں میں جنکی ہم تفسیر لکھتے ہیں کلام مقصود صرف اسقدر ہے، کہ جو شخص اُس وحی کا عدو ہو جو خدا نے محمد رسول اللہ صلعم کے دل میں ڈالی ہے، اور جو کوئی خدا اور اسکے فرشتوں اور اُس کے رسولوں کا دشمن ہو، تو بےشک اللہ اُن کافروں کا دشمن ہے۔ یہودیوں نے اپنے عندیہ میں دو جداگانہ فرشتے ٹھیرا رکھے تھے، ایک جبرئیل، اور ایک میکائیل، پچھلے کو اپنا دوست جانتے تھے اور پہلے کو اپنا دشمن، اور جو کہ دین محمدی کو وہ اپنے برخلاف خیال کرتے تھے، تو یہہ سمجھتے تھے کہ جبرئیل جو ہمارا دشمن ہے وہ آنحضرت صلعم کو یہہ باتیں سکھاتا ہے۔ خدا نے پیغمبر سے کہا کہ، تو کہدے کہ ہاں جبرئیل ہی اللہ کے حکم سے میرے دل میں یہہ باتیں ڈالتا ہے، مگر جو کوئی کہ اُن باتوں کا اور فرشتوں کا اور جبرئیل و میکائیل کا اور رسولوں کا دشمن ہے، خدا اُسکا دشمن ہے، فرشتوں کی دشمنی بیان کرنے کے بعد جبرئیل اور میکائیل کا بالتخصیص نام لینا گویا یہود کے خیالات کا اعادہ ہے اور وہ نام مقصود بالذات نہیں ہیں کیونکہ اگر یہودیوں کا یہہ خیال نہ ہوتا تو غالباً وہ نام نہ لئے جاتے پس ان دونوں کے نام قرآن مجید میں آنے سے یہہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ درحقیقت اس نام کے دو فرشتے معہ تشخصہما علاحدہ علاحدہ ایسی ہی مخلوق ہیں جیسے کہ زید و عمرو بلکہ انھی آیتوں سے پایا جاتا ہے کہ جس شے کو یہودی

† دیکھو صفحہ ۳۰

(۹۳) وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ
أَوَكُلَّمَا عَاهَدُوا عَهْدًا نَبَذَهُ فَرِيقٌ مِنْهُمْ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا
يُؤْمِنُونَ (۹۴) وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا
مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ
كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۹۵) وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ

جبریل تعبیر کرتے تھے وہ کوئی جداگانہ مخلوق مع تشخصہ نہ تھی کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ "بے شبہ اسنے (یعنی جبریل نے) ڈالا ہے تیرے دل پر اللہ کے حکم سے (وہ کلام جو) سچ بتاتا ہے اُس چیز کو جو اُس سے پیشتر ہے" دل میں ڈالنیوالی کوئی ایسی مخلوق جو اُس شخص سے جس کے دل میں ڈالا گیا ہے جداگانہ ہو نہیں ہوتی پس درحقیقت یہودی جسکو جبریل کہتے تھے اور جسکا نام حکایتاً خدا نے بیان کیا ہے وہ ملکہ نبوت خود آنحضرت میں تھا جو وحی کا باعث تھا اِس سے اگلی آیت میں خدا تعالی نے بلا ذکر جبریل کے فرمایا ہے کہ "بیشک ہمنے بھیجی ہیں تیرے پاس کھلی ہوئی نشانیاں"۔ ان وجوہات سے یہ بات کہ جبریل درحقیقت کسی فرشتہ کا نام ہے ثابت نہیں ہوتی ہاں اسقدر تسلیم ہو سکتا ہے کہ اُسی ملکہ نبوت پر جبریل کا اطلاق ہوا ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ باوجودیکہ خدا کے پاس ان دو فرشتون کے سوا اور بھی بہت سے فرشتے ہیں مگر بجز دو فرشتون کے اور سب بے نام ہیں کیونکہ کسی اور کا نام قرآن میں نہیں آیا حضرت عزرائیل بھی بڑے مشہور فرشتے ہیں جو سب کے پاس آوینگے اور کسی کو نہیں چھوڑینگے اگرچہ اُنکا ذکر بلفظ ملک الموت قرآن میں آیا ہے مگر اُنکا کچھ نام نہیں بیان ہوا ہے۔ ان سب باتون سے صاف پایا جاتا ہے کہ فرشتون کی نام یہودیوں کی مقرر کئے ہوئے ہیں جو مختلف قوی کی تعبیر کرنیکو اُنھوں نے رکھہ لئے تھے۔

۹۶ (واتبعوا) اِس آیت سے ساتویں آیت تک دو زمانے کے لوگون کا ذکر ہے ایک اُس زمانہ کی یہودیوں کا جو حضرت سلیمان کی وقت میں اور اُنکے بعد تھے اور ایک اُن لوگوں کا جو ہاروت و ماروت کے زمانہ میں تھے مگر سب سے اول پہلی آیت کے معنی سمجھنے چاہئین خدا نے فرمایا کہ "پیروی

اور بیشک ہمنے بھیجی ہیں تیرے پاس کُھلی ہوئی نشانیاں (یعنی احکام صریح) اور اُن سے انکار نہیں کرتے مگر فاسق ⦿۹۳ اور کیا یہ نہیں ہے کہ جب کبھی اُنھوں نے (یعنی یہودیوں نے) کسی عہد کا معاہدہ کیا تو اُنہی میں کے ایک فریق نے اُسکو پھینک دیا بلکہ اُنمیں کے اکثر اُسپر یقین ہی نہیں کرتے ⦿۹۴ اور جب کبھی اُنکے پاس خدا کے پاس سے کوئی پیغمبر آیا اُس چیز کو سچ بتاتا ہوا جو اُنکے پاس ہے، تو اُن لوگون میں کے ایک فریق نے جنکو کتاب کا (علم) دیا گیا تھا، خدا کی کتاب کو اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا گویا کہ وہ اُسکو جانتے ہی نہیں ⦿۹۵ اور پیروی کی اُس چیز کی جو شیاطین سلیمان کی سلطنت میں[†] پڑہتے تھے (یہ سمجھکر کہ سلیمان نے اُسکو کیا ہے)

کی اُس چیز کی جو شیاطین سلیمان کی سلطنت کی نسبت پڑہتے تھے" اور سلیمان نے کفر نہیں کیا" اِس آیت میں تین لفظ ہیں۔ ما۔ تتلو۔ کفر۔ تتلو کے معنی پڑہنے کے ہیں اور اِسی لفظ سے بعض مفسرین نے ما۔ کے لفظ سے جھوٹی کتابیں یا جھوٹی تحریریں مراد لی ہیں اور کفر کے لفظ سے لکھنا مراد لیا ہے اور اِس تفسیر کے مطابق آیت کا ترجمہ یون ہوتا ہے کہ" پیروی کی اُن جھوٹی کتابون یا تحریرون کی جو شیاطین سلیمان کی سلطنت کی نسبت پڑہتے تھے اور سلیمان نے کوئی کفر کی بات نہیں لکھی بلکہ شیاطین نے کفر کی باتیں لکھی تہیں" اسی طرح پر آیت کے معنی قرار دینے بالکل صحیح و درست ہیں مگر جو کہ آیت میں کوئی قید نہیں ہے اور تتلو۔ کے لفظ سے لکھی ہوئی ہی کا پڑہنا لازم نہیں آتا۔ بلکہ زبانی پڑہنے پر بھی اطلاق ہو سکتا ہے اِسلئے ہمنے ترجمہ بھی اُسیطرح عام لفظ سے کیا ہے جیسے کہ قرآن میں ہے۔

لیکن خدا نے جو یہ فرمایا ہے کہ" وما کفر سلیمان" اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ لوگ پڑہتے تھے اُسکی نسبت سمجھتے تھے کہ سلیمان نے اُسکو کیا یا کہا یا لکھا ہے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ سمجھتے بلکہ شیطانون ہی کا فعل سمجھتے تو سلیمان کو اُس سے بری کرنیکی ضرورت نہ ہوتی پس تقدیر آیت کی یوں ہوئی کہ" واتبعوا ما تتلوا الشیاطین علی ملک سلیمٰن" بظنہم انہ من سلیمان" وما کفر سلیمان ولٰکن الشیاطین کفروا" یعنی اور پیروی کی اُس چیز کی جو شیاطین ملک سلیمان کی نسبت پڑہتے تھے یہ سمجھکر کہ سلیمان نے اُسکو کیا ہے حالانکہ سلیمان نے کفر نہیں کیا، بلکہ شیاطین نے کفر کیا۔

[†] علی ملک سلیمان ای علی عہدہ ای زمان ملکہ۔ فالمضاف محذوف او زمان سلیمان فالملک مجاز عن العہد وعلی الاول تقدیرین

م علی بمعنی فی۔ (بیضاوی و عصام)۔

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ

اسکے آگے لفظ ہے "وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ" مگر سیاق اُس کلام کے جو اُسکے اوپر ہے اُسکا صاف یہ مطلب پایا جاتا ہے۔ کہ واتبعوا ما انزل بظنهم على الملكين یعنی پیروی کی اُس چیز کی جس کی نسبت وہ گمان کرتے تھے کہ دو فرشتوں پر اُتاری گئی ہے، پس اِس سے یہ ثابت نہیں ہوتا، کہ درحقیقت خدا کی جانب سے کوئی چیز اُن فرشتوں پر اُتاری گئی تھی، بلکہ صرف یہہ پایا جاتا ہے کہ جسطرح وہ لوگ اُن چیزوں کو سمجھتے تھے کہ وہ سلیمان سے ہیں، حالانکہ سلیمان سے نہیں تہیں، اسی طرح دونوں فرشتوں کی نسبت بہی سمجھتے تھے، کہ خدا کی طرف سے وہ علم انکو دیا گیا ہے، حالانکہ خدا کی طرف سے کچھ نہیں دیا گیا تھا۔

یہہ معنی جو ہمنے بیان کئے ہیں ایسے صاف اور صریح ہیں، کہ کوئی شخص بھی اُنکے صاف و صریح اور سیدہے ہونے میں کلام نہیں کرسکتا، اور کسی قسم کی تاویل بہی اس میں نہیں ہے، لفظوں سے اور عبارت سے و سیاق کلام سے جو صریح معنی نکلتے ہیں وہ بیان کئے ہیں، پس مخالفین قرآن نے جو یہہ اعتراض کیا ہے کہ قرآن سے ثابت ہوتا ہے، کہ خدا لوگوں کو جادو بہی سکہاتا ہے، اور ایسا ناپاک کام خدا نازل کرتا ہے، وہ ایک لغو و بیہودہ ناسمجھی کا اعتراض ہے، ہاں اسمیں کچھ شک نہیں، کہ ہمارے مفسرین نے بہت سی لغو باتیں اور جھوٹی روایتیں اور یہودیوں اور مجوسیوں کی حکایتیں اپنی تفسیروں میں بھردی ہیں، جسکا الزام خود اُن مفسروں پر ہے نہ قرآن پر۔

حضرت سلیمان کا زمانہ ایک ابتر حالت میں ہو گیا تھا۔ کافروں کو موافق اپنے مذہب اور عقائد کے پوجا پاٹ اور بت پرستی کرنے سے کچھ ممانعت نہ تہی، خود حضرت سلیمان نے نہایت کثرت سے بیویاں کرلی تہیں اور بت پرست عورتوں کو بہی اپنی بیویاں بنایا تھا۔ عمونی قوم کی اور موابی قوم کی اور صدوقی قوم کی بیویاں انکے گھر میں تھیں، اور وہ اپنے اپنے محلوں میں بت پرستی کرتی تھیں، اور اس سبب سے گویا شاہی محل میں بت پرستی ہونے لگی تہی، مگر خود حضرت سلیمان خدا کا نہایت ادب کرتے تھے، اور اُسکے نام کی کسی چیز کو بت پرستی کی آلایش میں شریک نہیں ہونے دیتے تھے، یہانتک کہ اُس محل میں جس میں حضرت داؤد رہتے تھے ایک دفعہ تابوت سکینہ آیا تھا تو اُسکے ادب سے اُنھوں نے اپنی ایک بت پرست بیوی کو وہاں رکھنا

اور سلیمان نے کفر نہیں کیا بلکہ شیاطین نے کفر کیا جو آدمیوں کو جادو سکھاتے تھے اور اُس چیز کی (پیروی کی جسکی نسبت وہ کہتے تھے) کہ بابل میں ہاروت اور ماروت دو فرشتوں پر اتاری گئی ہی

پسند نہیں کیا، اور اُس کے لئے جدا محل بنایا۔

سلیمان کی سلطنت اگرچہ بہت بڑی اور قوی تھی لیکن اُس میں بھی خرابیاں ہوگئی تھیں۔ حضرت داؤد جب نہایت ضعیف ہوگئے تو ادونیاہ اُنکے بڑے بیٹے نے یواب اور ابیاتار کی سازش سے تخت پر بیٹھنا چاہا، مگر حضرت سلیمان کی ماں نے جا کر حضرت داؤد کو خبر کی، اور سلیمان کو تخت پر بیٹھانے کی درخواست کی، اور حضرت داؤد نے سلیمان کو تخت پر بیٹھنے کی اجازت دیدی، اور بنایاہ اور صادوق اور ناتان نبی نے حضرت سلیمان کو تخت پر بیٹھا دیا، مگر ادونیاہ اور یواب اور ابیاتار دل میں مخالف تھے، اور گویا دو گروہ خدا پرستوں کے ایک دوسرے کے مقابلہ میں قایم ہوگئے تھے، اور میرا گروہ بت پرستوں کا موجود تھا، اور گویا حضرت سلیمان کے شریکوں میں یا ساتھیوں میں شمار ہوتا تھا۔

یہ سب واقعات تاریخی ہیں، اور ایسے واقعات کا مقتضا یہ ہے کہ ہر ایک گروہ کے مجمعے جدا جدا قایم ہوگئے ہونگے، اور ایک گروہ دوسرے گروہ سے اپنے رازوں کو مخفی رکھتا ہوگا۔ یہی بنا، معلوم ہوتی ہے جسکے سبب حضرت سلیمان کے وقت میں وہ مجمع قایم ہوگیا تھا، جسکو اس زمانہ میں فری میسن کہتے ہیں، اور ہمارے ملک کے لوگوں نے جادو گھر اُسکا نام رکھا ہے۔ اس قسم کا مجمع راز حیرام بادشاہ صور کے ہاں بھی تھا۔ یہ بادشاہ حضرت داؤد کا بہت دوست تھا، اور کچھ عجب نہیں کہ وہیں سے اس مجمع راز کے قایم کرنے کو اخذ کیا ہو، اور فیثاغورث حکیم نے بھی اسی قسم کا ایک مجمع راز اپنے شاگردوں کے لئے قایم کیا تھا۔

ان تمام حالات کا مقتضا یہ تھا کہ کچھ پوشیدہ راز آپس میں ہوں، اور کچھ پوشیدہ تحریریں بھی ہوں اور انمیں کچھ اصلی ہوں، اور کسی وقت میں لوگوں نے جعلی اور مصنوعی باتیں اور تحریریں اُس میں ملادی ہوں اور اُنکو بھی اصلی تحریریں ظاہر کیا ہو۔ جھوٹی تحریروں کے اس اختلاط کا حضرت سلیمان کے گروہ میں پیدا ہونا بہت احتمال رکھتا ہے، کیونکہ اُنکے محل میں بت پرست عورتیں موجود تھیں اور تمام بت پرست قومیں انکی حامی اور مددگار تھیں، اور وہ اپنی مذہبی رسم و رواج اور پوجا پاٹ کے قایم رکھنے کو زیادہ راغب ہونگی۔ اور سلیمان کے بعد اُن جھوٹی تحریروں کو جن میں کفر کی باتیں بھی ہونگی لوگوں نے سلیمان کی تحریریں

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

گمان کر کے اختیار کیا ہوگا، اور اُنکی پیروی کرتے ہونگے اسی امر کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ وہ سلیمان کی تحریریں نہیں تہیں بلکہ شیطانوں یعنی کافروں کی تحریریں تہیں، اور اُنہوں نے ہی اُن میں کفر کی باتیں لکہی تہیں، سلیمان نے نہیں لکہی تہیں۔ پس یہ ایک تاریخی* واقعہ ہے جسکا اشارہ قرآن میں ہے۔

شیاطین کے معنی ہمنے کافروں کے لئے ہیں، بیضاوی میں لکہا ہے کہ "الشیاطین من الجن والانس او منہما" یعنی شیاطین کے لفظ سے یا تو شیاطین جن مراد ہیں یا شیاطین انس یعنی شریر آدمی یا دونوں تفسیر کبیر میں بہی لکہا ہے کہ اکثر مفسر شیاطین سے شیاطین جن مراد لیتے ہیں، اور معتزلی شیاطین انس، اور بعضے دونوں کو قرار دیتے ہیں، لیکن ہر ایک سمجہدار آدمی سمجہہ سکتا ہے کہ شیاطین سے شیاطین الجن مراد لینا مذہب کو ایک عجوبہ بناتا ہے، اور شیاطین سے شیاطین الجن مراد لینی پر نہ کوئی تاریخی دلیل ہے نہ کوئی عقلی دلیل ہے، اور نہ اس آیت میں کوئی اس قسم کا اشارہ ہے، بلکہ جو تاریخی واقعہ ہمنے اوپر بیان کیا اُس سے صاف پایا جاتا ہے، کہ وہی کافر مراد ہیں جنہوں نے کفر کی جہوٹی تحریریں یا جہوٹی باتیں بنائی تہیں یا

ہاروت اور ماروت دونوں تاریخی شخص ہیں، یعنی اُنکا وجود تاریخ کی کتابوں سے پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں شخص شام کے رہنے والے تہے، قرآن مجید میں اُنکا کوئی قصہ بجز اُسکے جو بیان ہے بیان نہیں ہوا ہے تمام قصے جو مفسرین نے اُنکی نسبت اپنی تفسیروں میں بہر لئے ہیں اُن کی کچہہ اصل مذہب

* اس زمانہ میں بہی ایسی تحریریں موجود ہیں جو سلیمان کی طرف منسوب ہیں، مگر خود یہودی اور عیسائی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ مصنوعی تحریریں ہیں، سلیمان کی نہیں ہیں۔

اور وہ کسی کو نہ سکھاتے یہانتک کہ کہتے کہ ہم تو بجز فتنہ کے اور کچھ نہیں ہیں پس تم کافر

نہ ہو پہر اُن دونوں سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے جدائی ڈالدیں مرد میں اور اُس کی جورو میں

اور وہ اُس سے کسی کو ضرر نہیں پہونچاتے تھے بجز خدا کے حکم کے اور اُنسے سیکھتے تھے وہ چیز جو

انکو نقصان دیتی تہی اور انکو نفع نہ پہونچاتی تہی اور بیشک وہ جانتے ہیں کہ جس کسی نے جادو

کو مول لیا اُسکے لئے آخرت میں کچھ حصّہ نہیں ہے اور جس چیز کے بدلے اپنے آپکو

اُنہوں نے بیچ دیا بیشک وہ بُری ہے کاش کہ وہ جانتے ہوتے (۹۶)

اسلام میں نہیں ہے جتنی روایتیں اُنکی نسبت مذکور ہیں وہ سب مصنوعی اور جہوٹی ہیں۔ مسٹر ہائیڈ کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ مجوسیوں کے ہاں اُنکی نسبت بہت سے قصے لغو مشہور تہے ہمارے مفسرین کی یہ عادت ہے کہ کسی کے ہاں کا قصہ ہو جب وہ اپنی تفسیروں میں اُسکو داخل کرتے ہیں تو اُسکے ساتھ ایک ایسی مصنوعی روایت داخل کردیتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ یہ مسلمانی روایت ہے مگر اس جہوٹ کا جو الزام ہے وہ مفسرین یا راویوں پر ہے قرآن اُس سے بری ہے۔

یہ دونوں فرشتے نہیں تہے بلکہ آدمی تہے۔ ہمارے ہاں کے بعض مفسروں نے بہی اُنکو آدمی قرار دیا ہے چنانچہ حسن نے ملکین کے لفظ کو لام کے زیر سے پڑہا ہے جسکے معنی دو بادشاہوں کے ہیں اور ضحاک سے اور ابن عباس سے بہی لام کے زیر سے پڑہنا روایت کیا گیا ہے۔ پہر اُن میں اس بات پر اختلاف ہوا کہ وہ کون تہے حسن کا قول ہے کہ وہ دونوں بابل میں عجم کے کافروں میں سے تہے بغیر ختنہ کئے ہوئے کہ لوگوں کو جادو سکہاتے تہے اور یہ بہی کہا گیا ہے کہ وہ دونوں بادشاہوں میں سے صالح آدمی تہے۔

قراء الحسن ملکین بکسر اللام وهو مروی ایضا عن الضحاك وابن عباس ثم اختلفوا فقال الحسن کانا علجین اقلفین ببابل یعلمان الناس السحر وقیل کانا رجلین صالحین من الملوك۔ تفسیر کبیر

ہم ملکین کے لفظ کو مطابق قرأت مشہورہ لام کے زبر سے پڑہتے ہیں مگر فرشتے مراد نہیں لیتے بلکہ آدمی ہی مراد لیتے ہیں جسکو لوگ نیک سمجہتے ہیں اُس پر فرشتے کا اطلاق کرتے ہیں۔ قرآن مجید سے

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۹۹﴾

سے بھی کافروں میں اس محاورہ کا ہونا پایا جاتا ہے جسطرح کہ زلیخا کی سہیلیوں نے حضرت یوسف کو دیکھکر کہا تھا کہ "ما هذا بشرا ان هذا الا ملك كريم" اور مجوسیوں میں بھی ایسا استعمال تھا اور ہائیڈ صاحب کی کتاب سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مجوسی ہاروت ماروت کو فرشتہ کہتے تھے۔
پس اس آیت میں جسطرح کہ لوگوں کے اس گمان کو، کہ جو علم اُنکے پاس تھا وہ خدا کی طرف سے اُتارا گیا تھا، بیان کیا گیا ہے، اُسی طرح پر حسب خیال سے کہ وہ انکو فرشتہ کہتے تھے ملکین کا لفظ لام کے زبر سے لایا گیا ہے یعنی اُن لوگون نے اُس چیز کی پیروی کی جسکی نسبت وہ کہتے تھے کہ بابل میں ہاروت و ماروت پر جنکو وہ فرشتہ کہتے تھے خدا کی طرف سے اتاری گئی ہے پس خدا نے نہ یہ فرمایا ہے کہ جو علم اُنکے پاس تھا وہ خدا کی طرف سے اُتارا ہوا تھا، اور نہ یہ فرمایا ہے، کہ وہ دونوں فرشتے تھے، بلکہ جو زعم ان دونوں باتوں کی نسبت کافروں یا یہودیوں کا تھا وہ بیان کیا ہے۔
اب ایک شبہہ باقی رہ جاتا ہے کہ وہ جادو سیکھنے والوں کو منع کیوں کرتے تھے کہ تم مت سیکھو اور کافر مت بنو یعنی بُرا کام کرنے والے مت بنو، یہہ بات کچھ تعجب کی نہیں ہے۔ جادو سے اپنے خیال میں نقصان پھونچانا، خواہ فی الحقیقت اُس سے نقصان پہونچتا ہو یا نہیں، ہر کوئی یہاں تک کہ جادوگر بھی بُرا جانتا ہے، اور اسی وجہ سے وہ سیکھنے والے کو منع کرتے تھے، اس زمانہ میں بھی بہت لوگ ایسے ہیں جو کوئی بُرا کام جانتے ہیں، مگر جب کوئی اُنسے سیکھنا چاہتا ہے تو کہتے ہیں،

اور اگر وہ یقین لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو بلاشبہ اللہ کے پاس کا ثواب بہتر تھا کاش کہ وہ جانتے ہوتے (۹۷) اے لوگوں جو ایمان لے آئے ہو تم راعنا کا لفظ مت کہو بلکہ انظرنا کا لفظ کہو اور اچھی طرح سنو اور کافروں کے لیے دکھ دینے والا عذاب ہے (۹۸) نہیں دوست رکھتے اہل کتاب میں سے وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا ہے اور نہ مشرکین اس بات کو کہ اتاری جاوے تم پر کچھ بھلائی تمہارے پروردگار سے اور اللہ مخصوص کرتا ہے اپنی رحمت سے جسکو چاہتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے (۹۹)

ہیں کہ یہہ خراب کام ہے کیوں سیکھتے ہو لیکن جب سیکھنے والا اصرار کرتا ہے تو سکھا دیتے ہیں پس ہاروت اور ماروت کا سیکھنے والوں کو ایسا کہنا ایک عام مجرا طبعی کے موافق تھا۔

اسی آیت میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ سحر باطل ہے یعنی سحر کچھ موثر نہیں ہے کیونکہ خدا تعالی نے فرمایا ہے کہ وہ کسی کو بسبب اپنے سحر کے کچھ نقصان پہونچانیوالے نہ تھے" اور یہ کہنا نص صریح اس بات پر ہے کہ سحر کچھ اثر نہیں رکھتا" اور یہی معنی سحر کو باطل ہونے کے ہیں۔ آگے جو خدا نے فرمایا کہ "الا باذن اللہ" اسکے یہہ معنی سمجھنا کہ انکا سحر خدا کے حکم سے اثر کرتا تھا محض غلطی اور ناسمجھی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عامل یا جادوگر کسی کام کے لئے عمل یا جادو پڑھتا ہے اور وہ کام اتفاقیہ اسکی خواہش کے مطابق ہو جاتا ہے" اور شبہ پڑتا ہے کہ عمل یا جادو کے اثر سے ہوا ہے۔ اس شبہ کو مٹانے کو خدا نے فرمایا" الا باذن اللہ" یعنی ایسی حالت میں جو کام ہو جاتا ہے وہ خدا کے حکم سے ہو جاتا ہے" کچھ جادو یا عمل کے سبب سے نہیں ہوتا۔

ہمنے اوپر بیان کیا تھا کہ ان آیتوں میں دو زمانہ کے لوگوں کا ذکر ہے۔ ایک اس زمانہ کے یہودیوں کا جو حضرت سلیمان کے وقت میں اور انکے بعد تھے" اور ایک ان لوگوں کا جو ہاروت اور ماروت کے زمانہ میں تھے۔ پس جان لینا چاہیئے کہ پچانوے آیت کے شروع سے ان لفظوں تک کہ "بابل میں ہاروت و ماروت دو فرشتوں پر اوتاری گئی ہے" ان لوگوں کا ذکر ہے جو حضرت سلیمان کے وقت میں اور ان کے بعد تھے۔ اور ان الفاظ سے کہ "اور وہ کسی کو نہیں سکھاتے" ان الفاظ تک کہ "اور ان سے سیکھتے تھے وہ چیز جو انکو نقصان دیتی تھی اور نفع نہ پہنچاتی تھی" ان لوگوں کا ذکر ہے جو ہاروت و ماروت کے زمانہ میں تھے"

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ

اور اُسکے بعد عام یہودی مخاطب ہیں جو توریت سے جانتے تھے کہ جادو گناہ اور کفر ہے۔

(۱۰۰) (ما ننسخ) اس آیت کی تفسیر میں ہمارے ہاں کے مفسروں نے بے انتہا کج بحثیاں کی ہیں اور مذہب اسلام کو بلکہ خدا کو بدنام کیا ہے اور قرآن مجید کو ایک شاعر کی بیاض بنا دیا ہے، اُنہی کج بحثیوں میں بعض مفسرین نے جنکو خدا نے ہدایت کی ہے سیدھی راہ بھی اختیار کی ہے، ہر ایک شخص جسکے مزاج میں کج بحثی نہیں ہے وہ اس آیت کو اور اس سے پہلی آیت کو پڑھ کر سیدھا اور صاف مطلب سمجھ سکتا ہے، اس آیت سے پہلی آیت میں خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے، کہ اہل کتاب اسبات کو دوست نہیں رکھتے کہ خدا کی طرف سے تم پر کچھ بھلائی اُترے، اور بھلائی سے علانیہ مراد قرآن اور احکام شریعت ہیں۔ اہل کتاب جو اس بات کو دوست نہیں رکھتے تھے اُسکی صاف صاف دو وجہیں تھیں۔ اول یہہ کہ تمام انبیا بنی اسرائیل میں گذرے تھے، اور اُنکو پسند نہیں تھا کہ بنی اسمعیل میں جنکو وہ بالطبع حقیر بھی سمجھتے تھے کوئی نبی پیدا ہو۔ اسکی نسبت خدا نے فرمایا کہ اللہ مخصوص کرتا ہے اپنی رحمت سے جسکو چاہتا ہے۔ دوسری وجہ یہہ تھی کہ احکام شریعت محمدی کے موسوی شریعت کے احکام سے کسیقدر مختلف تھے، اور یہودی اپنی شریعت کی نسبت سمجھتے تھے کہ وہ دائمی ہے، اور کبھی کوئی حکم اُسکا تبدیل نہیں ہونیکا۔ اُسکی نسبت خدا تعالیٰ نے فرمایا، کہ جو آیت کہ ہم منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اُسکی جگہہ اُسی کی مانند یا اُس سے بہتر آیت دیتے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس مقام میں آیت کے لفظ سے قرآن کی آیت مراد نہیں ہے، بلکہ موسوی شریعت کے احکام جو شرع محمدی میں تبدیل ہو گئے، یا جن احکام شریعت موسوی کو یہودیوں نے بھلا دیا تھا وہ مراد ہیں۔ ہمارے اکثر مفسرین نے نہایت کج بحثی سے اس آیت میں جو لفظ "آیت" ہے اُسکو قرآن مجید کی آیتوں پر محمول کیا ہے اور یہہ سمجھا ہے کہ قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت سے منسوخ ہو جاتی ہے، اور اسی پر بس نہیں کی، بلکہ ننسہا کے لفظ سے یہ قرار دیا کہ پیغمبر خدا صلعم بعض آیتوں کو بھول بھی گئے تھے، اور ان دو لفظوں یعنی نسخ اور ننسہا کی بناپر جھوٹی اور مصنوعی روایتوں کے بیان کرنے سے اپنی تفسیروں کے ورق کے ورق سیاہ کر دئے ہیں، مگر اُن میں کی ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے، اُنہی جھوٹی روایتوں کی بنا پر اُنھوں نے قرآن کی آیتوں کو چار قسم کی آیتوں پر تقسیم کیا ہے۔

ہم آیت میں سے منسوخ کرتے ہیں

اول وہ آیتیں جنکی تلاوت اور احکام دونوں بحال ہیں اور وہ سب آیتیں قرآن میں موجود ہین۔

دوم۔ وہ آیتیں جنکی تلاوت بحال ہے اور احکام منسوخ ہو گئے ہیں۔ ان آیتوں کی نسبت بھی کھتے ہیں کہ قرآن میں موجود ہیں۔

سوم۔ وہ آیتیں جنکی تلاوت منسوخ ہو گئی ہے مگر احکام بحال ہیں۔

چہارم وہ آیتیں جنکی تلاوت اور احکام دونوں منسوخ ہو گئے ہیں۔ اور تیسری اور چوتھی قسم کی آیتوں کی نسبت کھتے ہیں کہ قرآن میں موجود نہیں ہیں، مگر اُن جھوٹی روایتوں میں اُنکا موجود ہونا بیان کرتے ہیں

ہم اِن باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتے، اور یقین جانتے ہیں کہ جو کچھ خدا کی طرف سے اُترا وہ بے کم و کاست موجودہ قرآن میں جو درحقیقت آنحضرت صلعم کے زمانہ حیات میں تحریر ہو چکا تھا موجود ہے، اور کوئی حرف بھی اِس سے خارج نہیں ہے، اور نہ قرآن مجید کی کوئی آیت منسوخ ہے، بلکہ احکام ادیان سابقہ کی نسبت بھی لفظ نسخ کا مجازی معنی میں استعمال ہوا ہے نہ حقیقی معنی میں۔ اِسکی تشریح کے لئے ہمکو نسخ کے معنوں سے بحث کرنی پڑے گی، اور جو احکام کہ تبدیل ہو گئے ہیں اُنکی بھی حقیقت بیان کرنی ہوگی، لیکن قبل اسکے ہمکو اُن مفسروں کی رائے کا بیان کرنا مناسب ہے، جنہوں نے آیت کے لفظ سے جو اس آیت میں ہے، قرآن کی آیتیں مراد نہین لی ہیں۔

قال ابو مسلم۔ ان المراد من الایات المنسوخۃ هی الشرایع التی فی الکتب القدیمۃ من التوراۃ و الانجیل کالسبت والصلوٰۃ الی المشرق والمغرب مما وضعه اللہ تعالی عنا و تعبدنا بغیرہ فان الیهود والنصاری کانوا یقولون لا تؤمنوا الا لمن تبع دینکم فابطل اللہ علیهم ذلک بهذ الایۃ۔

ابو مسلم صرف ایک شخص ہے جو خلاف جمہور مفسرین کے ہماری راے سے متفق ہے۔ اُسکا بھی یہی عقیدہ ہے کہ قرآن میں نسخ واقع نہیں ہوا، اور اُسکا قول ہے کہ آیات منسوخہ سے مراد وہ شریعتیں ہیں، جو کتب متقدمہ یعنی توریت اور انجیل میں تھیں، جیسے کہ سبت کا ماننا اور مشرق اور مغرب کی طرف نماز کا پڑھنا، اور اسی قسم کے حکموں کی مانند جو اللہ نے ہم سے دور کر دیئے ہیں، اور ہم بغیر اُسکے عبادت کرتے ہیں یہود اور نصاریٰ کہتے تھے کہ بجز اُسکے جو ہمارے دین کا تابع ہو اور کسی پر ایمان نہ لاؤ، پس اللہ نے اس آیت سے اُسکو باطل کر دیا۔

اَوْ نُنْسِهَا

ومن الناس من اجاب بان الاية اذا اطلقت فالمراد بها ايات القرآن لانه هو المعهود عندنا۔

والقائل ان يقول لا نسلم ان لفظ الاية مختص بالقرآن بل هو عام في جميع الدلائل (تفسیر کبیر صفحہ ۴۲۶ جلد ۱)

بعض آدمیون نے اِسکا یہہ جواب دیا ہے کہ آیت کا لفظ جبکہ اطلاق کیا جاتا ہے تو اُس سے قرآن ہی کی آیتیں مراد ہوتی ہیں کیونکہ ہمارے نزدیک وہی آیتیں مقرر ہیں۔

لیکن کوئی شخص اسکا جواب دے سکتا ہے کہ ہم یہہ بات نہیں مانتے کہ آیت کا لفظ قرآن کی آیتون سے مخصوص ہے، بلکہ وہ عام ہے اور ہر دلیل پر بولا جاتا ہے۔

امام فخر الدین رازی نے یہہ بات تسلیم کرلی ہے، کہ قرآن مجید میں منسوخ آیتیں ہیں پر اس آیت سے استدلال کرنا ٹھیک نہیں ہے، اور اِس لئے اُنہون نے اور آیتون سے استدلال کیا ہو چنانچہ تفسیر کبیر میں وہ لکھتے ہیں کہ ہمنے کتاب محصول میں جو اصول فقہ میں ہے تمام بحثیں جو عدم نسخ پر دلالت

واعلم انا بعد ان قررنا هذه الجملة في كتاب المحصول في اصول الفقه تمسكنا في وقوع النسخ بقوله تعالى ما ننسخ من اية او ننسها نات بخير منها او مثلها الاستدلال به ايضا ضعيف لان ما ههنا تفيد الشرط والجزاء وكما ان قولك من جاءك فاكرمه لا يدل على حصول المجئ بل على انه متى جاء وجب الاكرام فكذا هذه الاية لا تدل على حصول النسخ بل على انه متى حصل النسخ وجب ان ياتي بما هو خير منه فالاقوى ان نعول في الاثبات على قوله تعالى واذا بدلنا اية مكان اية وقوله يمحو الله ما يشاء ويثبت وعنده ام الكتاب والله اعلم (تفسیر کبیر جلد ۱ صفحہ ۴۲۶)

کرتی ہیں بیان کرکے، ہم نے وقوع نسخ پر اسی آیت ما ننسخ پر استدلال کیا ہے۔ مگر اس آیت پر استدلال کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اسلئے کہ ما کا لفظ اس جگہہ بطور شرط اور جزا کے ہے، جیسے کہ تم کسی کو کہو کہ جو شخص تیرے پاس آئے تو اُسکی تعظیم کر، تو یہہ کہنا کسی شخص کے آنے پر دلالت نہیں کرتا بلکہ صرف اتنا نکلتا ہے، کہ جب کوئی آوے تو اُسکی تعظیم کرنی واجب ہے۔ اسیطرح یہ آیت بھی حصول نسخ پر دلالت نہیں کرتی، بلکہ اِس سے یہہ نکلتا ہے کہ جب کوئی آیت منسوخ ہو تو اُسکے بدلے دوسری آیت جو اُس سے اچھی ہو لانی واجب ہے۔ پس ٹھیک بات یہ ہے کہ نسخ کے ثبوت میں ہم اور آیتون کو اختیار کریں، یعنی اِس آیت کو، "واذا بدلنا اية مكان اية" اور اِس آیت کو، "يمحو الله ما يشاء ويثبت وعنده ام الكتاب"۔

یا ہم اُسکو بھلا دیتے ہیں

ہم امام فخرالدین رازی کا شکر کرتے ہیں کہ اُنھوں نے اسقدر تو ہمسے اتفاق کیا کہ اس آیت سے قرآن میں آیت منسوخہ کا موجود ہونا ثابت نہیں ہوتا مگر خدا نے چاہا تو ہم بتادینگے کہ اُن آیتوں سے بھی جنپر امام رازی نے منسوخ ہونے کا استدلال کیا ہے حقیقتاً منسوخ ہونا آیتوں کا ثابت نہیں ہوتا۔

ناسخ و منسوخ کی بحث درحقیقت ایک لغو بحث ہے اُس پر بحث کرنیکی ضرورت صرف اسوجہ سے ہوگئی ہے کہ فقہاے اسلام نے نہایت غلط قیاس اور بیجا استدلال سے اور صرف اپنے دل کے پیدا کئے ہوئے خیالات سے قرآن کی آیتوں کا اسطرح پر منسوخ ہونا قرار دیا ہے، جو خدا کی شان اور قرآن کے ادب کے بالکل برخلاف ہے، اور ہرگز مذہب اسلام کا وہ مسئلہ نہیں ہے، اور نہ اُن فقہا کی استنباط کے لئے کوئی دلیل ہے۔ اُنھوں نے جو آیات منسوخہ کو تین قسم یعنی منسوخ الحکم و ثابت التلاوت، اور منسوخ التلاوت و ثابت الحکم، اور منسوخ التلاوت والحکم قرار دیا ہے، یہہ محض جھوٹی تقسیم ہے، اور خود اُنکے دل کی بنائی ہوئی ہے، اور مفسرین نے جھوٹی اور بے سند روایتیں اپنی تفسیروں میں بھردی ہیں، اور اگر ناسخ اور منسوخ کی بحث صرف اتنی بات پر منحصر رہتی، کہ آیا شرایع سابقہ میں کوئی ایسے احکام تھے جو اب شریعت اسلام میں نہیں رہے، یا اُنکے عوض دوسرے احکام آئے اور شرایع سابقہ کے احکام منسوخ ہوگئے یا نہیں۔ یا یہ کہ خود اسلام میں کوئی ایسے احکام تھے جو بعد کو قایم نہ رہے، یا اُسکے بدلے اور احکام آئے، اور پہلے احکام منسوخ ہوگئے یا نہیں، تو یہ بحث البتہ دلچسپ اور ذی عقلوں کی سی بحث ہوتی، اور اس پر مباحثہ کرنے کی کچھ ضرورت نہ پڑتی کیونکہ جو لوگ احکام کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں، اور جو اُنکے منسوخ ہونیکے قایل نہیں ہیں جب اُن دونوں کی بحثوں پر غور کیا جاوے تو بجز نزاع لفظی کے، یا ناسخ و منسوخ کو بطور ایک علمی اصطلاح کے قرار دینے کے، اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، پس ہم اسبات سے کہ قرآن کی آیتوں میں سے کوئی آیت منسوخ التلاوت و ثابت الحکم، یا منسوخ التلاوت والحکم ہے، انکار کرکے اسبات کی بحث پر متوجہ ہوتے ہیں کہ آیا قرآن میں ایسی آیتیں جنپر ثابت التلاوت و منسوخ الحکم ہونیکا اطلاق ہوسکے موجود ہیں یا نہیں، نتیجہ اس بحث کا صرف یہ ہوگا کہ آیا قرآن میں احکام منسوخہ ہیں یا نہیں،

نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا

یا ایک آیت کا حکم دوسری آیت کے حکم کو منسوخ کرتا ہے یا نہیں اور نتیجہ اس بحث کا بجز نزاع لفظی کے اور کچھ نہوگا

نسخ کے معنی لغت میں کسی شے کے دور کر دینے کے اور متغیر کر دینے کے اور باطل کر دینے کے ہیں، خواہ اُسکی جگہہ کوئی دوسری چیز قایم ہوئی ہو یا نہوئی ہو اور نقل و تحویل کے معنی بھی ہیں، اور اِس بحث سے کہ ان معنوں میں سے اصلی کونسے ہیں اور مجازی کونسے ہمکو چنداں فائدہ نہیں ہے، مگر جب اس لفظ کو کسی خاص علم میں استعمال کیا جائیگا مثلاً شرع میں، تو اِس کی تعریف میں کچھ ایسے الفاظ بڑہانے ہونگے جس سے وہ معنی اُس علم کے مناسب ہو جاویں۔ پس شرع میں نسخ کے معنی یہ ہونگے کہ ایک شرعی حکم کا کسی دوسرے شرعی حکم سے زائل یا متغیر یا باطل ہونا۔ پہلا حکم منسوخ کہلائیگا، اور دوسرا حکم ناسخ۔

ناسخ کے معنی علما نے یہہ قرار دئے ہیں، کہ ناسخ سے مراد ایک ایسے شرعی قاعدہ سے ہے، جو اسبات پر دلالت کرے کہ اُس سے پہلے جو حکم بقاعدہ شرعی ثابت ہو چکا تھا، اِسکے بعد نہیں رہا، ایسی حالت میں کہ اگر یہہ پچھلا حکم نہوتا تو وہ پہلا حکم ثابت اور قایم رہتا۔

> ان الناسخ فی اصطلاح العلماء عبارۃ عن طریق شرعی یدل علی ان الحکم الذی کان ثابتا بطریق شرعی لا یوجد بعد ذلک مع تراخیہ عنہ علی وجہ لولاہ لکان ثابتا
> (تفسیر کبیر جلد ۱ صفحہ ۴۵۹)

اِس تعریف میں جو قیدیں کہ علما نے لگائی ہیں اُسکے یہہ فائدے بتائے ہیں، کہ قاعدہ شرعی کی جو قید لگائی ہے وہ اسلئے لگائی ہے کہ اُس میں خدا و رسول کے قول و فعل شامل ہو جائیں، اور اجماع اُمت علی احد القولین خارج ہو جاوے کیونکہ جو طریق شرعی کی تفسیر یہاں بیان ہوئی ہے اُس میں اجماع داخل نہیں ہوتا، اور اِس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ شرع عقلی حکم کی ناسخ ہو کیونکہ حکم عقلی کا ثبوت شرعی قاعدہ پر نہیں ہوتا، اور یہہ بھی لازم نہیں آتا کہ معجزہ شرعی حکم کا ناسخ ہو کیونکہ وہ معجزہ شرعی طریق سے ثابت نہیں ہوتا۔ اور اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ حکم کسی مدت یا شرط یا استثنا پر مقید ہو کیونکہ ایسی حالت کی جو شرط لگائی ہے اُس سے یہ سب خارج ہو جاتی ہیں، اور اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ اگر خدا نے ہمکو کسی کام کرنیکا ایک دفعہ حکم دیا، اور پھر اُس کام کی مانند دوسرا کام کرنیکو حکم کیا تو یہ حکم اُسکا ناسخ ہوگا کیونکہ اگر یہ منع نہوتا تب بھی وہ حکم ثابت نہ تھا۔

تو اُس سی بہتر یا اُسی کی مانند لاتے ہیں

یہ تعریف ناسخ کی جو گویا ناسخ و منسوخ دونوں کی تعریف ہے ظاہر ہے کہ منصوص نہیں ہے یعنی ظاہر ہے کہ
یہ تعریف ناسخ و منسوخ کی نہ خدا نے بتائی ہے نہ رسول نے بتائی ہے بلکہ علما نے خود اپنے قیاس اور
خیال اور استنباط سے قایم کی ہے اور کسی مسلمان پر واجب نہیں ہے کہ خواہ نخواہ اس تعریف کو تسلیم
کرے ہمارے نزدیک جسوقت نسخ کو شرع سے متعلق کیا جائیگا تو اُسوقت حیثیت کو اُسکا جزو قرار
دینا واجب اور لازم ہوگا کیونکہ جسقدر احکام شرعی ہیں وہ سب کسی نہ کسی حیثیت پر مبنی ہیں پس
اگر باوجود بقا اُس حیثیت کے جس پر وہ حکم صادر ہوا تھا دوسرا حکم برخلاف پہلے حکم کے صادر کیا جاوے
تو کہا جائیگا کہ دوسرا حکم ناسخ ہے اور پہلا حکم منسوخ اور اگر وہ حیثیت جسکی بنا پر پہلا حکم صادر ہوا
تھا موجود نہ رہے تو دوسرا حکم پہلے حکم کا حقیقۃً ناسخ نہیں ہے گو مجازاً ایک کا دوسرے کو ناسخ کہیں۔
ذات باری کے تنزہ اور اُسکے تقدس اور اُسکے علم و دانش میں نقصان اُسی وقت لازم آتا ہے
جبکہ ایک حیثیت کے لحاظ سے کوئی حکم دیا ہو اور پھر باوجود موجود ہونے اُسی حالت و حیثیت
کے دوسرا حکم اُسکے مخالف دیا ہو لیکن اگر حالت اور حیثیت مختلف ہو گئی ہو تو دوسرا حکم دینا اُسکی
تقدس کو کچھ نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ نہ دینا اُسکے تقدس اور علم و دانش کو نقصان پہونچاتا ہے۔ پس ہم
قبول کرتے ہیں کہ ایسے احکام بھی موجود ہیں جو شرایع سابق میں ماموربہ تھے اور شرایع مابعد میں ماموربہ
نہیں رہے یا بالفرض ہم تسلیم کرلیں کہ خود مذہب اسلام ہی میں اول کوئی حکم ماموربہ تھا اور پھر بعد کو ماموربہ
نہیں رہا اور یہ بھی ثابت ہو کہ حیثیت اور حالت بھی نہیں رہی تھی تو ہم ایک کو دوسرے کا ناسخ نہیں قرار
دینگے اور ہم کیا کوئی ذی عقل بھی ہندو مسلمان یہودی عیسائی دہریہ اُنمیں سے کسی کو ناسخ و منسوخ نہیں
کہنے کا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم مجازاً یا بطور ایک اصطلاح کے اُنکو ناسخ و منسوخ کہنے لگیں ہم نے تمام قرآن میں
کوئی ایسا حکم نہیں پایا اور اسلیے ہم کہتے ہیں کہ قرآن میں ناسخ و منسوخ نہیں ہے۔ علما اور فقہا نے جن آیتوں کو ایک
دوسرے کے مخالف خیال کیا ہے اور ایک کو ناسخ اور ایک کو منسوخ ٹھیرایا ہے تو ہم ہر موقع پر ثابت کرینگے کہ وہ باہم
مخالف نہیں ہیں اور تفاوت حیثیت بھی ظاہر کرینگے جسکے بغیر لحاظ کے ناسخ و منسوخ کا قرار دینا محالات سے ہے
ناسخ اور منسوخ کے باب میں لوگوں نے بہت سی بحثیں کی ہیں اور ابو مسلم نے جو ناسخ و منسوخ ہونے کا قایل
نہیں ہے متعدد دلیلیں اُسکے امتناع پر پیش کی ہیں اور اُسکے مخالفین نے جو جمہور مفسرین

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۰﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۱﴾ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ
تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ
بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۲﴾ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ
لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ
اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ
بِاَمْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۳﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَمَا
تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۰۴﴾

ہیں اُسکی تردید کی ہے، اور اثبات نسخ پر دلیلیں پیش کی ہیں، ہماری سمجھ میں وہ سب قشری بحثیں
ہیں، مغز سخن تک کوئی نہیں پہونچتیں اور جو اصل بات اتحاد حیثیت کی ناسخ و منسوخ
میں تھی، اُس پر کسیکا خیال نہیں گیا ہے، اور اسلئے ہم اُن بحثون کا اپنی تفسیر میں ذکر کرنا
محض بے فائدہ سمجھتے ہیں۔ امام رازی صاحب نے جن دو آیتون سے اپنی دانست میں
قرآن مجید میں نسخ کا ہونا قرار دیا ہے، اگرچہ اُنسے بھی نسخ کا ہونا ثابت نہیں ہوتا جیسا کہ ہم اُن دونو
آیتون کی تفسیر میں لکھینگے، لیکن ہم اُنسے نہایت ادب سے پوچھتے ہیں، کہ آپ نے
اتحاد حیثیت کی شرط کو بھی ملحوظ فرمایا ہے یا نہیں۔ غالبًا وہ فرماوینگے کہ نہیں، تو ہم
اُنسے عرض کرینگے کہ حضرت ناسخ و منسوخ ہونے کا ثبوت بھی نہیں۔

کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے (۱۰۰) کیا تو نہیں جانتا کہ خدا ہی کیلئے آسمانوں

اور زمین کی بادشاہی ہے اور نہ تمھارے لئے خدا کے سوا کوئی دوست ہی اور نہ مددگار (۱۰۱)

کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے پیغمبر سے ہی سوال کرو جیسا کہ اس سے پہلے موسیٰ سے ہی سوال کیا گیا

تھا اور جو کوئی ایمان کو کفر سے بدل لے تو بیشک وہ گمراہ ہوا سیدھی راہ سے (۱۰۲)

اہل کتاب میں سے اکثر چاہتے ہیں کہ تمکو تمھارے ایمان لے آنیکے بعد پھیر کر کافر بنا دیں اپنی جی

سے آپ (تمیز) حسد کر کے بعد اسکے کہ انپر حق بات ظاہر ہو گئی ہے پہ معاف کرو اور درگذر کرو

یہانتک کہ خدا اپنا حکم بھیجے بیشک اللہ سب چیز پر قادر ہے (۱۰۳) پڑھتے رہو نماز اور

دیتے رہو زکوٰۃ اور جو کچھ تم اپنے لئے نیکیوں میں سے آگے بھیجد وگے تو

اُسکو اللہ کے پاس پاؤ گے بیشک جو تم کرتے ہو اللہ اُسکو دیکھتا ہے (۱۰۴)

ایک اور بات قابل لکھنے کے ہے کہ حدیث یعنی قول و فعل آنحضرت صلعم کا حکم قرآنی کا ناسخ ہو یا نہیں اسمیں علما کے مختلف قول ہیں، مگر جبکہ ہم قرآن سے قرآن کا حقیقتاً منسوخ ہونا نہیں تسلیم کرتے" تو حدیث سے اُسکا حقیقتاً منسوخ ہونا کیونکر تسلیم کر سکتے ہیں خواہ وہ حدیث خبر احاد کا درجہ رکھتی ہو، یا حدیث مشہور کا، یا لوگوں نے معناً یا لفظاً اُسکو متواتر کے درجہ تک سمجھا ہو، باقی رہا یہ کہ جسطرح لوگوں نے مجازاً ناسخ و منسوخ ہونیکا اطلاق کیا ہے اُسطرح بھی ہم حدیث کو ناسخ قرآن سمجھتے ہیں یا نہیں تو ہم اسطرح بھی نہیں سمجھتے بلکہ اُسکو حدیث کی نامعتبری کی وجہ قرار دیتے ہیں، ہاں احادیث صحیحہ کو جنکا درایتاً صحیح ہونا ثابت ہو گیا ہو مفسر قرآن سمجھتے ہیں۔

وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صٰدِقِينَ ﴿١٠٥﴾ بَلٰى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٠٦﴾ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتٰبَ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١٠٧﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ أَن يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعٰى فِي خَرَابِهَا أُولٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَن يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٨﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿١٠٩﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ بَل لَّهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ كُلٌّ لَّهُ قٰنِتُونَ ﴿١١٠﴾ بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَإِذَا قَضٰى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿١١١﴾

اور اُنہون نے کہا کہ بہشت مین ہر گز کوئی نہیں جانیکا بجز یہودیون اور عیسائیون کے یہ اُنکی تمنا ہی۔ (اے پیغمبر) تو اُنسے کہدے کہ تم اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو (۱۰۵) یہ نہیں ہی جو اُنہون نے کہا، ہان جس کسی نے تابعداری سے اپنا مُنہہ خدا کے سامنے کیا اور وہ نیکی کرنیوالا ہی تو اُسکا ثواب اُسکے پروردگار کے پاس ہی اور نہ اُنپر کچھ خوف ہی اور نہ وہ غمگین ہونگے (۱۰۶) اور یہودیون نے کہا کہ عیسائی کسی چیز پر نہیں ہین، اور عیسائیون نے کہا کہ یہودی کسی چیز پر نہیں ہین حالانکہ وہ (دونون) کتاب (یعنی توریت) پڑھتے ہین، اسیطرح اُنکے قول کے مانند اُن لوگون نے کہا جو نہیں جانتے (یعنی مشرکین نے جو توریت کو نہیں جانتے یہ کہا کہ یہودی اور عیسائی دونون کسی چیز پر نہیں ہین) پس اللہ اُنمین قیامت کے دن اُس چیز کا فیصلہ کریگا جس مین کہ وہ اختلاف کرتے ہین (۱۰۷) کون اُس سے زیادہ ظالم ہے جسنے روکدیا اللہ کی مسجدون کو اسبات سے کہ اُنمین اللہ کے نام کی یاد کیجاوے اور اُنکے خراب کرنے مین کوشش کی، یہی لوگ ہین جنکے لئے نہیں ہے کہ اُنمین جاوین مگر ڈرتے ہوئے، اُنکے لئے دنیا مین خرابی ہی اور اُنکے لئے آخرت مین بڑا عذاب (۱۰۸) اور خدا کیلئے ہی مشرق اور مغرب پس جدہر منہہ کرو وہیں اُدہر ہی خدا کا منہہ (یعنی اُسکی ذات) ہی، بیشک اللہ سب طرف پھیلنے والا ہی جاننے والا (۱۰۹) اور اُنہون نے کہا کہ اللہ نے بنالیا ہی بیٹا، پاک ہی وہ بلکہ اُسی کیلئے ہی جو کچھہ کہ آسمانون اور زمین مین ہی، سب اُسکے لئے فرمانبردار ہین (۱۱۰) پیدا کرنیوالا ہی آسمانون اور زمین کا، اور جب کرنا چاہتا ہی کوئی کام تو صرف اُسکو کہتا ہی کہ ہو پس وہ ہوجاتا ہی (۱۱۱)

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْآيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوقِنُونَ ﴿۱۱۲﴾ إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَّنَذِيرًا وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ أَصْحٰبِ الْجَحِيمِ ﴿۱۱۳﴾ وَلَن تَرْضٰى عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِن وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيرٍ ﴿۱۱۴﴾ الَّذِينَ آتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ أُولٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمَن يَّكْفُرْ بِهِ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿۱۱۵﴾ يٰبَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِينَ ﴿۱۱۶﴾ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿۱۱۷﴾ وَإِذِ ابْتَلٰى إِبْرٰهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمٰتٍ فَأَتَمَّهُنَّ

(۱۱۸) (وَاِذِ ابْتَلٰی) ۔ اب خدا تعالیٰ اُن بزرگیون کا ذکر کرتا ہے جو حضرت ابراہیم کو دی تہین اور اُن تمام بزرگیون میں سے جو حضرت ابراہیم کو دی گئی تہیں سب سے بڑی بزرگی وہ ہے جبکہ اُنہون نے کہا "انی وجہت وجہی للذی فطر السمٰوات والارض حنیفاً وما انا من المشرکین" اِسی نعمت کا خدا نے ذکر کیا ہے کلمات کے لفظ سے عجائب

اور اُن لوگوں نے کہا جو نہیں جانتے کیوں نہیں خدا ہمسے کلام کرتا یا کیوں نہیں ہماری پاس کوئی نشانی آتی اسیطرح اُنکی قول کی مانند اُن لوگوں نے کہا جو اُنسے پہلے تھے ایک سے ہو گئے اُنکے دل بیشک ہمنے بیان کیں نشانیاں اُن لوگون کیلئے جو یقین کرتے ہیں (۱۱۲) بیشک ہمنے تجھکو بھیجا ہے سچ بات سے خوشخبری دینے والا اور ڈرانیوالا اور تجھ سے بازپرس نہ ہوگی دوزخ میں پڑنیوالوں کی (۱۱۳) اور ہرگز تجھ سے یہود راضی نہ ہونگے اور نہ عیسائی یہانتک کہ تو اُنکے مذہب کی پیروی کرے کہدے کہ بیشک اللہ کی ہدایت وہی ہدایت ہے اور اگر تو اُنکی خواہشونکی پیروی کرے اُس چیز کے بعد جو آگئی ہے تیرے پاس علم کی نہیں تیرے لئے اللہ سے (بچانیکو) کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار (۱۱۴) وہ لوگ جنکو ہمنے کتاب (یعنی توریت) دی ہے اُسکو پڑھتے ہیں جیسا پڑھنے کا حق ہے وہی لوگ اُسپر یقین رکھتے ہیں اور جو اُسکے منکر ہیں وہی لوگ نقصان پانیوالے ہیں (۱۱۵) ای بنی اسرائیل یاد کرو میری نعمتوں کو جو مینے تمکو دی ہیں اور مینے تمکو تمام عالمون پر بزرگی دی ہی (۱۱۶) اور ڈرو اُس دن سے جبکہ کوئی کچھ بھی کسی کے کام نہ آویگا اور نہ کچھ اُسکے بدلے میں قبول کیا جاویگا اور نہ اُسکے لئے کوئی سفارش فائدہ دیگی اور نہ اُنکی مدد کیجاویگی (۱۱۷) اور جب مبتلا کیا ابراہیم کو اُسکے پروردگار نے چند باتوں میں پھر اُسنے اُنکو پورا کیا

صنع باری تعالیٰ مراد ہیں حضرت ابراہیم ستاروں اور چاند اور سورج کو دیکھکر عجائب صنع باریتعالیٰ میں متحیر ہو گئے تھے اور اُنہی پر خدا ہونیکا گمان کیا تھا لیکن اُنھوں نے اُسکو غلط سمجھا اور پورے طور پر خدا پر یقین کیا۔ اُسی کی نسبت خدا نے فرمایا ،، فافہمو ،،

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۱۸﴾ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی ؕ وَعَهِدْنَاۤ اِلٰۤی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۱۹﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۱۲۰﴾ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ

کلمات کے لفظ سے ہمنے عجائب صنع الٰہی مراد لی ہے۔ یہہ لفظ سورہ لقمان میں بھی آیا ہے جہان خدا نے فرمایا ہے ''مانفدت کلمات اللہ'' صاحب تفسیر کبیر نے اُس مقام پر بھی عجایب صنع الٰہی مراد لی ہی اور یہ بہت درست ہی۔ لفظ کلمہ اور کلمات کا استعمال اُن تمام چیزون پر ہوتا ہے جنکو خدا نے پیدا کیا ہے۔

﴿۱۱۹﴾ (واذ جعلنا البیت)۔ بعد اسکے کہ کعبہ بن گیا تمام لوگون میں اُسکی تعظیم اور اُسکی زیارت کو آنا شایع ہوگیا تھا، اور ایک بہت بڑی تجارت گاہ بن گیا تھا، اور تمام قومون نے آپس میں عہد کرلیا تھا کہ حج کے ایام میں قتل اور غارت اور خونریزی بند رہیگی، اور تمام لوگ جو مکہ میں آئے ہیں امن میں رہینگے۔ انہی دونون باتون کا خدا نے اس مقام پر ذکر کیا ہے۔

(واتخذوا من مقام ابراهیم مصلے) یعنی اختیار کرو مقام ابراہیم کو نماز کی جگہہ۔ یہ ایک جملہ معترضہ واقع ہوگیا ہے اور اُسکے مخاطب وہ لوگ ہیں جو آنحضرت صلعم پر ایمان لے آئے تھے یعنی مسلمان کعبہ کو نماز کی جگہہ

خدا نے کہا کہ بیشک میں تجھکو لوگوں کیلئے پیشوا کرنیوالا ہوں (ابراہیم نے) کہا اور میری اولاد میں سے (خدا نے) کہا کہ میرا وعدہ ظالموں تک نہیں پہونچتا (۱۱۸) اور جب ہم نے کعبہ کو آدمیوں کیلئے مرجع اور امن کی جگہہ بنایا، تو اختیار کرو مقام ابراہیم کو نماز کی جگہہ اور ہمنے ابراہیم اور اسمٰعیل سے عہد لیا کہ پاک رکھیں میرے گھر کو طواف کرنیوالوں اور اعتکاف کرنیوالوں اور رکوع سجود کرنیوالوں کیلئے (۱۱۹) اور جب ابراہیم نے کہا، ای پروردگار اسجگہہ کو ایک شہر پر امن کردے اور رزق دے اسکے رہنے والونکو پھلوں کا انمیں سے جو کوئی ایمان لاوے اللہ پر اور اخیر دن پر (خدا نے) کہا اور (یہ بھی کہو کہ اسکو بھی) جو کافر ہو، پھر میں اسکو تھوڑا سا فائدہ مند کرونگا پھر اسکو مجبور کرونگا آگ کے عذاب میں اور بری جگہہ میں جانیکو (۱۲۰) اور جب ابراہیم کعبہ کی بنیادیں اٹھاتا تھا

یعنی مسجد اختیار کریں۔ مقام ابراہیم کی نسبت مفسروں نے بہت بحث کی ہے، اور ایسے اقوال نقل کئے ہیں جنکا کافی ثبوت نہیں ہے مگر سیاق کلام سے جیسے کہ مجاہد کا بھی قول ہے پایا جاتا ہے، کہ مقام ابراہیم سے کوئی خاص مقام مراد نہیں ہے، بلکہ کعبہ مراد ہے۔

ان مقام ابراہیم کلہ وھو قول مجاھد (تفسیر کبیر جلد ا صفحہ ۵۰۱)

اس جملہ کے بعد پھر حضرت ابراہیم کے زمانہ کا ذکر ہے، اور ابراہیم اور اسمٰعیل کو اس گھر کے آنیوالوں اور ٹھہرنیوالوں اور نماز پڑہنے والوں کیلئے ستھرا رکھنے کا حکم دیا ہے۔

طائفیں سے مراد وہ لوگ ہیں جو کعبہ کی زیارت اور حج کو آویں، اور عاکفین سے وہ لوگ مراد ہیں جو وہاں رہتے ہوں، یا آکر سکونت اختیار کریں، اور رکع السجود سے وہ لوگ مراد ہیں جو وہاں نماز پڑھیں۔

(۱۲۱) (و اذ یرفع ۔ کعبہ درحقیقت نماز پڑہنے کی جگہہ یعنی مسجد ہے، جسکو حضرت ابراہیم نے بنایا تھا۔ خود خدا نے اسکو مسجد کہا ہے جہاں فرمایا ہے، "ان المشرکین نجس فلا یقربوا المسجد الحرام" اور

وَاِسْمٰعِيْلُ

اور جہان فرمایا ہے، "لقد صدق اللہ رسولہ الرویا بالحق لتدخلن المسجد الحرام انشاء اللہ"

ابراہیم اور انکی تمام اولاد ایسے مقام کو بیت اللہ کہا کرتی تھی اور اسلئے کعبہ کو بھی بیت اللہ کہتے ہیں۔

انسان کی ایک جبلی عادت ہے کہ ایک ایسے وجود کے لئے جو نہ دکھائی دیتا ہے نہ چھوا جاتا ہے اور نہ سمجھ میں آتا ہے، اور بجز اسکے کہ ہے، اور کوئی خیال اسکی نسبت قایم نہیں ہو سکتا، کوئی نہ کوئی محسوس نشان قایم کر لیتا ہے اور اُس محسوس نشان کے ذریعہ سے اپنا عجز اور نیاز اُس غیر محسوس اور بیچون اور بیچگون ذات کے سامنے ادا کرتا ہے۔ قدیم زمانہ کے لوگون کو بالطبع ایسے نشان کے قایم کرنے کی زیادہ تر رغبت ہوتی تھی، اور یہی بات ہے جس کے سبب سے ہم قدیم سے قدیم قومون کا اور وحشی سے وحشی لوگوں کا جب حال تحقیق کرتے ہیں تو اُن میں بت پرستی کے یعنی ایک شے محسوس کے پوجنے کے آثار پائے جاتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہہ خیال حضرت ابراہیم کے زمانہ تک معدوم نہیں ہوا تھا، اور اسی سبب سے حضرت ابراہیم بھی خدا کی عبادت کے لئے ایک بن گھڑا پتھر کھڑا کرتے تھے، اور یہہ رسم حضرت موسیٰ کے وقت تک قایم تھی۔ اس فعل میں جو انبیا نے کیا، اور اُس فعل میں جو بت پرست کرتے تھے، فرق یہ ہے کہ بت پرست غیر خدا کے نام محسوس شی قایم کر کے پرستش کرتے تھے، اور اس لئے وہ خدا کی پرستش نہ تھی، بلکہ اُس غیر خدا کی پرستش تھی جسکے نام سے وہ محسوس شی قایم کی تھی۔ انبیا نے جو محسوس شے قایم کی وہ خدا ہی کے نام پر قایم کی، اور خدا ہی کی پرستش کی نہ کسی غیر خدا کی، مگر مبارک ہو اُسکو یعنی محمد رسول اللہ صلعم کو جس نے ان تمام نشانوں کو مٹا دیا، اور اُس بے نشان کی عبادت کو بغیر کسی نشان کے قایم کیا، اور بحر و بر اور پہاڑ اور گھر اور مسجد سب میں یکسان خدا کی عبادت ہونا سکھا دیا، کوئی سمت خدا کی عبادت کے لئے مخصوص نہیں کی، یہ سمجھنا کہ کعبہ کی سمت خدا کی عبادت کے لئے مخصوص ہے محض غلطی ہے، اور بانی اسلام کی ہدایت کے خلاف، وہ سمت عبادت کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ ایک تمیز اور تفرقہ کے لئے مخصوص ہے جسکو ہم آگے بیان کرینگے۔

کتاب پیدایش باب ۱۲ درس ۷ میں لکھا ہے کہ "تب خداوند نے ابراہیم کو دکھلائی دیکر کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دونگا، اور اُسنے وہان خداوند کے لئے جو اُسپر ظاہر ہوا ایک مذبح بنایا"

اور اسمٰعیل (اُسکے ساتھ تھا تو اُن دونوں نے کہا)

اور اسی باب کی آٹھوین آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ پھر وہان سے ابراہیم نے کوچ کیا اور آگے جاکر پھر ایک مذبح بنایا اور خدا کے نام سے یعنی خدا کے گھر کے نام سے اُسکو موسوم کیا۔

اسی کتاب کے تیرھوین باب کی اٹھارھوین آیت میں ہے کہ" بلوطستان ممری میں ابراہیم جا رہا اور وہان خداوند کے لئے ایک مذبح بنایا"

ان تینون آیتون سے ثابت ہے کہ خدا کے لئے مذبح تعمیر کرنا اور خدا کے نام سے اُسکو پکارنا اور وہان خدا کے نام پر قربانی کرنا حضرت ابراہیم کا طریقہ تھا۔

یہہ طریقہ انکی اولاد میں بھی جاری تھا، چنانچہ کتاب پیدایش باب ۲۶ ورس ۲۵ میں لکھا ہے کہ " بیرشبع مین اسحاق پسر ابراہیم کو خدا دکھلائی دیا اور اُسنے وہان مذبح بنایا اور خدا کے نام سے اُسکو موسوم کیا"

اب ہمکو یہہ بتانا رہا کہ یہہ مذبح کس طرح بنایا جاتا تھا، اُسکی تفصیل بھی توریت مقدس میں موجود ہے۔ کتاب خروج باب ۲۰ ورس ۲۵ میں لکھا ہے کہ " اگر تو میرے لئے پتھر کا مذبح بنادے تو تراشے ہوئے پتھر کا مت بنائیو کیونکہ اگر تو اُسپے اوزار لگاویگا تو اُسے ناپاک کریگا"۔

اور اسی کتاب کے باب ۲۴ ورس ۴ میں لکھا ہے کہ " اور موسیٰ نے خداوند کی ساری باتیں لکھیں اور صبح کو سویرے اوٹھا اور پہاڑ کے تلے ایک مذبح بنایا اور اسرائیل کی بارہ سبطوں کے عدد کے موافق بارہ ستون بنائے گئے"

اور کتاب پیدایش باب ۲۸ ورس ۱۸ و ۱۹ و ۲۲ میں لکھا ہے کہ " یعقوب صبح سویرے اوٹھا اور اُس پتھر کو جسے اُسنے اپنا تکیہ کیا تھا لیکے ستون کی مانند کھڑا کیا اور اُسکے سر پر تیل ڈالا، اور اُسکا نام بیت ایل (یعنی بیت اللہ خدا کا گھر) رکھا اور کہا کہ یہہ پتھر جو میں نے ستون کی مانند کھڑا کیا خدا کا گھر یعنی بیت اللہ ہوگا"

جبکہ حضرت ابراہیم نے اپنی بیوی سارہ کے کہنے سے اپنی دوسری بیوی ہاجرہ کو مع حضرت اسمٰعیل اپنے بیٹے کے جو ہاجرہ بیوی کے پیٹ سے تھے نکال دیا، اور وہ اس کوہستان مکہ میں آکے ٹھیرے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٢١﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٢٢﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٣﴾

توحضرت ابراہیم نے اُنکی عبادت کے لئے اُسی طرح جیسا کہ وہ کیا کرتے تھے ایک پتھر کھڑا کرکے مذبح بنایا ہوگا، جو اب ہم مسلمانوں میں حجر اسود اور یمین الرحمٰن کے نام سے مشہور ہے بس حجر اسود کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے کیونکہ وہ ایک جزو کعبہ کا ہوگیا تھا مگر وہ ایک ایسی شے ہے جو اب تک موجود ہے جہاں اسطرح پر مذبح بنایا جاتا تھا وہاں کوئی عمارت بنا دینے کا بھی دستور تھا، جسکا اشارہ توریت کی اُن آیتوں ہی بھی پایا جاتا ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں۔ پس بعد اس مذبح بنانے کے حضرت ابراہیم نے وہاں کعبہ بنایا جو اب بیت اللہ کہلاتا ہے اور اُسی کے ایک کونے میں وہ پتھر لگا دیا۔ اِس آیت میں اُسی تعمیر کا ذکر ہے۔

اگرچہ ڈایوڈورس یونانی مورخ کی تاریخ میں کعبہ کا ذکر ہے اور اُس میں یہ بھی لکھا ہے کہ اُسکے اعلیٰ درجہ کے اقدس کی تمام عرب تعظیم کرتے تھے، مگر بعض ناسمجھ آدمی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ توریت میں کہیں اس مقام پر حضرت ابراہیم کے مذبح بنانے یا کعبہ کی تعمیر کرنے کا ذکر نہیں ہے، مگر اُنکا یہ اعتراض محض لغو اور بے بنیاد ہے، توریت میں بہت سے ایسے واقعات ہیں جو مذکور نہیں حالانکہ اُنکا تاریخی ثبوت موجود ہے۔ اور توریت میں ذکر نہ ہونے سے اُسکا عدم وقوع لازم نہیں آتا۔ اصل یہ ہے کہ توریت اور جو کتابیں کہ اُس سے متعلق ہیں، وہ خاص بنی اسرائیل کے حالات میں لکھی گئی ہیں، اسلئے اُنمیں بنی اسمٰعیل کا وہاں تک تو ذکر ہے جہاں تک کہ بنی اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کے مشترک حالات رہے ہیں، اور جہاں سے بنی اسمٰعیل کے حالات علیحدہ ہو گئے ہیں وہاں سے بنی اسمٰعیل کا ذکر ان کتابوں میں نہیں ہے، الاماشاءاللہ کہیں کہیں کسی سبب اور

مقامات مشہورہ مکہ معظمہ

مقامات میقات۔ ذوالحلیفہ۔ مدینہ منورہ کے رستہ پر۔

ذات عرق۔ عراق کے رستہ پر۔

حجفہ۔ شام کے رستہ پر۔

قرن۔ نجد کے رستہ پر۔

یلملم۔ یمن کے رستہ پر

حجر اسود۔ کعبہ کے شرقی وشمالی کونے میں یہہ پتھر لگا ہوا ہے۔

مقام ابراہیم۔ عام لوگوں کے نزدیک وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم نے کھڑے ہوکر کعبہ کی دیوار چنی تھی۔ اور جو پتھر خانہ کعبہ کے شمال میں لگا ہوا ہے اور اس پر ایک قبہ بنا ہوا ہے اور وہاں شافعی امام کھڑا ہوتا ہے اُسی کو وہ پتھر بتاتے ہیں۔

صفا۔ کعبہ سے جنوب و شرق میں ایک پہاڑی ہے اور اب اُسپر آبادی ہوگئی ہے

مروہ۔ کعبہ سے شرق وشمال میں ایک چھوٹی پہاڑی ہے اب وہاں بھی آبادی ہے

منیٰ۔ کعبہ سے گوشہ شرق وشمال میں چار کوس کے فاصلہ پر ہے۔

عرفات۔ کعبہ سے جانب شرق آٹھ کوس کے فاصلہ پر ایک میدان ہے۔

مزدلفہ۔ کعبہ سے جانب شمال و مشرق ایک میدان اور پہاڑ ہے۔

زمزم۔ مشہور کنواں حرم کے اندر ہے۔

میزاب رحمت۔ کعبہ کی چھت کا پرنالہ ہے۔

نقشہ کعبہ محترم یعنی مسجد الحرام
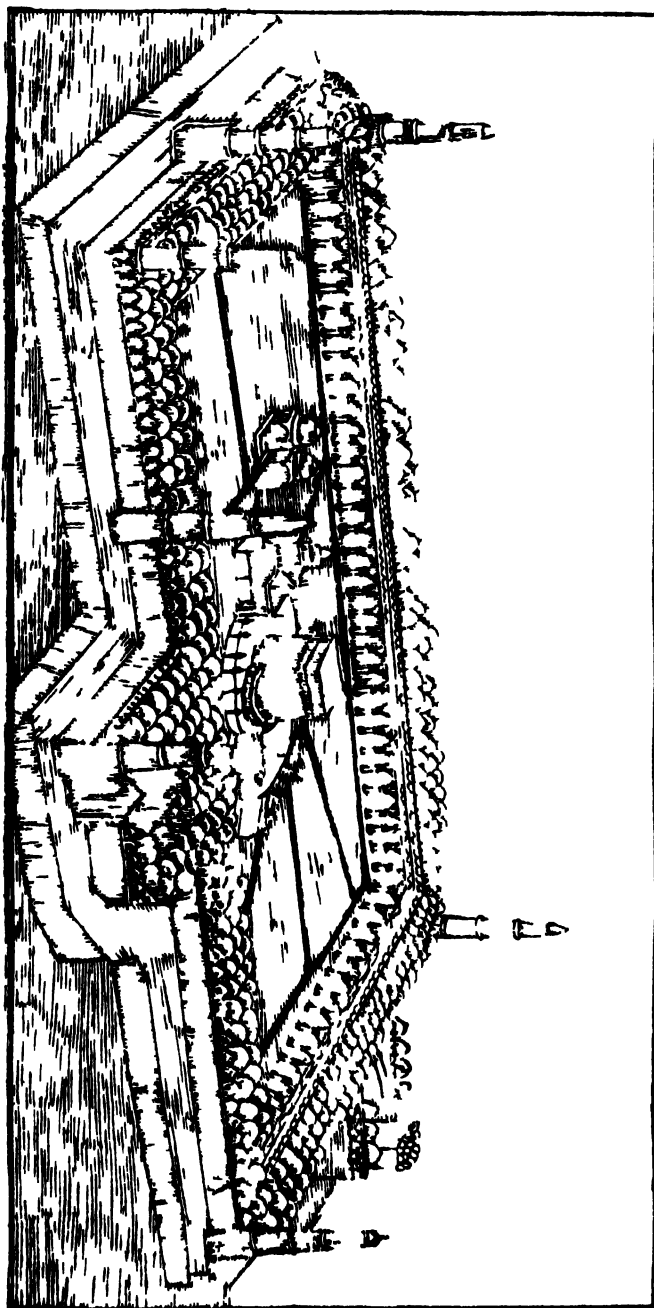
ای ہماری پروردگار اسکو ہم سے قبول کر بیشک تو سننے والا جاننے والا ہی (۱۲۱) ای ہمارے پروردگار او ہم دونونکو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری اولادکو اپنی فرمانبردار اُمت اور دکھا ہمکو ہماری (عبادت کی) طریقے اور ہمکو معاف کر بیشک تو ہی بڑا معاف کرنیوالا ہی مہربان (۱۲۲) ای ہمارے پروردگار انمیں اُنھی میں سے ایک رسول مبعوث کر کہ اُنکو تیری نشانیاں سناوی اور اُنکو کتاب اور حکمت سکھاوے اور اُنکو پاک رکھے بیشک تو ہی بڑا ہے حکمت والا ہی (۱۲۳)

کسی تعلق سے آجاتا ہے۔ مکہ میں بنی اسمٰعیل کے لیے حضرت ابراہیم کا ذبح یا کعبہ بنانا بنی اسرائیل سے کچھ تعلق نہیں رکھتا تھا اور اُن کتابوں میں اُسکا ذکر نہ ہونے کی یہ کافی وجہ ہے۔ مگر ہر زمانہ کے عرب کی متواتر روایتوں سے جن سے کسی امر کے ثبوت میں کچھ شبہ نہیں رہتا اور نیز غیر قوموں کی کتابوں سے اور نیز قدیم جغرافیہ سے اور خود مکہ کے گرد کی قدیم ویران بستیوں سے جو حضرت اسمٰعیل کے بیٹوں کے نام سے آباد ہوئی تہیں کچھ شبہہ نہیں رہتا کہ کعبہ حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا ہے۔

حضرت ابراہیم نے جب کعبہ بنایا تو صرف اُسکی دیواریں بنائی تہیں چھت اُسپر نہیں تھی۔ بنی جرہم کے زمانہ میں پہاڑی نالہ کے سبب سے حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا کعبہ ڈھے گیا، تب بنی جرہم نے اسکو پھر تعمیر کیا پھر وہ عمالیق کے زمانہ میں جو ایک قبیلہ بنی حمیر کا تھا ڈھے گیا، تب عمالیق نے اُسکو بنایا۔ پھر اُسمیں کچھ نقصان آگیا تو قصی نے اُسکو تعمیر کیا پھر آگ لگنے کے سبب کعبہ جل گیا اور قریش نے اسکو تعمیر کیا اُس زمانہ میں آنحضرت صلعم پیدا ہو چکے تھے اور آپکی عمر تخمیناً بارہ چودہ برس کی تھی۔ یزید کے زمانہ میں جب کعبہ پر فوج کشی ہوئی تو پھر کعبہ جل گیا اور عبداللہ ابن زبیر نے اُسکو تعمیر کیا، مگر حجاج بن یوسف نے عبدالملک ابن مروان کے وقت میں عبداللہ ابن زبیر کی عمارت کو ڈھا ڈالا، اور از سر نو اُسکو اُسیطرح پر بنا دیا جیسا کہ قریش کے زمانہ میں تھا، اور اب جو عمارت موجود ہی وہ حجاج بن یوسف کی بنائی ہوئی ہے مگر اُسکے گرد کی جو عمارتیں ہیں اور جو عمارات حرم کعبہ کہلاتی ہیں اُنکو بہت سے بادشاہوں نے بنایا ہے اور وہ نہایت عالی شان عمارتیں ہیں جیسے کہ نقشہ سے معلوم ہوتی ہیں۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٢٤﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٢٥﴾ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٢٦﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاۗءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَاۗىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰــهًا وَّاحِدًا ښ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿١٢٧﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔــلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢٨﴾ وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ۭ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٢٩﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿١٣٠﴾

اور کون ابراہیم کی ملت سے مُنہ پھیرتا ہی بجز اُسکے جو خود بیوقوف بنا ہو اور بیشک ہمنے اُسکو برگزیدہ کیا ہی دنیا میں اور بیشک وہ آخرت میں نیک لوگوں میں ہی (۱۲۴) جب اُسکے پروردگار نے اُسکو کہا کہ فرمانبردار ہو اُسنے کہا فرمانبردار ہوا میں پروردگار عالموں کا (۱۲۵) اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے یہہ وصیت کی کہ اے میرے بیٹو بیشک اللہ نے تمہارے لئے اس دین کو برگزیدہ کیا ہے پس تم مت مرنا بجز اسکے کہ تم مسلمان ہو (۱۲۶) (اے بنی اسرائیل) کیا تم موجود تھے جسوقت یعقوب کو موت آئی جبکہ اُس نے اپنے بیٹوں کو کہا کہ میری بعد کسکو پوجوگے اُنھوں نے کہا کہ ہم عبادت کرینگے تیرے خدا کی اور تیرے بزرگوں ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق کے خدا کی جو خدا ہی واحد ہی اور ہم اُسی کے فرمانبردار ہیں (۱۲۷) یہ ایک اُمت تھی جو گذر گئی اُنکے لئے وہ چیز ہے جو اُنھوں نے کمائی اور تمہارے لئی وہ چیز ہے جو تمنے کمائی اور تم سے اُس چیز کی پرسش نہ ہوگی جو وہ کرتے تھے (۱۲۸) اور (یہود یوں نے) کہا کہ یہودی ہوجاؤ (اور عیسائیوں نے کہا کہ) یا عیسائی (ہوجاؤ) تو تم راہ پاؤگے (اے پیغمبر) کہدے (کہ نہیں) بلکہ (میں پیروی کرتا ہوں) ملت ابراہیم کی جو خالص ہے اور وہ مشرکوں میں نہیں تھا (۱۲۹) کہو ایمان لائے اللہ پر اور (اُسپر) جو اُتارا گیا ہی ہمپر اور جو اُتارا گیا ہے ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اُسکے پوتوں پر اور (اُسپر) جو دیا گیا ہے موسیٰ اور عیسیٰ کو اور (اُسپر) جو دیا گیا ہی نبیوں کو اُنکے پروردگار سے ہم فرق نہیں کرتے کسی ایک میں اُنمیں سے اور ہم اُسکے (یعنی خدا کے) فرمانبردار ہیں (۱۳۰)

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۱۳۱) صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ (۱۳۲) قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ (۱۳۳) أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ قُلْ أَأَنتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَتَمَ شَهَادَةً عِندَهُ مِنَ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۱۳۴) تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۳۵)

---

(۱۳۱) (بمثل ما امنتم) یہ جو خدا نے فرمایا کہ "اگر ایمان لاتے اُس چیز کی مانند جس پر تم ایمان لائے ہو" اُس پر علماء و مفسرین نے بحث کی ہے کہ مانند سے کیا مطلب ہے اور اسکا حل اس طرح پر کیا ہے کہ مانند کے لفظ سے کوئی دوسری چیز اُسکے مشابہ مقصود نہیں ہوتی بلکہ وہی شئے مقصود ہوتی ہے جیسے کہ کوئی کہے کہ ایسا کرو جیسا کہ اُنہوں نے کیا ہے تو اس سے مقصود یہی ہوتا ہے کہ وہی کرو جو اُنہوں نے کیا ہے مقصود صرف اسقدر ہے کہ خدا پر اور انبیاء پر ایمان لانا ٹھیک ہدایت پانی ہے اور اسکے ماننے سے انکار کرنا مخالفت کرنی ہے۔

(۱۳۲) (صبغة الله) ـ یہودی اور عیسائی دونوں میں اصطباغ کی رسم جاری تھی ابتدا میں یہودیوں میں کسی بنا پر یہ رسم شروع ہوئی ہو، مگر کچھ شبہ نہیں ہے کہ بعد تباہی بیت المقدس کی

پھر اگر ایمان لائے اُس چیز کی مانند پر جس پر تم ایمان لائے ہو، پھر بیشک اُنہوں نے راہ پائی
اور اگر پھرے تو اُسکے سوا اور کچھ نہیں کہ وہی مخالفت میں ہیں، پھر کافی ہوگا تیری طرف
سے انکو اللہ، اور وہ سننے والا ہے جاننے والا (۱۳۱) اللہ کا رنگ (رنگو) کون بہتر ہے اللہ کے رنگ
سے، اور ہم اُسی کی عبادت کرنیوالے ہیں (۱۳۲) کہہ اے پیغمبر کیا تم ہم سے جھگڑا کرتے ہو اللہ
میں، حالانکہ وہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی، اور ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے
تمہارے اعمال، اور ہم اُسی کے مخلص ہیں (۱۳۳) کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق
اور یعقوب اور اُسکے پوتے یہودی تھے، یا عیسائی، کہدے اے پیغمبر کیا تم زیادہ جاننے والے ہو
یا اللہ اور کون زیادہ ظالم ہے اُس شخص سے جو چھپاوے گواہی کو جو اُسکے پاس ہے اللہ سے،
اور اللہ بے خبر نہیں ہے اُس سے جو تم کرتے ہو (۱۳۴) یہ ایک امت تھی جو گذر گئی، اُنکے
لئے وہ چیز ہے جو اُنہوں نے کمائی اور تمہارے لئے وہ چیز ہے جو تم نے کمائی، اور تم سے اُس
چیز کی پرسش نہ ہوگی جو وہ کرتے تھے (۱۳۵)

یہودیوں میں یہ رسم مستحکم ہوگئی تھی، اور مذہب میں داخل ہونیکو عیسائی مذہب کی رو سے بھی اصطباغ لازمی قرار پایا تھا، خود حضرت عیسیٰ نے بھی حضرت یحییٰ سے اصطباغ لیا تھا اس مقام پر خدا نے فرمایا کہ خدا کا اصطباغ لو، اِس سے بہتر کوئی اصطباغ نہیں، یعنی خدا پر دل سے جان سے روح سے یقین کرو، یہی خدا کا اصطباغ ہے، پس دین محمدی میں اسلام میں داخل ہونیکو ظاہری اصطباغ موقوف ہوگیا اور روحانی اصطباغ قایم ہوا، اور صرف دل ہی خدا پر اور اسکی وحدانیت پر یقین کرنا ہمیشہ کی زندگی حاصل کرنیکو کافی ہوا، جیسا کہ خدا کا اصطباغ دینے والا فرماتا ہے "ما من عبد قال لا اله الا الله ثم مات علی ذلک الا دخل الجنۃ" اور اپنے خادم ابوہریرہ سے کہا کہ من

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ

لقيك يشهد ان لا اله الا الله مستيقنا بها قلبه فبشره بالجنة" پس دین محمدی میں بھی روحانی اصطباغ ہے جس میں نہ اصطباغ دینے والے کی ضرورت ہے نہ پانی کی نہ رنگت کی بلکہ صرف دل کا یقین کافی ہے۔ وھذا ھو صبغة الله۔

(۱۳۶) سیقول السفہاء) اس مقام سے تحویل قبلہ کا ذکر شروع ہوا ہے مگر پہلے ہم کو یہ بات بتانی چاہیئے کہ حضرت ابراہیم کے وقت میں قبلہ یا سمت قبلہ کا کیا حال تھا۔ اس امر کا بیان اس بات پر موقوف ہے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں نماز کے کیا ارکان تھے، غالباً اُس نماز میں بھی رکوع و سجود ہو، مگر ہمارے پاس کوئی ثبوت اس امر کا نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں نماز کے بعینہٖ یہی ارکان تھے جو اب مذہب اسلام میں ہیں، نہ یہ ثابت ہے کہ اُس نماز میں جیسے کہ وہ ہو اسیطرح پر رکوع و سجدہ تھا جیسے کہ ہماری نماز میں ہے۔ بلکہ اگر اُس زمانہ کے حالات اور اُس زمانہ کی وحشی قوموں کی عبادت پر خیال کیں تو بجز اسکے اور کچھ نہیں پایا جاتا کہ وہ لوگ آپس میں حلقہ باندھ کے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور کودتے اور اوچھلتے تھے، اور وہ سارا حلقہ کا حلقہ اُسی طرح چکر کھاتا جاتا تھا، اور اُسی جوش و خروش میں کبھی کھڑے ہو جاتے تھے اور پر ٹیک دیتے تھے، اور اُسکا نام پکارتے جاتے تھے یا اُسکی تعریف کے گیت گاتے تھے جسکی وہ عبادت کرتے تھے، اسی نماز کا نشان اسلام میں بھی طریقہ ابراہیمی پر موجود ہے جسکا نام مذہب اسلام میں طواف کعبہ قرار پایا ہے۔ ابن عباس سے مشکوٰۃ میں روایت ہے کہ ان النبی صلعم قال الطواف حول البیت مثل الصلوٰة الا انکم تتکلمون فیه فمن تکلم فیه فلا یتکلمن الا بخیر" یعنی آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ کعبہ کے گرد طواف کرنا مثل نماز کے ہے۔ گویہ طریقہ نماز کا وحشیانہ ہو مگر اسمیں کچھ شبہ نہیں کہ حال کی موودب اور باوقار نمازوں سے زیادہ پر جوش اور زیادہ تر محبت معبود کا برانگیختہ کرنیوالا اور معبود کے شوق کو زیادہ تر جوش میں لانیوالا اور ملکو خیالات اُسکی یاد میں مشغول کرنیوالا تھا۔ یہ حرکتیں انسان میں بالطبع مجنون کا سا جوش پیدا کر دیتی ہیں، اور جسطرح مجنون کسی بات میں مشغول ہو اسیطرح خدا کی یاد میں انسان کو مشغول کر دیتی ہیں۔

حضرت ابراہیم کے زمانہ میں جو طریقہ نماز کا ہو اُس سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ

اب کہیں گے بیوقوف لوگ

کوئی سمت قبلہ کی معین نہیں ہوتی تھی یہ تمام ذوق و شوق اور اُچھل کود اُس شے کے گرد ہوتا تھا جسکو وہ بطور خدا کی نشانی کے قایم کرتے تھے اسی قسم کی پرستش اب بھی بعض بعض وحشی قوموں میں پائی جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم خدا کی نشانی کیلئے ایک بن گھڑا پتھر کھڑا کر لیتے تھے اور جو عبادت یا نماز ہوتی تھی وہ اُسی کے گرد ہوتی تھی، اس لیے حضرت ابراہیم کے زمانہ میں کوئی خاص سمت قبلہ کا ہونا بجز اُس نشان کے جسکو وہ قایم کر لیتے تھے اور کچھ نہیں پایا جاتا۔

حضرت ابراہیم کی اولاد کا حال جہانتک ہمکو ملا ہے اُس سے پایا جاتا ہے کہ وہ بھی کعبہ کی جانب کو سمت قبلہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ ہر جگہہ پتھر کھڑا کر کے اُسکے گرد اُسی وحشیانہ طریقہ پر عبادت کرتے تھے، چنانچہ ازرقی نے کتاب اخبار مکہ میں لکھا ہے کہ بنی اسمعیل اور جرہم جو مکہ میں رہتے تھے اُنکو گنجایش نہ ہوئی تو وہ ملک میں نکلے اور معاش کی تلاش میں پڑے۔ پس لوگ خیال کرتے ہیں کہ اول پتھر کا پوجنا بنی اسمعیل میں اسطرح شروع ہوا کہ جب اُن میں سے کوئی مکہ سے جاتا تو حرم کے پتھروں میں سے ایک پتھر اُٹھا لیتا، حرم کو بزرگ سمجھکر اور مکہ اور کعبہ کے شوق میں جہان اُترتے، تو اُس پتھر کو گڑ لیتے، اور اُسکے گرد مثل کعبہ کے طواف کرتے، پھر اسکی یہانتک نوبت پہونچ گئی کہ جو پتھر اچھا دیکھتے، اور جو حرم کا پتھر عجیب اور اچھا معلوم ہوتا اُسکی عبادت کرتے، اسیطرح پشتوں پر پشتیں گذر گئیں اور وہ بھول گئے جو بات پہلی تھی، اور ابراہیم اور اسمعیل کے دین کو بدل دیا اور بتونکو پوجنے لگے۔

ان بنی اسمعیل وجرهم من ساكني مكة ضاقت عليهم مكة فتفسحوا في البلاد والتمسوا المعاش الذين يزعمون ان اول ما كانت عبادة الحجارة في بني اسمعيل انه كان لا يظعن من مكة ظاعن منهم الا احتملوا معهم من حجارة الحرم تعظيما للحرم وصبابة بمكة وبالكعبة حيث ما حلوا وضعوه فطافوا به كالطواف بالكعبة حتى سلخ ذلك بهم الى ان كانوا يعبدون ما استحسنوا من الحجارة واعجبهم من حجارة الحرم خاصة حتى خلفت الخلوف بعد الخلوف ونسوا ما كانوا عليه واستبدلوا بدين ابراهيم واسمعيل غيره (عبد ۹ الاثاني الجز صفحہ ۷۲)

اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اسمعیل اور جرہم کی اولاد میں پشت در پشت کبھی کعبہ کیجانب سمت قبلہ نہیں قرار پائی تھی اور اُنکا طریقہ عبادت ہی ایسا تھا کہ کوئی سمت قبلہ قرار ہی نہیں پا سکتی تھی۔ قرآن مجید میں بھی کہیں اسبات کا ذکر نہیں ہے کہ خدا نے اسمعیل یا اُسکی اولاد کیلئے کعبہ کو سمت قبلہ مقرر کرنیکا حکم دیا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں جبکہ عرب کی قوم نے کعبہ میں بت رکھدیے تھے، اُس زمانہ میں بھی جو کچھ اُنکی پوجا ہوتی تھی

مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا

وہ کعبہ میں ہوتی ہوگی، لیکن یہ بات کہ جب وہ کعبہ سے دور چلے جاتے تھے اور اَور مقاموں میں ہوتے تھے جب بھی کعبہ کیطرف منہہ کرکے پوجا کرتے تھے کسیطرح ثابت نہیں۔

بنی اسرائیل میں جب بیت المقدس کی تعمیر ہوگئی تو وہ بھی بطور ایک مسجد کے بنائی گئی تھی، اور تمام رسومات عبادت کی جو کچھ کہ بنی اسرائیل ادا کرتے تھے اُسی معبد یا مسجد میں جاکر ادا کرتے تھے۔ مگر اُس زمانہ تعمیر بیت المقدس میں اُنکی وحشیانہ طریق عبادت یا نماز میں کافی اصلاح ہوگئی اور ایک باقاعدہ ارکان نماز کی جسمیں قیام اور رکوع بھی تھا قرار پائے، ہمکو عہد عتیق کی کوئی آیت ایسی نہیں ملی جس سے یہ ثابت ہو کہ خدا نے بنی اسرائیل کو یہہ حکم دیا تھا کہ جب تم بیت المقدس سے دور ہو تو اُسکی طرف منہہ کرکے نماز پڑھا کرو۔ مگر جب کہ بنی اسرائیل کی نماز ایک باقاعدہ ہوگئی تھی، اور اُسکے ادا کرنے میں کسی نہ کسی طرف منُہ کا ہونا ایک لازمی امر تھا اسلئے بالطبع بنی اسرائیل اس بات پر مائل ہوئے ہونگے کہ بیت المقدس کیطرف منہہ کرکے نماز پڑہیں، اور اسطرح پر بیت المقدس اُنکا سمت قبلہ قرار پاگیا۔

آنحضرت صلعم نے بعد نبوت قریب تیرہ برس کے مکہ میں تشریف رکھی۔ اس بحث کو چھوڑ دو کہ نماز پنجگانہ فرض ہو چکی تھی یا نہیں، اور جو ارکان نماز کے بالفعل مسلمانوں میں مقرر ہیں وہ مقرر ہو چکے تھے یا نہیں، مگر اس میں کچھ شبہہ نہیں ہو سکتا کہ اُس زمانہ دراز میں بھی کوئی طریقہ عبادت کا آنحضرت صلعم نے ضرور اختیار کیا تھا، خواہ یہی ارکان نماز کے اختیار کئے ہوں جو بالفعل موجود ہیں خواہ بعد کو اُنمیں کچھ اصلاح ہوگئی ہو لیکن یہ بات ثابت نہیں ہے کہ ایسی حالتوں میں جبکہ آنحضرت صلعم کعبہ سے بعید ہوں تو اُنھوں نے نماز یا عبادت ادا کرنے میں کعبہ کی طرف مُنہہ کرکے ادا کرنا بطور ایک امر لازمی کے جس سے ثبوت سمت قبلہ کا ہو اختیار فرمایا ہو، بلکہ ہرطرح قرینہ و قیاس اس بات کا مقتضی ہے کہ جب تک آنحضرت صلعم نے مکہ میں تشریف رکھی کوئی سمت قبلہ اختیار نہیں کی۔

جبکہ حضرت مکہ سے مدینہ میں تشریف لیگئے جہاں یہودی کثرت سے تھے، اور اُنکی نماز بھی قریباً قریباً اُسی قسم کی تھی جیسی کہ مسلمانوں کی تھی، تو بالطبع آنحضرت کو اُسی طرف متوجہ ہوکر نماز پڑھنے کی رغبت ہوئی جسطرف کہ یہودی متوجہ ہوکر نماز پڑھتے تھے۔ بلاشبہ مشرکین کو یہہ امر شاق گذرا ہوگا، لیکن بیت المقدس کیطرف متوجہ ہوکر نماز پڑھنے میں ایک بڑی حکمت یہ تھی کہ مشرکین میں سے جو لوگ منافق تھے وہ اصلی ایمان والوں

کس چیز نے اُنکو پھیر دیا اُنکے قبلہ سے جسپر کہ وہ تھے -

سے بالکل ممیز ہو جاتے تھے یہی بات خدا تعالیٰ نے بھی فرمائی ہے کہ ''وما جعلنا القبلۃ التی کنت علیھا الا لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علی عقبیہ'' یعنی ہم نے اُس قبلہ کو جسپر تو تھا بجز اس مطلب کے اور کسی لئے نہیں مقرر کیا تھا کہ ہم جان لیں اُس شخص کو جو پیروی کرتا ہے رسول کی اُس شخص سے جو پھر جاتا ہے اپنی ایڑیوں پر -

مدینہ میں اور اُسکے گرد نواح میں کثرت سے یہودی رہتے تھے، اور اُنھوں نے بھی اسلام کیطرف رغبت ظاہر کی، چند نے دل سے اسلام کو برحق جانا، اور بہت سے ایسے تھے جو بطور منافقوں کے مسلمانوں کیساتھ شریک ہوتے تھے، پس جو ضرورت منافقین مشرکین کو اصلی ایمان والوں سے ممیز کرنیکی پیش آئی تھی وہی ضرورت منافقین یہود کو اصلی ایمان والوں سے ممیز کرنیکی پیش آئی ہے، ایک شخص ظاہرداری کیلیئے دوسری مذہب کی جسکو کہ وہ حق نہیں سمجھتا جھوٹی باتوں میں منافقانہ طور شریک ہو سکتا ہے لیکن کسی ایسی باتمیں جو ایک امر عظیم ہو اور خاص عبادت سے علاقہ رکھتا ہو اور ایک مذہب کو چھوڑکر دوسری مذہب میں داخل ہونیکی بطور ایک نشانی کے ہو اُسکو بطور ایک نفاق کے ادا کرنے سے بالطبع نفرت اور پرہیز کرتا ہے، اور جب تک کہ دل ہی سے اُس دوسرے مذہب کو نہ قبول کر لیا ہو اُسوقت تک اُسکو ادا نہیں کرتا اسلیئے آنحضرت کو فکر ہوئی کہ سمت قبلہ کو تبدیل کیا جاے، اور اُس پر خدا سے وحی آئی کہ کعبہ کیطرف سمت قبلہ بدل دو، اسی کیطرف خدا تعالیٰ نے اشارہ کیا ہے جہاں فرمایا ہے ''قد نریٰ تقلب وجھک فی السماء فلنولینک قبلۃ ترضٰھا فول وجھک شطر المسجد الحرام''، یعنی ہم نے دیکھا تیرا منہہ کا پھیرنا آسمان کی طرف پھر ضرور ہم تجھکو ایک ایسے قبلہ کی طرف پھیرینگے جسکو تو پسند کریگا، پس پھیر اپنا منہہ مسجد حرام کیطرف - بیت المقدس اور بیت الحرام دونوں مسجدیں تھیں، اور دونوں میں سے کسی طرف منہہ کرکے نماز پڑھنا برابر تھا مگر ایسا کرنے سے منافقین یہود کی اصلی ایمان والوں سے تمیز ہو گئی، یہہ امر ایک ایسا ممیز قرار پایا کہ آنحضرت نے فرمادیا کہ ''من استقبل قبلتنا فھو مسلم'' یعنی جس شخص نے کہ ہمارے قبلہ کیطرف نماز پڑھی وہ مسلمان ہے اور درحقیقت یہ امر ایسا ہے کہ جب تک کوئی یہودی دل سے مسلمان نہو گیا ہو بیت المقدس چھوڑکر کعبہ کیطرف نماز پڑھنے پر بالطبع اُسکو جرأت نہیں ہو سکتی -

قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ

اِسی نشان کے قایم اور مستحکم رہنے کو خدا نے یہ حکم دیا کہ جہاں کہیں تم ہو اور جہاں کہیں جاؤ تو کعبہ ہی کی طرف منہہ کرکے نماز پڑہو، مگر سمت قبلہ قرار دینے میں ایک بڑا نقص یہ لازم آتا ہے کہ لوگوں کے خیال میں یہ بات جمتی ہے کہ اُس سمت کو یا اُس مکان کو جو سمت کے لیے مخصوص کیا گیا ہے خدا کی ذات سے کوئی خاص خصوصیت ہے، اور اُس سمت میں یا اُس مکان میں بالتخصیص خدا ہے۔

اس خیال کے باطل کرنیکو صاف صاف ہدایتیں خدا نے تحویل قبلہ کی ساتھہ ہی ساتھہ بتلادیں جہاں فرمایا کہ "وللہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ" یعنی خدا کے لیے ہے مشرق اور مغرب پس جدہر منہہ کرو پھر اُدہر ہی خدا کا منہہ یعنی اُسکی ذات ہے۔ اِس ہدایت نے صاف صاف لوگوں کو شرک سے نجات دی، اور جس طرح کہ مشرکین اپنے بتوں یا معبدوں کو سمت قبلہ بناتے ہیں، اور جسطرح کہ مسلمانوں نے سمت قبلہ ٹہیرایا ہے، اُن دونوں کے فرق کو بخوبی سمجھا دیا ہے، اور ہر شخص سمجھہ سکتا ہے کہ مشرکین کی سمت قبلہ اور مسلمانوں کی سمت قبلہ میں کیا فرق ہے مسلمانونکے مذہب کے مطابق کوئی خصوصیت یا وقعت بیت المقدس یا بیت الحرام کو قبلہ ہونیکے لیے نہیں ہے بجز اسکے کہ وہ صرف ابتداءً واسطے تفرقے درمیان منافقین اور مومنین کے ٹہیرایا گیا، اور انتہاءً بطور مسلمانون کی ایک نشانی کے قرار پایا۔

کعبہ کیطرف منہہ کرکے نماز پڑہنا اسلام کا کوئی اصلی حکم نہیں ہے۔ جو احکام اسلام میں ہیں لوگ اُن کو بخوبی نہیں سمجھتے۔ اِس بات میں تو بہت لوگوں نے کوشش کی ہے کہ کونسا حکم فرض ہے، اور کونسا واجب، اور کونسا سنت اور کون سا مستحب، جو صرف ایک فرضی یا خیالی یا اصطلاحی امور ہیں، اور اس تفریق کو اصل مذہب اسلام سے کچھہ چنداں تعلق نہیں ہے۔ اسلام کی حقیقت اور اُسکے اسرار جاننے والے کو صرف اُسی تفریق کا جاننا کافی نہیں ہے، بلکہ اُسکو اس امر کا جاننا اور اِس امر کا تحقیق کرنا ضرور ہے کہ درحقیقت اصلی احکام اسلام کے جن پر اسلام قایم ہے کونسے ہیں اور اُنکے سوا کون سے۔

بالفعل مذہب اسلام جو ایک مجموعہ حقیقی اور فرضی یا واقعی اور قیاسی یا اجتہادی اور استنباطی احکام کا گنا جاتا ہے، دو قسم کے احکام پر منقسم ہوسکتا ہے۔ اول حقیقی اور واقعی۔ دوم فرضی اور قیاسی اور

کہہ اے پیغمبر اللہ ہی کے لئیے ہی مشرق اور مغرب

اجتہادی اور استنباطی پچھلی قسم کو مذہب اسلام کے احکام قرار دینا صرف ایک فرضی یا اصطلاحی بات ہے اور صرف اِس وجہ سے کہ ائمہ اسلام اور علمائے اعلام نے انکو استخراج کیا ہے احکام اسلام کا بطور ایک اصطلاح کے اُن پر اطلاق ہوتا ہے ورنہ درحقیقت وہ اصلی احکام مذہب اسلام کے نہیں ہیں۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اُن احکام کو تسلیم کرے خواہ نہ کرے دونوں حالتوں میں اُسکے اسلام میں کچھ فرق نہیں آتا۔ اگر درحقیقت وہ واقعی اصلی احکام اسلام کے ہوتے تو اُنکے نہ ماننے سے اسلام سے خارج ہونا ایک امر لازمی ہوتا۔ جہانتک کہ خرابیاں مذہب اسلام میں مخالفین بیان کرتے ہیں وہ اسی غلطی پر مبنی ہیں کہ اُنھوں نے اُن احکام اور مسائل کو جنکو علماء اور ائمہ نے استنباط اور استخراج کیا ہے جزو اسلام سمجھا ہے حالانکہ اسلام کو اُنسے کچھ علاقہ نہیں۔ اگر وہ صحیح اور ٹھیک ہیں فہو المراد اور اگر اُنمیں کوئی غلطی اور خطا ہے تو وہ اُنکی ہے جنھوں نے انکو استخراج کیا ہے نہ مذہب اسلام کی۔ ہمارا مقصد اس بیان سے کسی عالم یا امام کی حقارت کرنیکا یا کسی شخص کی جو اُنکی پیروی کرتا ہے تحقیر کرنیکا یا اُسکو بُرا جاننے کا نہیں ہے بلکہ صرف احکام اصلی اور استخراجی میں فرق بتانا، اور اُن لوگوں کو جو حقایق یا اسرار اسلام پر غور کرنا یا مخالفین اسلام کو جو اُسپر اعتراض کرنا چاہتے ہیں حقیقت احکام اور تفرقہ اُن دونوں قسم کے احکام میں بتانا مقصود ہے تاکہ پہلے تحقیق حقائق یا اسرار اسلام میں اور پچھلے غلط بنا پر اعتراض کرنے میں غلطی نہ کریں۔

پہلی قسم البتہ بیان کرلایق ہے۔ مذہب اسلام میں جو اصلی اور واقعی احکام ہیں وہ دو قسم ہیں ایک اصلی اور دوسری محافظ احکام اصلی جسکو ہم اِس زمانہ میں قانون اور ضابطہ کارروائی سے اصطلاح قانونی میں تعبیر کرتے ہیں۔ مذہب اسلام کے احکام اصلی جسقدر ہیں اُنہی پر اسلام کی بنیاد قایم ہے اور اُنمیں سے کوئی حکم بھی ایسا نہیں ہے جو قانونِ قدرت اور انسان کی نیچر کے برخلاف ہو، بلکہ اُنپر غور کرنے سے اِس بات پر یقین ہوتا ہے کہ مذہب انسان کیلئے بنایا گیا ہے نہ انسان مذہب کیلئے۔ احکام محافظ سے صرف احکام اصلی کی حفاظت مقصود ہے اور وہ خود مقصود بالذات نہیں ہیں۔ یہہ احکام ایک ایسے عام قاعدہ پر صادر ہوئے ہیں جو قریباً کل افراد کے مناسب حال ہیں اور ممکن ہے کہ کسی شاذ ونادر فرد کے مناسب حال نہوں،

یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ

مگر ایسا ہونا اُن احکام کے نقصان کا باعث نہیں ہے کیونکہ تمام احکام عام کا یہہ خاصہ ہے کہ قریباً کُل افراد کے مناسب حال ہوتے ہیں گو کہ کوئی شاذ و نادر فرد ایسی بھی نکلتی ہے کہ اُسکے مناسب حال نہوں مگر اِس مطلب سے کہ قاعدہ کلیہ ٹوٹنے نپائے تمام افراد کے ساتھہ یکساں عمل کرنا واجب ہوتا ہے،

احکام محافظ کی نسبت کسی نادان کا کوئی اعتراض کرنا، اور اُنکی نسبت اِس بحث کا پیش کرنا کہ اُن میں نیچر کی کیا مطابقت ہے، اور اِن احکام کو قانون قدرت سے کیا تعلق نہیں معلوم ہوتا، ایک محض بیوقوفی کا اعتراض ہوگا، کیونکہ وہ احکام بالذات اس اعتراض اور بحث کے کہ وہ نیچر کے مطابق ہیں یا نہیں مورد نہیں ہوسکتے، بلکہ اُنپر یہ بحث ہوسکتی ہے کہ آیا وہ احکام اُن اصلی احکام کے جو بالکل قانون قدرت کے مطابق ہیں محافظ ہیں یا نہیں، اگر اُن کا محافظ ہونا ثابت ہو تو وہ بھی ضمناً داخل احکام اصلی اور مطابق قوانین قدرت اور صحیح تصور ہونگے، اور اگر اُنسے ان اصلی احکام کی محافظت ثابت نہو تو بلاشبہہ وہ غلط ہونگے

ہاں ایک بحث اُن پر اور ہوسکتی ہے کہ جو طریقہ اُن احکام اصلی کی حفاظت کا احکام محافظ میں قرار دیا ہے مثل اُسکے دوسرا طریقہ بھی حفاظت کا موجود تھا، حالانکہ اُسکے ترک اور اُسکے اختیار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یا یہ کہ اُن احکام اصلی کی حفاظت کا دوسرا طریقہ اُس سے بھی اچھا موجود تھا۔

پہلا شبہہ اگر وہ تسلیم بھی کرلیا جاوے تو بھی لغو اور مہمل ہوگا، کیونکہ یہ شبہہ بطور ایک شبہہ عامۃ الورود کے ہوگا جسکو تمام عقلا لغو اور بیہودہ سمجھتے ہیں، کیونکہ اگر بالفرض دو مساوی چیزوں میں سے ایک کے ترک اور ایک کے اختیار کی کوئی وجہ نہو تو جو شبہہ اُس پر وارد ہوتا ہے وہی شبہہ اُسوقت بھی وارد ہوگا جبکہ مختار کو ترک اور متروک کو اختیار کیا جاوے۔ دوسرا شبہہ اگر وارد ہو تو البتہ تسلیم کے قابل ہوگا لیکن ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ مذہب اسلام میں جو طریقہ حفاظت احکام اصلی کا قرار دیا گیا ہے اُسکے مساوی بھی کوئی اور طریقہ اُنکی حفاظت کا نہیں ہے چہ جای اسکے کہ اُس سے افضل کوئی دوسرا طریقہ ہو۔

ہم اِس مطلب کو دو ایک مثالوں سے سمجھاتے ہیں مثلاً نماز۔ قرآن مجید میں صرف نماز کا مقرر ہونا آیا ہے۔ اصلی حکم نماز کا اُس سے صرف اُسکے بندہ کا خدا کی طرف خلوص اور خضوع اور خشوع سے متوجہ ہونا، اور عجز عبدیت کا ظاہر کرنا، اور شان خالقیت کا تسلیم کرنا، اور اُسکے سامنے اپنے تئیں عاجز اور ذلیل اور

ہدایت کرتا ہے جسکو چاہتا ہے

مسکین بتانا بھی ارکان نماز کی جو قرار دئے گئے ہیں وہ اُس تمام خضوع و خشوع ظاہری اور باطنی کے محافظ ہیں۔ پس ان احکام محافظ پر یہ اعتراض کرنا کہ نماز میں اُٹھنا اور بیٹھنا اور سر ٹیکنا نیچر کے برخلاف ہے ایک بیوقوفی کا اعتراض ہے، کیونکہ ان احکام میں ایک یہ بات دیکھنی ہو کہ درحقیقت وہ اُس اصلی حکم کے محافظ ہیں یا نہیں۔

ان احکام اصلی اور احکام محافظ کا تفرقہ ایسے مقام پر بخوبی واضح ہو جاتا ہے جبکہ کوئی حکم احکام محافظ میں سے ساقط ہو جاتا ہے، اور اُسکا سقوط ثابت کرتا ہے کہ وہ اصلی حکم نہیں تھا جیسے نماز میں قیام اور قعود اور رکوع اور سجود اور قرأت، یہ سب احکام محافظ ہیں، جب انسان ان پر قادر نہیں ہوتا تو کسی کا ادا کرنا اُسپر لازم نہیں ہوتا۔ برخلاف اُس اصلی حکم نماز کے کہ وہ کسی حالت میں انسان سے جب تک کہ اُسپر مکلف ہونیکا اطلاق کیا جاتا ہے ساقط نہیں ہوتا۔ اس سے جو تمیز کہ ان دونوں قسم کے احکام میں ہے وہ بخوبی واضح ہوتی ہے، یا مثلاً اسلام نے ایک اخلاقی امر کی نسبت یہ حکم دیا ہے کہ جو عورت کہ اُسکا خاوند مر جاوے یا اُسکو طلاق دے تو اُسکو دوسرا شوہر کرنے میں اسقدر توقف کرنا چاہئے جس سے معلوم ہو جاوے کہ وہ اِس شوہر سے حاملہ ہے یا نہیں اور اِس امر کے دریافت کرنیکو ایک میعاد مقرر کی ہے جو عورتوں کے نیچر سے مناسبت رکھتی ہے۔ یہ حکم احکام محافظ میں سے ایک حکم ہوگا، اور بلاشبہ ایسی عورت کے جسنے اُس مدت سے بھی زیادہ عرصہ سے اپنے شوہر سے مقاربت نہ کی ہو مناسب حال نہ ہوگا، مگر یہ حکم تمام افراد سے از روئے عمل کے اسلئے متعلق ہوگا کہ عام قاعدہ جو اکثر افراد سے متعلق ہے ٹوٹنے نہ پائے، پس اس حکم محافظ پر یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ قانون قدرت کے مطابق نہیں ہو کیونکہ یہ حکم اُس قانون قدرت کا محافظ ہے جس سے اولاد کو اپنے باپ پر اور باپ کو اپنی اولاد پر قانون قدرت کی موافق حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

مگر یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اگرچہ احکام اصلی اور احکام محافظ اپنی اصلیت میں مختلف درجہ اور حیثیت رکھتے ہیں لیکن عملاً دونوں کا درجہ برابر ہے اور اسلئے جسطرح احکام اصلی کی تعمیل لازم ہے اُسی طرح احکام محافظ کی بھی تعمیل لازم ہے کیونکہ وہ دونوں لازم و ملزوم یا موقوف و موقوف علیہ ہیں، اور اسلئے عملاً دونوں میں کچھ فرق نہیں نماز میں سمت قبلہ کوئی حکم اصلی مذہب اسلام کا نہیں ہے، اور اِس لئے ایک ادنیٰ سے عذر

اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۳۶﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴿۱۳۷﴾ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۳۸﴾

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ

ساقط ہو جاتا ہے، مثلاً سمت مشتبہ ہونے پر، سہواً کسی دوسری سمت نماز پڑھ لینے پر بعض صورتوں میں گھوڑے کی سواری پر، دریا کے سفر میں، اور اس چودھوین صدی نبوی میں ریل کے سفر میں اور علیٰ ہذا القیاس مگر چونکہ یہ حکم بطور ایک نشان اور تمیز اُن لوگوں کے قرار دیا گیا ہے جنہوں نے اسلام قبول کیا ہے، اسلئے اسکا بھی بجالانا مثل احکام اصلی کے ضرور ہوگا، اور قصداً ترک نہ کیا جائیگا، ہاں اُن لوگوں پر تعجب ہوگا جو غلبۂ اوہام سے سمت قبلہ کے لئے دوپہر میں باہر نکل کر سورج کو دیکھتے پھرتے ہیں کہ کسطرف سے نکلا تھا اور کسطرف ڈوبیگا، اور اپنی جیبوں اور تسبیحوں میں قطب نما یا قبلہ نما رکھے یا لٹکائے پھرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ ٹھیک ہماری ناک کعبہ کے سامنے ہو جائے، اور اسی میں ایک بڑا ثواب اور ٹھیک ٹھیک نماز کا ادا کرنا سمجھتے ہیں۔

سمت قبلہ کی تحویل پر یہودی جو طعنہ دیتے تھے اُسکا ذکر بھی خدا نے اس مقام پر کیا ہے، اور اُن کی نادانی کو بتلایا ہے کہ باوجود اس بات کے جاننے کے کہ تحویل قبلہ ٹھیک ہے، پھر اُس پر طعنہ کرتے ہیں جہاں فرمایا ہے کہ "یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم" یعنی یہودی تحویل قبلہ کا حق ہونا ایسا ہی جانتے ہیں جیسے کہ وہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں۔ "یعرفونہ" میں جو ضمیر ہے اسکی نسبت مفسرین میں اختلاف ہے، اکثر تو اُسکو آنحضرت صلعم کیطرف

سیدہے رستہ کی (۱۳۶) اور جسطرح کہ ہمنے تمکو سیدہے رستے کی ہدایت کی ہی اسیطرح ہمنے تمکو اچھی خصلت کی اُمت بنایا ہی تاکہ تم لوگونپر گواہ ہو اور رسول تمپر گواہ ہو (۱۳۷) اور نہیں مقرر کیا ہمنے اُس قبلہ کو جسپر تو تھا بجز اسکے کہ ہم جان لین اُس شخص کو جو پیروی کرتا ہے رسول کی اُس شخص سے جو پہرجاتا ہے اپنی ایڑیوں پر، اور البتہ لوگون پر، یہ بات بڑی دشوار ہے بجز اُن لوگون کے جنکو اللہ ہدایت کرے، اور یہ نہیں ہے کہ اللہ ضایع کرے تمہارا ایمان، بیشک اللہ لوگوں کے ساتھ شفقت کرنیوالا ہی مہربان (۱۳۸) البتہ ہمنے دیکھا تیرے منہہ کا پہیرنا آسمان کی طرف،

راجع کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہودی توریت کی بشارات سی آنحضرت کا نبی برحق ہونا ایسا ہی یقینی جانتے تھے جیسے کہ وہ اپنے بیٹونکو جانتے تھے، اور ابن عباس اور قتادہ اور ربیع اور ابن زید کا یہ قول ہے کہ یعرفونہ کی ضمیر امر قبلہ کیطرف راجع ہی اور یہی راے صحیح معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ بیان اول سے آخر تک امور متعلق قبلہ کا ذکر ہے نہ آنحضرت کے نبی ہونیکی بشارات کا۔

توریت میں حضرت ابراہیم کا اور حضرت اسمٰعیل کا اور اُنکے فاران میں یعنی حجاز میں آباد ہونیکا ذکر موجود ہے، جس پر یہودی مذہبی اعتقاد سے بھی یقین رکھتے تھے، یہودی توریت کی روسے اس بات کو بھی یقینی جانتے تھے کہ حضرت ابراہیم کا طریقہ عبادت کے لئے مذبح قایم کرنے اور بیت ایل یعنی بیت اللہ بنانے کا تھا، اُنکو اپنی قومی اور پشتینی روایتوں سے یقین کامل تھا کہ کعبہ حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا بیت اللہ ہے اور من وجہ بیت المقدس سے ترجیح رکھتا ہے، اور اُسکی طرف سمت قبلہ ہونا عین حق اور درست ہے انہی وجوہ پر خدانے فرمایا کہ "یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم" اور یہی وجہ اُنکے الزام کی ہی کہ باوجود ان سب باتون کے جاننے کے حق بات کو چھپاتے ہیں اور پھر تحویل قبلہ پر طعنہ دیتے ہیں۔

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا

الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ (۱۳۹)

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ وَمَا اَنْتَ

بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ

اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۱۴۰)

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ فَرِيْقًا

مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۱۴۱) اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ

مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (۱۴۲) وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۴۳)

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۱۴۴) وَمِنْ

حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

پھر ہم تجھکو ایک قبلہ کیطرف پھیرینگے کہ تو اُسکو پسند کریگا۔ پھر پھیر اپنا منھہ مسجد حرام کی طرف، اور جہاں تم ہو پس پھیرو اپنے منھونکو اُسی کیطرف، اور بیشبہہ جن لوگوں کو کتاب دیگئی ہے البتہ جانینگے وہ حق ہے اُنکے پروردگار سے، اور اللہ بیخبر نہیں ہے اُس چیز سے جو وہ کرتے ہیں (۱۳۹) اور اگر تو اُن لوگونکے لئے جنکو کتاب دیگئی ہی تمام نشانیاں لے آوے تب بھی تیرے قبلہ کی پیروی نہ کرینگے، اور تو بھی اُنکے قبلہ کی پیروی کرنیوالا نہیں ہے، اور نہ اُنھیں کے بعضے پیروی کرنیوالے ہیں بعضوں کے قبلہ کی، اور اگر تو اُنکی خواہشونکی پیروی کرے بعد اسکے کہ تجھکو علم آگیا ہی تو بیشک تو اسوقت ہوگا ظالموں میں (۱۴۰) وہ لوگ جنکو ہمنے کتاب دی ہی اُسکو پہچانتے ہیں جسطرح اپنے بیٹونکو پہچانتے ہیں، اور ہاں اُنھیں سے ایک فریق البتہ چھپاتا ہے حق کو اور وہ جانتے ہیں (۱۴۱) حق (بات) ہے تیرے پروردگار (کیطرف) سے، پھر تو مت ہو شک کرنیوالوں میں (۱۴۲) اور ہر ایک کیلئے ایک طرف ہی کہ وہ اسطرف مُنھہ کرتا ہی پس تم دوڑکر بھلائی کو لو جہاں کہیں تم ہوگے تم کو اللہ لے آویگا اکٹھا بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہی (۱۴۳) اور جہاں کہیں تم جاؤ پھر اپنے مُنھہ کو مسجد الحرام کیطرف پھیرو اور بیشک وہی حق ہی تیرے پروردگار کیطرف سے، اور اللہ بیخبر نہیں ہے اُس چیز سے جو تم کرتے ہو (۱۴۴) اور جہاں کہیں تم جاؤ پھر پھیرو اپنے مُنھہ کو مسجد الحرام کی طرف،

وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۴۵﴾ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿۱۴۶﴾ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿۱۴۷﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ﴿۱۴۹﴾

یہ سب باتیں جو ہمنے بیان کیں ایسی صاف و صریح ہیں کہ ہر شخص جو قرآن مجید کے سیاق و سباق عبارت پر غور کریگا بلا شبہ انکو تسلیم کریگا۔

(۱۴۹) (ولا تقولوا) اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد بھی خدا تعالیٰ نے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے تھے شدائد پر صبر کرنے کی ہدایت کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافروں نے مسلمانوں کے قتل و قتال پر کمر باندھی تھی اور یہ آیت بعد وقوع قتل و قتال نازل ہوئی ہے جس میں کچھ مسلمان کام آئے تھے مفسرین کا قول ہے کہ وہ جنگ بدر تھی جس میں چھہ مسلمان مہاجرین میں سے اور آٹھ انصار میں سے کام آئے تھے۔ بہرحال کسی واقعہ کے بعد یہ آیت نازل ہوئی ہو ہمکو بحث ہے تو اس بات سے ہے کہ اس قول کے کہ ”انکو مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں“ کیا معنی ہیں۔
اسکی نسبت مفسرین کے تین قول ہیں ایک یہ کہ وہ شہید ہوتے ہی اسیوقت درحقیقت زندہ ہو جاتے ہیں لیکن ہمکو انکا زندہ ہونا نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے یہ کہ احیا سے مراد سمجھیوں ہے کہ یعنی زندہ ہونگے یعنی قیامت کے

اور جہاں کہیں تم ہو پھیرو اپنے منہوں کو اُسی کیطرف تاکہ نہو لوگوں کو تمپر کچھ حجت بجز اُن لوگوں کے جنہوں نے اُنمیں سے ظلم کیا ہے پس اُن سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور تاکہ پوری کروں میں تمپر اپنی نعمت اور تاکہ تم ہدایت پاؤ (۱۴۵) جسطرح کہ ہمنے تم میں تم ہی میں سے رسول بھیجا ہے سناتا ہے تمکو میری نشانیاں اور تم کو پاک کرتا ہے اور تمکو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ ہر چیز تمکو سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے (۱۴۶) پھر مجکو یاد کرو میں تمکو یاد کرونگا، اور میرا شکر کرو اور ناشکری مت کرو (۱۴۷) ای لوگو جو ایمان لای ہو مدد چاہو صبر کرنی سے اور نماز پڑہنے سے بیشک اللہ تعالی صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے (۱۴۸) اور مت کہو اُن لوگونکو جو ماری جاویں اللہ کی راہ میں مُردے بلکہ وہ زندہ ہیں ولیکن تم نہیں جانتے (۱۴۹)

ون۔ اسکی مثال ایسی ہے جیسے کہ خدانے کہا ہے کہ "ان الابرار لفی نعیم وان الفجار لفی جحیم" "ان المنفقین فی الدرک الاسفل من النار"۔ ان الذین اٰمنوا وعملوا الصلحات فی جنات نعیم اُن سب کے معنی یہ ہیں کہ سیصیرون کذلک یعنی عنقریب ایسے ہو جاوینگے تیسرے یہ کہ اُنکو مردہ مت کہو وہ تو زندہ ہیں یہ کہنا ایسا ہے جیسے کہ کوئی کہے کہ "ما مات رجل خلف مثلک" یعنی وہ شخص نہیں مرا جسنے تیری مانند خلف چھوڑا ہے۔

جو لوگ دین کی استقامت کے سبب مارے گئے ہیں درحقیقت اُنھوں نے دین حق کے پھیلانے اور اپنے بعد اُس نیکی کے قایم رہنے اور جاری رہنے کے لئے جان دی ہے۔ پس اُنھوں نے اپنے بعد ایسی نیکی چھوڑی ہے جو اُس سے بہتر نہیں ہو سکتی تو اسی اعتبار سے اُنکی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ مرے نہیں ہیں بلکہ زندہ ہیں جنسے ایسی نیکی قایم و جاری ہے۔ پس حیات سے اُنکی حیات فی الدین مراد ہے جیسے کہ ایک جگہہ خدانے ایمان والوں کی نسبت فرمایا ہے "او من کان میتًا

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ
وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ﴿۱۵۰﴾ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ
قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿۱۵۱﴾ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ
مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ﴿۱۵۲﴾ إِنَّ الصَّفَا وَ
الْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿۱۵۳﴾
إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا
بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ﴿۱۵۴﴾
إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَ
أَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۱۵۵﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ
أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۱۵۶﴾
خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿۱۵۷﴾

وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا

فاحییناہ،، اور سورہ آل عمران میں جو خدا نے انکی حیات کے ساتھ یہ قید بھی لگائی ہے کہ بل احیاء عند

اور ہم تمہارا امتحان کرینگے ایک چیز سے ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے
نقصان سے اور خوشخبری دے صبر کرنیوالونکو (۱۵۰) وہ لوگ جب انکو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو
کہتے ہیں کہ بیشک ہم اللہ کے لئے ہیں اور ہم اُسی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں (۱۵۱) یہی لوگ
ہیں کہ اُن پر اُنکے پروردگار کیطرف سے درود اور رحمت ہے اور وہی لوگ ہدایت پائی ہوئی
ہیں (۱۵۲) بیشک صفا و مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں پھر جسنے حج کیا خانہ کعبہ کا یا
عمرہ ادا کیا پھر اُس پر گناہ نہیں ہے کہ اُن دونوں کا طواف کرے اور جس نے اپنی خوشی
سے ادا کیا نیکی کو پھر بیشک اللہ شکر کرنیوالا ہے جاننے والا (۱۵۳) ہاں جو لوگ کہ چھپاتے
ہیں اُس چیز کو جو ہمنے اُتاری ہے نشانیوں اور ہدایت سے بعد اِسکے کہ ہمنے اُسکو لوگوں کیلئے
کتاب میں بیان کر دیا ہے وہی لوگ ہیں کہ اُنپر خدا لعنت کرتا ہے اور اُن پر لعنت کرتے ہیں
لعنت کرنیوالے (۱۵۴) بجز اُن لوگوں کے جنھوں نے توبہ کی اور نکوکاری اختیار کی اور ظاہر کر دیا
پھر وہی لوگ ہیں کہ میں اُنکو معاف کرونگا اور میں بڑا معاف کرنیوالا ہوں مہربان (۱۵۵) ہاں
جو لوگ کافر ہوئے اور مر گئے اور وہ کافر ہے وہی ہیں کہ اُن پر اللہ کی اور فرشتوں
اور آدمیوں کی سب کی لعنت ہے (۱۵۶) ہمیشہ اُسی میں رہیں گے نہ اُن پر سے عذاب
کی تخفیف ہوگی اور نہ اُنکو مہلت دیجاویگی (۱۵۷) اور تمہارا خدا خدائے واحد ہے نہیں کوئی

س ۱۵۴ اِس سے اور زیادہ اس مطلب کو تقویت ہوتی ہے کہ انکی حیات سے حیات فی الدین مراد ہے
نہ اور کسی قسم کی حیات ہمیرے نزدیک تیسرے معنی صحیح ہیں۔

هو الرحمن الرحيم ۝١٥٨ إن في خلق السموت والأرض
واختلاف اليل والنهار والفلك التي تجري في البحر بما
ينفع الناس وما أنزل الله من السماء من ماء فأحيا به الأرض
بعد موتها وبث فيها من كل دابة وتصريف الريح والسحاب
المسخر بين السماء والأرض لايت لقوم يعقلون ۝١٥٩ ومن الناس
من يتخذ من دون الله أندادا يحبونهم كحب الله والذين
امنوا أشد حبا لله ولو يرى الذين ظلموا إذ يرون العذاب
أن القوة لله جميعا وأن الله شديد العذاب ۝١٦٠ إذ تبرأ
الذين اتبعوا من الذين اتبعوا وراوا العذاب وتقطعت بهم
الأسباب ۝١٦١ وقال الذين اتبعوا لو أن لنا كرة فنتبرأ منهم
كما تبرءوا منا كذلك يريهم الله أعمالهم حسرت عليهم
وما هم بخرجين من النار ۝١٦٢ يأيها الناس كلوا مما في
الأرض حللا طيبا ولا تتبعوا خطوت الشيطن إنه لكم
عدو مبين ۝١٦٣ إنما يأمركم

خدا بجز اُسکے بخشنے والا ہی مہربان ﴿۱۵۸﴾ بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے اختلاف میں اور کشتی میں جو دریا میں چلتی ہے جو نفع پہونچاتی ہے آدمیونکو اور اُس چیز میں جسکو اللہ نے آسمان سے اُتارا ہے یعنی پانی پہر زندہ کر دیا اُس سے زمین کو اُسکے مرنے کے بعد اور پہیلا دئے اُس میں ہر طرح کے چلنے والے جانور اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلونکو آسمان اور زمین کے درمیان تابعدار کرنے میں البتہ نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو سمجہتے ہیں ﴿۱۵۹﴾ اور لوگوں میں سے کوئی ٹہیراتا ہے اللہ کے سوا اللہ کی مانند محبت کرتے ہیں اُن سے اللہ کی محبت کی مانند اور جو لوگ ایمان لائے ہیں بہت زیادہ ہیں اللہ کی محبت میں اور اگر کوئی دیکہے اُن لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا ہے جبکہ وہ عذاب کو دیکہیں گے (تو جانیگا کہ) بیشک ساری طاقت اللہ کے لئے ہے اور بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے ﴿۱۶۰﴾ جب بیزار ہونگے وہ لوگ جنکی پیروی کی گئی تہی اُن لوگوں سے جنہوں نے پیروی کی تہی اور دیکہیں گے عذاب کو اور کٹ جاوینگے اُنکے ذریعے ﴿۱۶۱﴾ اور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے پیروی کی تہی کاش ہمارے لئے دوبارہ جانا ہو تو ہم بیزار ہوں گے اُن سے جسطرح کہ وہ ہم سے بیزار ہوئے ہیں اسطرح اُنکو دکہاویگا اللہ اُنکے اعمال پشیمانیاں (ہونگی) اُن پر اور وہ آگ سے نکلنے والے نہونگے ﴿۱۶۲﴾ اے لوگو کہاؤ اُس چیز کو جو زمین میں ہے حلال پاکیزہ اور مت پیروی کرو شیطان کے قدمونکی بیشک وہ تمہارے لئے دشمن ہے علانیہ ﴿۱۶۳﴾ اِسکے سوا اور کچہہ نہیں ہے کہ وہ تم کو حکم کرتا ہے۔

بِالسُّوۡٓءِ وَالۡفَحۡشَآءِ وَاَنۡ تَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾
وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَآ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ
اٰبَآءَنَا اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡـًٔا وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۶۵﴾
وَمَثَلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا كَمَثَلِ الَّذِىۡ يَنۡعِقُ بِمَا لَا يَسۡمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ
نِدَآءً صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡـىٌ فَهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۶﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُلُوۡا
مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ وَاشۡكُرُوۡا لِلّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ اِيَّاهُ تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۱۶۷﴾
اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةَ وَالدَّمَ وَلَحۡمَ الۡخِنۡزِيۡرِ وَمَآ اُهِلَّ

(۱۶۷) (کلوا من طیبات) اِس آیت سے پہلے خدا تعالیٰ نے اُن پاکیزہ چیزوں کے کھانیکی اجازت دی تھی جو زمین میں ہیں یعنی جو زمین سے پیدا ہوتی ہیں، اور اِس آیت میں عموماً پاکیزہ چیزوں کے کھانیکی اجازت ہے جس لفظ کا ترجمہ ہمنے پاکیزہ کیا ہے وہ لفظ طیبات ہے، اُسکے معنی مزے دار اور خوشگوار غیر مضر کے ہیں تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ ''ان الطیب فی اصل اللغۃ عبارۃ عن المستلذ المستطاب'' پس اِن آیتوں سے معلوم ہوا کہ تمام چیزیں جو انسان کے لئے مضر نہیں ہیں وہ حلال ہیں، اور وجہ حلت اور حرمت اشیاے ماکول جو خدا نے بتائی ہے وہ اُنکے مضر اور غیر مضر یا مضر اور مفید ہونے پر مبنی ہے۔

(۱۶۸) (انما حرم) اِس آیت میں اُن تین مضر چیزوں کا بالتخصیص ذکر کیا ہے جنکے کھانے کا رواج عرب کی قوموں میں تھا عرب کے لوگ مرے ہوے جانور کو اور سور کو کھاتے تھے، اور جانوروں کے گلا کاٹنے میں جو خون نکلتا ہے اُسکو کسی برتن میں جمع کرتے تھے، اور جب وہ جمکر لوتھڑا ہو جاتا تھا تو بھونکر کھاتے تھے اور یہ تینوں چیزیں انسان کے لئے مضر ہیں گو کہ مثل زہر کے فی الفور اُنکی مضرت نہ ظاہر ہو۔

برائی کا اور بیحیائی کا اور اِس بات کا کہ تم کہو اللہ پر وہ کچھ جو تم نہیں جانتے (۱۶۴) اور جب اُنسے کہا جاوے کہ پیروی کرو اُسکی جو اللہ نے اُتارا ہے تو کہتے ہیں کہ (نہیں) بلکہ ہم پیروی کرینگے اُس چیز کی جسپر ہمنے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور اگرچہ تھے اُنکے باپ دادا کہ نہیں جانتے تھے کچھ بھی اور نہ ہدایت پائے ہوئے تھے (۱۶۵) اور اُن لوگوں کی مثال جو کافر ہوئے اُس شخص کی (بھیڑوں کی) مثال کی مانند ہے جو آواز دیتا ہے ایسے بے معنی الفاظ سے کہ بجز بلانے اور آواز کرنیکے اور کچھ نہیں سنتا۔ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں پھر وہ نہیں سمجھتے (۱۶۶) اے لوگو جو ایمان لائے ہو پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہمنے تمکو دی ہیں اور اللہ کا شکر کرو اگر تم اُسکی عبادت کرتے ہو (۱۶۷) اسکے سوا اور کچھ نہیں کہ حرام کیا ہے تم پر مرا ہوا اور خون اور سور کا گوشت اور وہ (جسپر ذبح کرنے میں اور کسی کا نام) سوی

مرے ہوئے جانور کے مضر ہونے میں جو اپنی موت سے مرجاتا ہے کسی کو کلام نہیں ہے اور دم مسفوح کا مضر ہونا بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ سور کے گوشت کے مضر ہونے پر (علی الخصوص گرم ملکوں میں) بہت سے مباحثے ہوئے ہیں اور انجام کار اُسکا مضر ہونا تسلیم ہوا ہے۔ پس اِن تینوں چیزوں کے حرام ہونیکی وجہ اُنکے مضر ہونے پر مبنی ہے۔ علاوہ اسکے اِس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غذا کی تاثیر انسان کے اخلاق پر ضرور ہوتی ہے سور میں بعض خصائل ذمیمہ ایسے پائے جاتے ہیں جو عام اخلاق انسانی کے برخلاف ہیں اور اِسلئے اسکا کھانا بلحاظ حفظ اخلاق انسانی ممنوع کرنا بلا شبہہ انسان کو اخلاق ذمیمہ سے محفوظ رکھنا ہے البتہ چوتھی چیز یعنی "وما اھل بہ لغیر اللہ" کی حرمت قابل بحث ہے۔ پس اسکی حرمت نفس مذبوح کے مضر ہونے یا نجس ہو جانیکے سبب سے نہیں ہے بلکہ اسکی حرمت واسطے مٹانے رسم شرک کی ہے جیسے کہ عرب کا دستور تھا جیسے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کا دستور رہے کہ جانوروں کا ثلاثوں اور دیبیوں کا نام لیکر کاٹتے تھے جسکا یہ مقصود تھا کہ اُسکی نذر اور اُسکے تقرب کے لئے جانور کو مارا ہے یہانتک کہ جو جانور اپنے کھانے کیلئے بھی مارتے تھے اُسکو بھی کسی بت یا دیوی کی نذر مقرر کرکے اور اُسی کا نام لیکر مارتے تھے

بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ

ہندوستان میں اب تک یہ رسم ہندوؤں میں ہے اور کوئی ہندو کسی بکرے کا بغیر دیبی کے نام کے جھٹکا نہیں کرتا۔ بہت گوشت خور ہندو ایسے ہیں کہ اگر کوئی جانور دیبی کے نام پر جھٹکا نہ کیا جاوے تو اُسکا گوشت نہیں کھاتے۔ اسلام میں تقرب الی غیر اللہ شرک اور کفر قرار پایا ہے پس رسم شرک کے ہر طرح پر مٹانیکے لئے یہ حکم ہوا ہے کہ جو جانور اس رسم شرک پر مارا جاوے وہ بھی نہ کھایا جاوے۔ پس حرمت مذبوح لغیر اللہ کی احکام محافظ حکم اصلی میں سے ہے جسکی تفصیل ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ علما کا یہ قول ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی جانور کو بقصد تقرب الی غیر اللہ کے ذبح کرے تو وہ مرتد ہو جاتا ہے اور ذبیحہ اُسکا مرتد کا ذبیحہ ہے اور یہہ حکم اہل کتاب کے ذبایح کے سوا اوروں کے ذبیحہ سے متعلق ہے اور اہل کتاب کے ذبایح ہمارے لئے حلال ہیں جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے کہ طعام اُن لوگوں کا جنکو کتاب دیگئی ہے تمہارے لئے حلال ہے۔ پس اس آیت سے جسکی ہم تفسیر لکھتے ہیں اس میں تو کچھ شبہ نہیں کہ جو مسلمان کسی جانور کو تقرباً غیر خدا کے نام ذبح کرے اُسکا کھانا اسوجہ سے کہ وہ ایک فعل شرک پر ذبح کیا گیا ہے حفظاً للحکم التقرب الی اللہ وحدہ ممنوع و حرام ہے مگر یہ بات باقی رہی کہ اگر غیر مسلم اسطرح پر کریں تو اُسکا کھانا بھی ممنوع و حرام ہے یا نہیں امام فخر الدین رازی نے جو قول علماء اسلام نقل کیا ہے اُسمیں ذبیحہ اہل کتاب کو مستثنیٰ کیا ہے جسکا یہہ مقصد ہے کہ گو اہل کتاب نے تقرباً الی غیر اللہ بھی ذبح کیا ہو مگر وہ حلال ہے اور یہی قول بعض فقہا کا بھی ہے اور اُنہوں نے تصریح کر دی ہے کہ "ولو ذبح باسم المسیح"۔ مگر یہاں یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ تو پھر دیگر اہل مذاہب کا لغیر اللہ ذبح کیا ہوا کیوں نہ حلال ہوا اسکا جواب بقاعدہ اہل نقل یہ ہو سکتا ہے کہ آیت طعام اہل کتاب سے اُنکا ذبیحہ مستثنیٰ ہو گیا ہے اور دیگر اہل مذاہب کا ذبیحہ مستثنیٰ نہیں ہوا۔ مگر پھر اس پر یہ سوال ہوگا کہ کیوں دیگر اہل مذاہب کا ذبیحہ مستثنیٰ نہیں ہوا۔

> قال العلماء لو ان مسلما ذبح ذبیحة وقصد بذبحها التقرب الی غیر اللہ صار مرتدا و ذبیحته ذبیحة مرتد وھذا الحکم فی غیر ذبایح اھل الکتاب اما ذبایح اھل الکتاب فتحل لنا لقوله تعالی وطعام الذین اوتوا الکتب حل لکم۔
> (تفسیر کبیر جلد ۱ صفحہ ۶۱۰)

> ومن الناس من + + + اجاز واذبیحة النصرانی اذا سمی علیها باسم المسیح وھو مذھب عطاء و مکحول والحسن والشعبی وسعید ابن المسیب۔
> (تفسیر کبیر جلد ۱ صفحہ ۶۱۶)

ہاں اگر اس استثنا کی یہ وجہ بیان کی جاوے کہ اہل کتاب میں کبھی لغیر اللہ جانور کے ذبح کرنیکی

خدا کی پکارا جاوی بھیر جو کوئی مضطر ہو نہ زیادتی کرنیوالا اور نہ حد سی گذرنیوالا پھر اُسپر گناہ نہیں،

رسم و عادت نہ تھی، یا وہ خدا کے نام پر قربانی کرتے تھے، یا خدا کا نام لیکر ذبح کرتے تھے، جیسے کہ یہود کی عادت ہے، یا کسی کا نام لئے بغیر ذبح کرتے تھے، جیسے کہ عیسائیوں کی عادت ہے، تو صرف ذبایح اہل کتاب کے مستثنیٰ کرنیکی اور دیگر اہل مذاہب کے ذبایح کے مستثنیٰ نہ کرنیکی وجہ کافی ہوگی، اور اسلیئے دیگر اہل مذاہب کا ذبیحہ یا جھٹکا حفظ الحیٰ التقرب الی اللہ وحدہ حرام اور ممنوع الاکل رہیگا۔

البتہ ایک سوال اور باقی رہتا ہے کہ اگر کسی غیر اہل کتاب نے کسی جانور کو لا لغیر اللہ ذبح کیا ہو تو وہ بھی حرام اور ممنوع الاکل ہے یا نہیں۔ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہوگا کیونکہ آیت "کلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ" کا حکم عام نہیں ہے پس نص صریح قرآن مجید سے اُسکی حرمت ثابت نہ ہوگی الا اجتہاد جسکی تسلیم خود مجتہد یا اُسکے متبعوں پر لازم ہوگی نہ ہر شخص پر۔

وا اھل بہ لغیر اللہ اسکے معنی میں بھی لوگوں نے اختلاف کیا ہے کہ خدا کے سوا اور کسیکا نام پکارے جانے سے کیا مطلب ہے۔ اصمعی کا قول ہے کہ اہلال کے معنی پکارنے کے ہیں۔ احرام باندھنے والے پر مہل کا لفظ اسلیئے بولا جاتا ہے کہ وہ احرام باندھتے وقت لبیک کہکر پکارتا ہے، اور ذبایح پر بھی مہل کا لفظ بولتے ہیں کیونکہ عرب جانوروں کو ذبح کرتے وقت بتوں کا نام لیکر پکارتے تھے، اور "استہل الصبی" کا لفظ بھی اسی سے نکلا ہے کہ پیدا ہونیکے بعد چلاتا ہے۔ اسلیئے "ما اھل بہ لغیر اللہ" کے معنی یہ ہوئے کہ جو بتوں کے لئے ذبح کئے جاویں۔ یہ مذہب تو مجاہد ضحاک اور قتادہ کا ہے۔ اور دوسرا قول ربیع بن انس اور ابن زید کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اھل بہ لغیر اللہ" سے یہ مطلب ہے کہ جو خدا کے نام کے سوا اور کسی کے نام سے پکارا جاوے یعنی وہ ذبح کے وقت پکارے جانے کی قید نہیں لگاتے، بلکہ صرف غیر خدا کے نام موسوم کر دینے ہی کو "اھل لغیر اللہ" میں داخل کرتے ہیں۔ جیسے کہ ہندوستان میں مسلمان بکریکو شیخ سدو اور گائے کو میران اور مرغے کو مدار کے نام سے موسوم کر دیتے ہیں۔ ان مفسرین کی رائے کے مطابق جو جانور کہ غیر خدا کی نام تقرباً موسوم ہو گیا ہو اور گو بوقت ذبح خدا ہی کا نام لیا جاوے تب بھی وہ حرام ہو جاوے گا۔ اور پہلی رائے کے موافق حرام نہ ہوگا، بشرطیکہ خدا کا نام لیکر ذبح کیا جاوے۔ شاہ عبد العزیز صاحب

إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٦٨﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٦٩﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٠﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿١٧١﴾ لَّيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

نے اپنی تفسیر میں پہلی رائے اختیار کی ہے۔ مگر درحقیقت وہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ صرف نام رکھدینا کہ شیخ سدو کا بکرا ہے اور میراں کی گائے یا مدار کا مرغا ہے اقدام بالشرک ہے نہ وقوع شرک، اور جبتک کہ شرک کا وقوع مذبوح کے اوپر نہو اُسوقت تک وہ مذبوح ممنوع الاکل نہیں ہو سکتا۔ پس اگر ذبح کے وقت خدا کا نام لیکر ذبح کیا گیا ہے تو اُسکا کھانا حرام نہیں ہے۔

(١٦٩) (ان الذین یکتمون) ہمارے مفسرین کی عادت ہے کہ جہاں قرآن میں اہل کتاب کی نسبت ایسا مضمون آیا کہ وہ توریت کی باتیں چھپاتے ہیں، اور اُنھوں نے تفسیر میں لکھا کہ اس سے بشارات آنحضرت صلعم کا چھپانا مراد ہے۔ چنانچہ اِس مقام پر بھی ایسا ہی کچھ لکھا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ وہ مضامین جن پر بشارات کا اطلاق ہوتا ہے وہ خود توریت اور انجیل میں بطور کنایہ اور اشارہ کے قرار پا سکتے ہیں انپر اطلاق اخفا کچھ ٹھیک نہیں ہے، اور نہ خدا کو اور نہ آنحضرت صلعم کو اِس بات کی ضرورت تھی کہ جابجا اپنی نبوت کے اثبات کے لئے توریت اور انجیل کے بشارات پر حوالہ کریں نبی کیلئے بشارت کی ضرورت نہیں،

بیشک اللہ بخشنے والا ہی مہربان (۱۶۸) ہاں جو لوگ چھپاتے ہیں اُسکو کتاب میں سے
جو اُتارا ہے اللہ نے اور لیتے ہیں اُسکے بدلے تھوڑی سی قیمت، وہی لوگ ہیں کہ نہیں
کھاتے اپنے پیٹوں میں مگر آگ، اور نہ کلام کریگا اُن سے اللہ قیامت کی دن اور نہ اُنکو
پاک کریگا، اور اُنکے لئے عذاب ہی دکھ دینے والا (۱۶۹) وہی لوگ ہیں جنہوں نے خریدا ہی
گمراہی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب کو بدلے مغفرت کے، پھر کس چیز نے اُنکو صابر کیا
ہے آگ پر (۱۷۰) یہ اسلئے ہے کہ اللہ نے کتاب اُتاری ہے برحق، اور بلاشبہہ جن
لوگوں نے اختلاف کیا ہے کتاب میں البتہ مخالفت میں (حق سے) دور ہیں (۱۷۱) کچھ
یہ نیکی نہیں ہے کہ اپنے منھوں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو

نبی خود نبوت کی دلیل ہے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ بلکہ اِس اخفا سے صرف احکام توریت کا اخفا
مقصود ہے جو یہودیوں میں کثرت سے رائج ہو گیا تھا، اور دنیوی لالچ اور ہوائے نفس سی برخلاف
احکام توریت کے فتویٰ لکھدیتے تھے، اور اصلی احکام کو چھپاتے تھے جسن کا بھی یہی قول ہے
چنانچہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ قال الحسن کتموا الاحکام وہو کقولہ تعالیٰ "وان کثیرا من الاحبار والرھبان
لیاکلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل اللہ"

(۱۷۲) (لیس البر) اختیار کرنا سمت قبلہ کا گو وہ کیسی ہی خدا پرستی پر مبنی ہو خوف اور اندیشہ سے
خالی نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلعم کو بھی تردد تھا کہ کہیں کعبہ بت پرستوں کی مانند نہ پجنے لگے اسیوجہ سے
خدا تعالیٰ نے متعدد طرح سے اُسکو رفع کیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا کہ "للہ المشرق والمغرب اینما تولوا
فثم وجہ اللہ" اور اِس آیت میں فرمایا کہ "لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب" اور
یہ بتایا کہ خدا کو قیامت کو فرشتوں کو نبیوں کی کتابوں کو نبیوں کو ماننا، خدا کی محبت سے غریب قرابت مندوں

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ
وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَ
ابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ
وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ
وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۲﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى

یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور قیدیوں کو کچھ دینا، غلاموں کو آزاد کرنا، نماز پڑھنی، زکوٰۃ دینی، اقرار پورا کرنا، سختی اور مصیبت میں اور لڑائی میں صبر کرنا دراصل نیکی ہے۔

(۱۷۳) (کتب علیکم القصاص) اس آیت میں تین حکم ہیں۔ پہلا حکم اسلام میں قصاص کا قائم کرنا ہے۔ دوسرا حکم جو معاوضہ خون کا زمانہ جاہلیت میں یعنی قبل اسلام کے تھا بعد اسلام اس کا باطل کرنا ہے تیسرا حکم اُن معاہدوں کا قائم رکھنا ہے جو باہم قبل اسلام کے خونوں کی بابت ہوئے تھے، عرب کے مختلف قبیلے جب مسلمان ہو گئے تو اُن میں ایسے بھی لوگ تھے جنہوں نے ایک دوسرے کو مار ڈالا تھا، اور اُس وقت تک مقتول کے لوگوں نے قاتل سے بدلا نہیں لیا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں بدلا لینے کا یہ دستور تھا کہ جو قومیں زبردست اور شریف تھیں وہ اپنے تئیں دوسری قوموں (سے) اس طرح بدلا لینے کا مستحق سمجھتی تھیں کہ اپنے غلام کے بدلے اُن میں کے ایک حر کو، اور اپنی عورت کے بدلے اُنکے مرد کو، اور اپنے مرد کے بدلے اُنکے دو مردوں کو ماریں، اور نیز زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ مقتول کے وارث خون کو معاف کر دیتے تھے، اور کبھی قتل کے بدلے میں کچھ روپیہ یا مال قاتل سے یا قاتل کے قبیلہ سے لیکر راضی ہوتے اور دعویٰ قتل سے دست بردار ہو جاتے۔ پچھلے دو حکم

ولیکن نیکی اُسکو ہے جو ایمان لایا اللہ اور اخیر دن اور فرشتوں اور کتابوں اور نبیوں پر،
اور دیا مال اُسکی محبت پر قرابت مندوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنیوالوں
کو اور غلاموں کے آزاد کرانے میں، اور پڑہی نماز اور دی زکوٰۃ اور اپنے عہد کے پورا کرنیوالونکو
جبکہ وہ عہد کریں اور صبر کرنیوالوں کو خوف اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت،
وہی لوگ ہیں جو سچے ہیں اور وہی لوگ پرہیزگار ہیں (۱۷۲) اے لوگو جو ایمان
لائے ہو لکھا گیا تم پر قصاص مقتولوں میں

اسی رسم جاہلیت سے علاقہ رکھتے ہیں (تفسیر کبیر جلد ا صفحہ ۶۳۱ و معالم التنزیل صفحہ ۶۷)
پہلا حکم جو اسلام میں قصاص قائم کرنیکا ہے وہ اِس آیت کے پہلے جملہ میں موجود ہے جہاں خدا نے
فرمایا ہے "یا ایہا الذین امنوا کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ" یہہ جملہ ایک مستقل جملہ ہے اور
تفسیر کبیر میں بھی بعض مفسرین کا یہہ قول لکھا ہے کہ "کتب علیکم القصاص فی القتلی جملۃ تامۃ
مستقلۃ بنفسھا"۔ اور اِس جملہ سے مطلقاً یعنی بغیر کسی قید کے قصاص کا حکم پایا جاتا ہے یعنی قاتل
بعوض مقتول کے مارا جائیگا۔ کوئی شخص قاتل ہو اور کوئی شخص مقتول ہو، مرد ہو عورت ہو، آزاد ہو کافر
ہو مسلمان ہو، یہ لازمی قصاص غالباً اُن لوگوں کو جو نئے مسلمان ہوئے تھے اور جنکے ہاں معافی
اور خون کے بدلے مال لینا بھی جائز تھا سخت گران گذرا ہوگا، اور اسلیئے اُسکے بعد خدا تعالیٰ نے قصاص
میں جو حکمت ہے وہ تبلائی اور فرمایا کہ "ولکم فی القصاص حیات یا اولی الالباب لعلکم تتقون"
اور اِس اخیر آیت سے زیادہ تر اِس رائے کو تقویت ہوتی ہے کہ قرآن مجید میں صرف خون کے بدلے
خون کا حکم ہے۔ اگرچہ مسلمانوں میں دیت اور معافی کا رواج جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں تھا
موقوف نہیں ہوا اور اُسکی بنا حدیثوں پر قائم کی ہے، مگر مجھکو اِس مقام پر اُن سے بحث نہیں ہے
صرف یہ بیان کرنا ہے کہ قرآن مجید کی اِس آیت سے کیا حکم نکلتا ہے، سو وہ حکم یہی ہے کہ

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ﴿۱۷۳﴾ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾

بلاکسی قید اور تفرقہ کے مقتول کے بدلے قاتل مارا جاوے۔

قصاص کے لفظ سے بعض علمار نے جو یہ مطلب سمجھا ہے کہ جسطرح قاتل نے مقتول کو مارا ہے اُسی طرح قاتل بھی مارا جاوے یہ بھی اِس آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف مقتول کے بدلے قاتل کا بیجان کر دینا ثابت ہوتا ہے۔ قصاص کے معنی دو آدمیوں کا ایک سا کام کرنیکے ہیں جیسے کہ عرب کہتے ہیں کہ "اقتص فلان اثر فلان" جبکہ کوئی شخص ویسا ہی کام کرے جیسا کہ دوسرے نے کیا ہو اہل شرع نے اِسکے معنی یہ قرار دیئے ہیں کہ کسی انسان کے ساتھ ایسا ہی کیا جاوے جیسا کہ اُسنے دوسرے انسان کے ساتھ کیا ہو۔ مگر ایسی تعمیم قصاص کے معنی کی اِس آیت کے لفظوں سے نہیں پائی جاتی کیونکہ اِس آیت میں قصاص کے لفظ کے ساتھ "فی القتلیٰ" کی بھی قید لگی ہوئی ہے، اور اِس قید سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُسکے مقتول ہو جانے میں مساوات چاہیئے نہ کیفیت مقتول ہونے میں کیونکہ مقتول ہو جانا یعنی جان کا بدن سے مفارقت کرنا ایک چیز ہے اور جسطرح اور جس ذریعہ سے اُسنے مفارقت کی ہے وہ دوسری چیز ہے، اور اِس آیت میں لفظ قصاص سے مقتول ہونے میں یعنی جان کے بدن سے مفارقت کرنے میں مساوات چاہی گئی ہے نہ کیفیت قتل میں۔ پس آیت کا حکم صرف اتنا ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی کو بیجان کر دیا ہو تو وہ بھی ویسا ہی یعنی بیجان کر دیا جاوے۔

اس بیان سے ظاہر ہے کہ بعض علمار کا لفظ قصاص سے یہ سمجھنا کہ اگر کسی نے پتھر سے سر پھوڑ کر کسی کو مارا ہو تو اُسکو بھی پتھر سے سر پھوڑ کر مارا جاوے، اور اگر کسی نے آگ سے جلا کر مارا ہو تو اُسکو بھی آگ سے جلا کر

آزاد بدلے آزاد کے غلام بدلے غلام کے عورت بدلے عورت کے پھر جس شخص کو معاف کیا جاوے اپنے بھائی سے کچھ پھر تابعداری کرنا ہے ساتھ نیکی کے اور اُسکو ادا کرنا ہی ساتھ احسان ماننے کے (۱۷۳) یہ آسانی ہے تمہارے پروردگار سے اور رحمت پھر جس شخص نے زیادتی کی اِسکے بعد تو اُسکے لئے عذاب ہے دکھ دینے والا (۱۷۴)

مارا جاوے اور اگر کسی نے پانی میں ڈبو کر مارا ہو تو اُسکو بھی پانی میں ڈبو کر مارا جاوے صحیح نہیں ہی معہذا اُن علماء کا یہ خیال بھی کہ ایسا کرنے میں ٹھیک ٹھیک مساوات ہوجاویگی غلط ہے کیونکہ ان افعال کو اسطرح پر عمل میں لانا کہ بالکل اُن افعال کے فعل میں اور اثر میں مساوی ہوں جو قاتل نے مقتول کے ساتھ کئے ہیں محض ناممکن ہے۔ منطوق آیت کا صرف اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مقتول کے بدلے قاتل بھی مار ڈالا جاوے۔

دوسرا حکم جسطرح زمانۂ جاہلیت میں معاوضۂ خون کا لیا جاتا تھا اُسکا باطل کرنا ہے اور وہ ان الفاظ سے باطل ہوتا ہے "الحر بالحر والعبد بالعبد والانثیٰ بالانثیٰ" اگرچہ علما نے ان لفظوں کی نسبت بہت بحث کی ہے جو ایک تطویل لاطائل ہے، مگر صاف و صحیح مطلب یہ ہے کہ اسلام میں قصاص تو لیا جائیگا۔ لیکن یہ طریقہ جو جاہلیت میں تھا کہ قاتل کو چھوڑ کر دوسرے شخص کو مارتے تھے، اور غلام کے بدلے حر کو مارتے تھے، اور عورت کے بدلے مرد کو مارتے تھے، اور ایک مرد کے بدلے دو مردوں کو مارتے تھے، یہ طریقہ اسلام میں نہیں رہا۔ بلکہ اگر کسی حر نے حر کو مارا ہے تو وہ حر ہی مارا جائیگا۔ اور اگر کسی غلام نے غلام کو مارا ہے تو غلام ہی مارا جائیگا۔ اور اگر کسی عورت نے عورت کو مارا ہے تو عورت ہی ماری جائیگی، اور حر اور عبد اور اُنثیٰ پر الف لام ہے، اُس سے قصاص میں قاتل و مقتول کی تخصیص لازم آتی ہے۔ اِس بیان سے اوپر کے جملہ کی جس میں قصاص کا حکم ہے تفصیل مقصود نہیں ہے، بلکہ جاہلیت میں جو رواج تھا کہ عورت کے بدلے مرد کو، اور غلام کے بدلے حر کو مارتے تھے اُسکا موقوف کرنا مقصود ہے۔

جن علماء نے غلطی سے ان الفاظ کو حکم قصاص کی تفصیل سمجھا ہے اُنھوں نے ایک بیفائدہ بحث کی ہی

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۵﴾
كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ

اور نتیجہ اپنی بحث کا یہ نکالا ہے کہ اگر ایک حر نے کسی عبد کو مار ڈالا ہو یا ایک عبد نے کسی حر کو مار ڈالا ہو یا ایک مرد نے کسی عورت کو یا ایک عورت نے کسی مرد کو مار ڈالا ہو تو اُن سے قصاص لینے کا حکم اس آیت میں پایا نہیں جاتا اور اسلئے اُنکے قصاص میں مختلف رائیں ہو گئی ہیں بعضوں نے کہا کہ اگر کسی عبد نے حر کو یا عورت نے مرد کو مار ڈالا ہو تو اُنسے قصاص لینا قیاس پر مبنی ہے کیونکہ ادنیٰ نے اعلیٰ کو مارا ہے اور اگر ایک حر نے عبد کو یا مرد نے عورت کو مار ڈالا ہو تو اُنسے قصاص لینا اجماع پر مبنی ہے۔ مگر کچھ شبہہ نہیں ہے کہ یہ سب رائیں غلط ہیں اور جملہ اول سے عموماً قصاص لینے کا حکم ثابت ہے۔

تیسرا حکم ایام جاہلیت کے خونوں کی بابت معاہدوں کا قائم رکھنا ہے وہ ان الفاظ سے پایا جاتا ہے کہ "فمن عفی لہ من اخیہ شئ فاتباع بالمعروف واداء الیہ باحسان ذلک تخفیف من ربکم ورحمۃ فمن اعتدی بعد ذلک فلہ عذاب الیم" یہ جملہ بھی اُسی پہلے جملہ کے تابع ہے جو جاہلیت کے خونوں سے علاقہ رکھتا ہے۔ اس جملہ کا یہ مطلب ہے کہ ایام جاہلیت کے خونوں کی بابت اگر کسی نے کچھ معاف کر دیا ہو یا اُسکے عوض میں کچھ دینے کا اقرار کیا ہو تو وہ اُسی اقرار کے موافق ادا کر دیا جاوے قتل ایک ایسی چیز نہیں ہے کہ مسلمان ہونیکے بعد بھی اُسکے مواخذہ سے کوئی شخص بری ہو سکے۔ مگر زمانہ جاہلیت میں جو بے انتہا خون ہوتے تھے اور بدلا لینے کے لئے قتل و قتال قائم تھے اسلئے ابتدائے اسلام میں اُن تمام جھگڑوں کے مٹانیکے لئے وہ معاہدے جو زمانۂ جاہلیت میں قصاص سے بری ہونیکی بابت قرار پائے تھے اُسی طرح جائز رکھے گئے۔ اس خاص آیت کے استدلال سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اسلام میں بھی قتل عمد کا معاف کر دینا یا دیت کا لینا جائز کر دیا گیا ہے۔ قتل خطا قتل عمد سے کچھ مناسبت نہیں رکھتا اور اُس میں دیت کا قرار پانا یا اور کسی معاوضہ کا ٹھیرانا انصاف کے برخلاف نہیں ہے۔

(۱۷۶) (کتب علیکم اذا حضر) "کتب" کے لفظ سے علمار اسلام فرض کے معنی لیتے ہیں جس سے یہ لازم آتا ہے کہ والدین اور اقربا کے لئے وصیت فرض تھی۔ مگر کہتے ہیں کہ یہ حکم اُسوقت تھا جبکہ آیت توریث نازل نہیں ہوئی تھی۔ اتنی بات بلاشبہہ تسلیم کے لائق ہے کہ آیت توریث کے نازل ہونیکے بعد جو شدید ضرورت وصیت

اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو تاکہ تم پرہیزگاری کرو (۱۷۵) لکھا گیا تم پر کہ جب تم میں سے کسی ایک کو موت آوے

کی تھی وہ باقی نہیں رہی کیونکہ ایک عام قاعدہ مقرر ہو گیا اور ہر شخص نے جان لیا کہ میرے بعد میرے اقربا میں اسطرح مال تقسیم ہو جاویگا۔

لیکن فقہاے اسلام نے دو اور مسئلے وصیت کے متعلق قرار دئے ہیں۔ایک یہ کہ آیت توریث میں جو لوگ وارث قرار پائے ہیں اُنکے حق میں وصیت جائز نہیں، لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلامؐ ان اللہ قد اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث۔ دوسرے یہ کہ ثلث مال سے زیادہ میں وصیت جائز نہیں۔جو کچھ کہ فقہانے اپنے اجتہاد سے یا کسی حدیث کی بنا پر مسئلہ ٹھیرایا ہے اُس میں بحث ضرور نہیں ہے کیونکہ وہ بحث حدیث کی صحت و غیر صحت پر جا پڑتی ہے بحث اس میں ہے کہ قرآن مجید سے وصیت کا کسی قید سے مقید ہونا پایا جاتا ہے یا نہیں، سو نہیں پایا جاتا۔

قرآن مجید سے وصیت کرنا ایک فعل جائز ثابت ہوتا ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ وصیت کرنیوالے کے مرنے کے بعد اسطرح پر کیا جاوے جسطرح کہ خود اُس نے اپنی زندگی میں مقرر کر دیا ہے۔جبکہ کسی شخص کو کسی سبب سے ہلاک ہونیکا اندیشہ پیدا ہو جو مطلب "اذا حضر احدکم الموت" کا ہے تو اُسکو ضرور ہے کہ وصیت کر دے کہ اسکا مال اُسکے والدین اور قرابت مندونکو کیونکر دیا جاوے۔آیت توریث سے اس حکم کا منسوخ ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ آیت وصیت کے نازل ہونیکے بعد یہ ضرور نہ تھا کہ کوئی شخص بلا وصیت مرے ہی نہیں پس جو لوگ کہ باوجود حکم وصیت کے بلا وصیت مر جاویں اُنکے مال کی تقسیم کیلئے کوئی قاعدہ مقرر ہونا چاہیئے تھا وہ قاعدہ آیت توریث میں قرار پایا پس قرآن مجید کی دونوں آیتوں کے ملانے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مرنے والے نے اگر کوئی وصیت کی ہے تو اُسکا مال اُسکی وصیت کے مطابق تقسیم کیا جاویگا۔اور اگر اُسنے کچھ وصیت نہیں کی یا جسقدر کہ وصیت کی ہے اُس سے زیادہ مال چھوڑا ہے تو اُسکے مال کی یا اُسقدر کی جو وصیت سے زیادہ ہے آیت توریث کے مطابق تقسیم ہو جاویگی پس دونوں آیتوں کا حکم بحال اور قایم ہے۔ثلث سے زیادہ میں اور وارث کے حق میں وصیت کا جائز نہ ہونا ایک ایسا امر ہے جو قرآن مجید کی کسی آیت سے نہیں پایا جاتا، اور جن حدیثوں سے اُس پر استدلال کیا ہے اگر وہ

اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۷۶﴾

تسلیم بھی کریجاویں تو بھی نہایت شبہہ ہے کہ اُنسے اِس امر پر استدلال ہو سکتا ہے یا نہیں۔

بلا شبہہ وصیت کو غیر مقید رکھنے میں بد اخلاقی یا حق تلفی کا احتمال ہو سکتا ہے اُسکا انسداد جہانتک کہ بمقتضائے فطرت انسانی ممکن تھا وہ قرآن مجید میں کیا گیا ہے جہان فرمایا ہے کہ "بالمعروف" یعنی نیکی اور نیک دلی سے وصیت کرے نہ یہ کہ بدنیتی سے کسی کا حق تلف کرنے اور ذی حق کے محروم کرنیکے لیئے پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر کوئی دیکھے کہ وصیت کرنیوالا کسی کے حق میں ظلم اور زیادتی کرتا ہی تو اُسکو سمجھا دے اور اُسکی وصیت کو یا ارادہ کو بدلوا دے تاکہ حق تلفی نہ ہو اور اُس بد اخلاقی یا حق تلفی کے روکنے کا طریقہ بجز اِسکے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

منقول ہے کہ ایک دفعہ رسول خدا صلعم سعد بن مالک کی بیماری میں خبر پرسی کو تشریف لیگئے۔ سعد بن مالک نے عرض کیا کہ میں اپنے کل مال کی وصیت کر دوں (یعنی سوائے اپنے قرابت مندوں کے اوروں کے لئے جیسا کہ حدیث کے مضمون سے پایا جاتا ہی) آپنے فرمایا کہ نہیں اُنھوں نے کہا کہ نصف مال کی وصیت کر دوں آپنے فرمایا کہ نہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ ایک ثلث مال کی وصیت کر دوں۔ آپنے فرمایا کہ تہائی کی اور تہائی بھی بہت ہی۔ اگر تو اپنے وارثوں کو دولتمند چھوڑے تو اِس سے بہتر ہے کہ اُنکو مفلس چھوڑے اور وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر خیرات لیتے پھریں۔ ایک اَور روایت میں ہے کہ حضرت عایشہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ میں اپنے مال کی وصیت کر دینا چاہتا ہوں (یعنی سوائے اولاد کے) حضرت عایشہ نے پوچھا کہ تیرے پاس کتنا مال ہے اور کتنی اولاد ہے۔ اُسنے کہا کہ تین ہزار درم ہیں اور چار اولادیں ہیں حضرت عایشہ نے فرمایا ہے کہ یہ تو بہت مال نہیں ہے بہتر ہے کہ اپنی اولاد کے لئے رہنے دے۔ اَور روایتوں میں ہے کہ حضرت علی فرماتے تھے کہ میں پانچویں حصہ مال کی وصیت کرنیوالے کو چوتھائی مال کی وصیت کرنیوالے سے اور چوتھائی مال کی وصیت کرنیوالے کو تہائی مال کی وصیت کرنیوالے سے زیادہ پسند کرتا ہوں، اور جسنے کہ تہائی مال کی وصیت کر دی اُس نے تو کچھ چھوڑا ہی نہیں حسن بصری نے چھٹے حصے یا پانچویں یا چوتھے تک کی وصیت کو پسند کیا، اور اُس

اگر وہ مال چھوڑے تو وصیت کرے ماں باپ کے لئے اور قرابت مندوں کیلئے نیکی سے یہ کام مقرر کیا گیا ہے پرہیزگاروں پر (۱۷۶)

زمانہ کے لوگ اکثر پانچواں حصہ یا چوتھا حصہ وصیت کرتے تھے - یہ سب روایتیں اگر صحیح تسلیم ہوں تو بھی انسے عدم جواز ی وصیت کی ثلث سے زاید کا نسبت ثابت نہیں ہوتی - بلکہ ان روایتوں سے صرف صلاح اور فہمائیش پائی جاتی ہے جسکی نسبت خود خدا نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ اگر کوئی دیکھے کہ وصیت کرنیوالا کسی کے حق میں ظلم اور زیادتی کرتا ہے تو اسکو سمجھاوے - وصیت کو کسی قید سے مقید کرنے سے بداخلاقی و ظلم کی بندش نہیں ہوسکتی جبکہ ہبہ کرنے میں کچھ قید اور بندش نہیں ہے - وصیت و ہبہ درحقیقت ایک شے ہے - صرف اتنا فرق ہے کہ ہبہ عطا بالفعل ہے اور وصیت عطا بعد الموت - حدیث "فلا وصیۃ لوارث" کو تسلیم کرنے کے بعد بھی وارث کے حق میں وصیت کا بطلان تسلیم نہیں ہوسکتا کیونکہ نفی ضرورت کی طرف منسوب ہوگی نہ نفس وصیت کے بطلان کیطرف علاوہ اسکے حدیث سے نسخ حکم قرآن کسی طرح تسلیم نہیں ہوسکتا -

آیت وصیت کو آیت توریث سے یا حدیث سے منسوخ قرار دینا ایک ایسا امر ہے جسکو علمای متقدمین میں سے بھی اکابر علما نے تسلیم نہیں کیا تفسیر کبیر (جلد ا صفحہ ۱۴۷) میں لکھا ہے کہ ابو مسلم اصفہانی کا یہ مذہب تھا کہ آیت وصیت آیت توریث سے منسوخ نہیں ہوئی ہے - جو لوگ کہ اُسکے منسوخ ہونیکے قایل ہیں انکی بڑی دلیل یہ بیان کی گئی ہے کہ اس حدیث کی رو سے "الا لا وصیۃ لوارث" آیت وصیت منسوخ و مسترد ہوگئی ہے اور پھر لکھا ہے کہ اس میں بڑی دقتیں ہیں کیونکہ یہ حدیث خبر احاد ہے اور خبر احاد سے نسخ قرآن جائز نہیں - اسکا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اگرچہ خبر احاد ہے لیکن امیہ نے اسکو تلقی بالقبول کیا ہے اور اس لئے یہ حدیث حدیث متواتر سے مل گئی ہے - مگر اس جواب پر کوئی یہ اعتراض کرسکتا ہے کہ یہ دعوی کہ امیہ نے اسکو تلقی بالقبول کیا ہے بطور ظن کے ہے یا بطور یقین کے - پہلی بات مسلم ہے لیکن اُنکا یہ اجماع خبر احاد کی بنا پر ہوگا اور جو اجماع کہ خبر احاد کی بنا پر ہو اُس سے نسخ قرآن جائز نہیں اور دوسری بات ممکن نہیں کیونکہ اگر انھوں نے اس حدیث کو قطعی سمجھ کر اجماع کیا ہے باوجودیکہ وہ خبر احاد ہے تو اُنکا اجماع خطا پر مبنی ہوگا جو ناجائز ہے - اور اگر یہ کہا جاوے کہ یہ آیت

فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

اجماع سے منسوخ ہوگئی ہے تو بھی اجماع سے قرآن کا منسوخ ہونا جائز نہیں ہے، کیونکہ اجماع اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی دلیل آیت کے منسوخ ہونیکی موجود ہے مگر اُنھوں نے اُس دلیل کو تو بیان نہیں کیا اور اجماع ہی پر اکتفا کیا تو وہ کیونکر ناسخ قرآن ہو سکتا ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب ایسے لوگ بھی اُمت میں موجود ہیں جو اس نسخ کے منکر ہیں تو اجماع کا نسخ پر کیونکر دعویٰ ہو سکتا ہے۔ غرضکہ قرآن کی رو سے پایا جاتا ہے کہ وصیت کا شخص کو بلا کسی قید کے اختیار ہے اگر اُس نے ظلم اور حق تلفی کی ارادہ سے وصیت کی ہوگی تو اُسکا وبال اُسکی گردن پر ہوگا۔ مگر وصیت کے نافذ ہونے میں کچھ کلام نہیں ہو سکتا۔ ہاں جن لوگوں نے وصیت نہیں کی یا وصیت سے زیادہ مال چھوڑا تو اُنکا مال مطابق حکم آیت توریث کے وارثوں پر منقسم ہوگا۔

﴿۱۷۹﴾ (یا ایہا الذین اٰمنوا کتب علیکم الصیام)۔ اس آیت میں جو یہ حکم ہے کہ "تم پر روزہ لکھا گیا جسطرح کہ تم سے پہلوں پر لکھا گیا تھا"، اِس کا مطلب قرار دینے کو چار باتوں کی تنقیح چاہیئے اول یہ کہ اِن روزوں سے کون سے روزے مراد ہیں۔ دوسرے یہ کہ "تمسے پہلوں" سے کون لوگ مراد ہیں۔ تیسرے یہ کہ اُن پہلوں پر کون سے روزے لکھے گئے تھے۔ چوتھے یہ کہ "جسطرح" کے لفظ سے کس بات میں تشبیہ مراد ہے۔

پہلی بات کی نسبت مفسرین میں اختلاف ہے۔ معاذ و قتادہ و عطا اور بموجب ایک روایت کے ابن عباس کے نزدیک یہ روزے ایام بیض کے اور روزہ عاشورہ کا تھا، یعنی وہ تین روزے تھے جو ہر مہینے کی

پھر جس شخص نے بدل دیا وصیت کو اسکے سننے کے بعد. تو اُسکا گناہ اُن ہی پر ہے جنہوں نے کہ اُسکو بدلا ہے بیشک اللہ سننے والا ہے جاننے والا (۱۷۷) پھر جس شخص کو ڈر ہو وصیت کرنیوالے سے کجروی کا یا گناہ کا پھر اُسنے اصلاح کر دی اُنمیں تو اُسپر کچھ گناہ نہیں بیشک اللہ بخشنے والا ہے مہربان (۱۷۸) ای لوگو جو ایمان لائے ہو لکھا گیا تمپر روزہ جسطرح کہ لکھا گیا اُن لوگوں پر جو تمسے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگاری کرو (۱۷۹)

تیرہویں چودہویں پندرہویں کو رکھے جاتے تھے اور ایک روزہ وہ تھا جو دسویں محرم کو رکھا جاتا تھا۔ اور اکثر محققین کے نزدیک جن میں ابن عباس اور حسن اور ابی مسلم بھی شامل ہیں اِن روزوں سے رمضان ہی کے روزے مراد ہیں اور اِس صورت میں لفظ "شہر رمضان" جو اگلی آیت میں ہے وہ بدل واقع ہوگا لفظ "صیام" سے جو اس آیت میں ہے یعنی "کتب علیکم الصیام صیام شہر رمضان"

جو لوگ کہتے ہیں کہ اِن روزوں سے رمضان کے روزے مراد نہیں ہیں وہ یہ دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ اول یہ کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ رمضان کے روزوں سے اور باقی روزون کے رکھنے کا حکم منسوخ ہوگیا ہے۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رمضان کے سوا اور بھی روزے تھے اور اس مقام پر "صیام" سے وہی روزے مراد ہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اِن روزون کے ذکر کے بعد بھی مریض اور مسافر کی نسبت حکم بتایا ہے اور اگلی آیت میں جہاں خاص رمضان کے روزوں کا نام لیا ہے اُسکے بعد بھی مریض اور مسافر کی نسبت حکم بتایا ہے پس اگر یہ دونوں روزے ایک ہی ہوتے تو دوبارہ حکم بتانیکی کیا حاجت تھی۔ تیسرے یہ کہ اِن روزوں کی نسبت اُن لوگوں کو بھی جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں خدا نے اختیار دیا تھا کہ چاہیں روزہ رکھیں اور چاہیں فدیہ دیں، مگر رمضان کے روزوں کی نسبت یہ اختیار نہیں دیا۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ روزے رمضان کے سوا تھے۔

اس رائے کی تائید اُن روایتوں سے بھی ہوتی ہے جو معالم التنزیل میں لکھی ہیں کہ رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے ہر مہینے میں تین روزے اور عاشورہ کا روزہ رکھا جاتا تھا اور سترہ مہینے تک قبل فرض ہونے

أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ

روزہ رمضان کے اسیطرح رکھے گئے۔ اور حضرت عائشہ سے ایک روایت لکھی ہے کہ آنحضرت نے مدینہ میں پہونچنے کے بعد عاشورہ کا روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی رکھنے کا حکم دیا اور زمانہ جاہلیت میں قریش اور آنحضرت بھی عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے۔ جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورہ کا روزہ چھوڑ دیا گیا۔ اور ابن عباس سے ایک روایت لکھی ہے کہ ہجرت کے بعد جو حکم اول منسوخ ہوئے وہ بیت المقدس کیطرف قبلہ ہونے اور روزہ رکھنے کے تھے۔ مگر یہ روایتیں ایسی ہیں جنکی صحت نہایت مشتبہ ہے۔

جو لوگ اس رائے کے برخلاف ہیں اور لفظ "صیام" سے جو اس مقام پر ہے رمضان ہی کے روزے مراد لیتے ہیں وہ ان دلیلوں کا اسطرح پر جواب دیتے ہیں کہ اول خدا نے فرمایا کہ "تم پر روزے لکھے گئے" یہ ایک مجمل حکم تھا جس سے نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ایک روزہ یا دو روزے یا کئی روزے۔ پھر اُسکے بعد فرمایا کہ "گنے ہوئے دنوں کے"۔ اِس قول سے کچھ اجمال رفع ہوا۔ پھر فرمایا کہ "ماہ رمضان کے" جس سے ہر ایک بات متعین ہو گئی پس اس ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ "صیام" اور "ایام معدودات" اور "شہر رمضان" تینوں کی ایک ہی مراد ہے، تو لفظ "الصیام" سے سوا رمضان کے اور روزوں کے مراد لینے کی کچھ ضرورت نہیں ہے، اور یہ جو دلیل ہے کہ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ "ان صوم رمضان نسخ کل صوم" اس سے یہ متحقق نہیں ہوتا کہ جو روزے منسوخ ہوئے وہ اسلام میں فرض تھے، بلکہ ممکن ہے کہ وہ وہ روزے ہوں جو اور شریعتوں میں فرض تھے اور اگر فرض کیا جاوے کہ وہ وہی روزے تھے جو اسلام میں فرض تھے تو یہ کیونکر متحقق ہوگا کہ وہ وہی روزے تھے جو اس آیت کی رو سے فرض کئے گئے ہیں۔ اور یہ جو دلیل ہے کہ اگر یہ دونوں روزے ایک ہوتے تو بیمار اور مسافر کا حکم مکرر نہ بیان کیا جاتا تو اسکا جواب یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں رمضان کے روزوں کے رکھنے یا فدیہ دینے کا اختیار تھا۔ مگر یہ حکم منسوخ ہو گیا اور مسافر اور مریض کے لئے جو حکم تھا وہ بدستور باقی رہا۔ اِس شبہہ کے رفع ہونے کے لئے کہ آیا بیمار و مسافر کے حق میں بھی وہ حکم منسوخ ہو گیا ہے یا نہیں اُس حکم کو مکرر بیان کیا گیا۔ اور جبکہ فدیہ دینے کا حکم منسوخ ہو گیا تو یہ بحث کہ اُن روزوں میں فدیہ دینے کا اختیار تھا

گنے ہوئے دنوں میں پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر تو شمار کرلے اَور دنوں میں، اور (لکھا گیا) اُن لوگوں پر جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں بدلا دینا ہے ایک محتاج کی خوراک کا

اور رمضان کے روزوں میں فدیہ دینے کا اختیار نہیں ہے اسلئے وہ روزے رمضان کے علاوہ تھے پیش نہیں ہوسکتی -
اِن دونوں رایوں میں سے کوئی سی رائے تسلیم کیجائے اُسکا نتیجہ کسی نہ کسی آیت کا منسوخ ماننا ہوگا
کیونکہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ لفظ "رمضان" سے رمضان کے سوا اَور روزے مراد تھے تو اُن کو تسلیم
کرنا پڑیگا کہ جس آیت میں خاص رمضان کے روزوں کا ذکر ہے اُس سے پہلی آیت منسوخ ہوگئی
اور جو لوگ کہتے ہیں کہ لفظ "صیام" سے رمضان ہی کے روزے مراد ہیں تو وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جس آیت
میں روزے رکھنے یا فدیہ دینے کا حکم تھا وہ رمضان کے روزوں کی آیت سے جس میں یہ اختیار نہیں
رہا منسوخ ہوگئی ہے -

اسطرح پر ناسخ و منسوخ ماننے میں یہ مشکل پیش آتی ہے کہ ایسی آیتوں کو جو بالکل متصل اور
سلسلہ وار ہیں کسطرح ایک کو دوسرے کا ناسخ تسلیم کریں - اِسکا جواب یہ دیا گیا ہے کہ تلاوت میں
آیتوں کا متصل ہونا اِس بات کا مستلزم نہیں ہے کہ وہ اسی طرح متصل نازل بھی ہوئی ہوں بلکہ
ایسا بھی ہے کہ منسوخ آیت نزول میں اول ہے اور ناسخ بعد مگر تلاوت میں ناسخ مقدم ہوگئی ہے اور
منسوخ بعد، وانا اقول فیہ لنظرٌ -

دوسری بات کی نسبت مفسرین نے ایک مبہم بات لکھدی ہے تفسیر معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ
"من قبلکم" سے مراد "من الانبیاء والامم" ہے - اور تفسیر بیضاوی میں لکھا ہے کہ "من قبلکم"
یعنی "الانبیاء والامم من لدن آدم" - مگر یہ بیان محض ناکافی ہے کیونکہ صاف بتانا چاہیئے کہ "من
قبلکم" سے کونسے نبی یا کونسی امت مراد ہے - اسواسطے کہ اِس بات کا کچھ ثبوت نہیں ہے کہ حضرت
آدم سے آنحضرت صلعم تک کوئی نبی اور کوئی امت ایسی نہیں گذری جسپر روزہ فرض نہ ہوا ہو اسلئے
اُس اُمت کا تعین کرنا ضرور ہے - مشرک تو ہیں جو روزے رکھتی تھیں اُنکی نسبت تو کہا ہی نہیں جاسکتا
کہ خدا نے اُن پر روزے فرض کئے تھے کیونکہ اُنکے اکثر روزے غیر خدا کے لیے ہوتے
تھے - قرآن مجید میں اکثر جگہہ "من قبلکم" کا اشارہ اہل کتاب کی طرف ہوا ہے، یعنی یہود اور

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

نصاریٰ کی طرف، اور اسلئے، "من قبلکم" سے اہل کتاب مراد لئے جاتے ہیں اور اُنکی نسبت خدا کی طرف سے کسی حکم کا مقرر ہونا صادق بھی آسکتا ہے۔

تیسری بات کی نسبت مفسرین نے یہود اور نصاریٰ کے روزوں کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہود اور نصاریٰ پر بھی خدا تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کئے تھے۔ نصاریٰ نے اُس مہینے کو بدل کر معین موسم میں روزوں کا رکھنا مقرر کیا، اور اس تبدیل کے معاوضہ میں دس روزے بڑھا دئے۔ اُسکے بعد اُنکا کوئی بادشاہ بیمار ہوا اور اُسکے اچھے ہونے کے لئے سات روزوں کی نذر مانی جب وہ اچھا ہوا تو سات روزے اور بڑھا دئے، اسینتالیس ہو گئے۔ پھر اُن میں ایک بادشاہ ہوا اُس نے کہا کہ تین روزوں کے چھوڑنے سے کیا فائدہ ہے اسلئے اُنہوں نے پورے پچاس کر لئے بعضوں نے لکھا ہے کہ نصاریٰ احتیاطاً رمضان کے اول اور رمضان کے بعد بھی ایک ایک روزہ رکھتے تھے تاکہ رمضان کے مہینے میں کچھ نقصان نہ پڑے۔ اُنکے بعد کے لوگ اسی طرح ایک ایک بڑھاتے گئے، یہانتک کہ پچاس تک نوبت پہونچ گئی۔ اور بعضوں کا یہ قول ہے کہ وہ بادشاہ نصاریٰ کا مر گیا تو اسلئے اُنہوں نے رمضان سے پہلے دس روزے اور رمضان کے بعد دس روزے اور بڑھا لئے۔ ایک اور روایت بیان کی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ نے رمضان کے روزے یہود اور نصاریٰ پر فرض کئے تھے۔ یہودیوں نے اُسکو چھوڑ دیا، اور بجائے اُسکے برس بھر میں صرف ایک روزہ اُس دن رکھنا اختیار کیا جس دن میں فرعون کا غرق ہونا وہ خیال کرتے تھے، اور اُس دن کے اختیار کرنے میں بھی اُنہوں نے غلطی کی کیونکہ فرعون دسویں محرم کو غرق ہوا تھا۔ یہ تمام اقوال مفسرین کے ایسے لغو اور بیہودہ ہیں جیسے کہ اُنکی اور باتیں متعلق قصص اور حکایات کے لغو اور بے بنیاد ہوتی ہیں جنکی نہ کوئی سند ہوتی ہے اور نہ کوئی ثبوت ہوتا ہے۔ یہود اور نصاریٰ کے روزوں کے حالات جو اُنکی کتابوں سے معلوم ہوتے ہیں وہ حسب تفصیل ذیل ہیں

کتاب خروج کے (جو توریت کی دوسری کتاب ہے) باب ۳۴- ورس ۲۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ کوہ سینا پر تھے تو چالیس دن اور چالیس رات وہاں رہے، اور نہ روٹی کھائی نہ پانی پیا

پھر جس شخص نے نیکی سے زیادہ دیا تو وہ اُسکے لئے اچھا ہے اور روزہ رکھنا تمہاری لئے بہتر ہے اگر تم جانو ﴿۱۸۰﴾

توریت کی کتاب استثنا باب ۹ ورس ۹ و ۱۸ و ۲۵ کی تفسیر ہنری اسکاٹ ہیں نہ روٹی کھانے اور نہ پانی پینے کی نسبت لکھا ہے کہ لوگوں کی معصیت کی وجہ سے موسیٰ نے دوسری دفعہ چالیس دن کا روزہ رکھا تھا۔ اور بعضوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت موسیٰ نے تین مرتبہ چالیس چالیس دن کا روزہ رکھا ہے۔

کتاب لویان کے (جو توریت کی تیسری کتاب ہے) باب ۱۶ ورس ۲۹ اور باب ۲۳۔ ورس ۔ ۲۷ و ۲۹ سے پایا جاتا ہے کہ یہودیوں پر ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو کفارہ کے روزے رکھنے کا حکم تھا اور اسمیں لکھا ہے کہ جو کوئی اُس دن روزہ نہ رکھے گا اپنی قوم سے منقطع ہو جائیگا۔ اور اعمال حواریاں باب ۲۷ ورس ۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی بھی یہ روزہ رکھا کرتے تھے۔

انجیل لوقا باب ۱۸ ورس ۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ فروسی ہفتہ میں دو دن روزہ رکھا کرتے تھے۔ ایک پانچویں دن جبکہ حضرت موسیٰ کوہ سینا پر چڑہے تھے اور ایک دوسرے دن جبکہ اُترے تھے۔

کتاب زکریا باب ۸ ورس ۱۹ سے پایا جاتا ہے کہ یہودی چوتھے مہینے اور پانچویں مہینے اور دسویں مہینے میں بھی روزہ رکھتے تھے۔ چوتھے مہینے یعنی تموز میں سترہویں تاریخ کو بیت المقدس کی تباہی کے غم میں جو بخت نصر کے ہاتھ سے ہوئی تھی۔ پانچویں مہینے یعنی آب میں نویں تاریخ کو بیت المقدس کے شہر کے جلنے کے غم میں جسکو نبوزردان شاہ بابل کے افسر نے جلایا تھا۔ ساتویں مہینے یعنی تشری کی دسویں تاریخ کو جدلیاہ کے قتل ہونے کے غم میں جو بمقام مصپاہ مارا گیا تھا۔ دسویں مہینے یعنی تبث کی دسویں تاریخ کو بیت المقدس کو غم میں جس روز کہ بخت نصر نے بیت المقدس کا محاصرہ شروع کیا تھا۔

کتاب اول ملوک باب ۲۱ ورس ۹ و کتاب دویم تواریخ ایام باب ۲۰ ورس ۳ میں ایک دن کا روزہ ہے جسکو ملکہ ایزبل نے اپنے شوہر احاب کی خاطر سے منادی کرا کے مقرر کرایا تھا۔

کتاب قضاۃ باب ۲۰ ورس ۲۶ سے ایک اور روزہ کا مقرر ہونا پایا جاتا ہے جبکہ بنی اسرائیل نے قوم بنیامین سے شکست پائی تھی اور بیت المقدس میں آن کر فتح کے لئے دعا مانگی تھی کتاب اول شموئیل باب ۳۱ ورس ۱۳ سے پایا جاتا ہے کہ شاؤل یعنی طالوت کے مرنے کے

شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡهُدٰی وَ الۡفُرۡقَانِ ۚ فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡکُمُ الشَّهۡرَ فَلۡیَصُمۡهُ

غم میں سات روزے مقرر ہوئے تھے، جو اسکی ہڈیوں کے دفن کرنیکے بعد رکھے گئے تھے۔

کتاب یوناہ باب ۳ ورس ۵ میں ایک اور روزہ کا مقرر ہونا پایا جاتا ہے۔ جبکہ نینویہ کے لوگ ایمان لائے تھے۔

کتاب دانیال باب ۱۰ ورس ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت دانیال نے تین ہفتہ تک روزے رکھے تھے۔

کتاب اول ملوک باب ۱۹ ورس ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت الیاس کوہ حوریب کو گئے تھے تو انھوں نے چالیس دن اور رات روزے رکھے تھے۔

علاوہ انکے اور روزے بھی مثلاً خدا تعالیٰ کی خفگی دور کرنے کے لئے یا اسکی خوشنودی حاصل کرنیکے لئے، یا کسی بلا یا مصیبت کو ٹالنے کے لئے یا کسی ذاتی یا خاندانی امور کے متعلق جسطرح کہ منت وغیرہ کے ایفا میں ہوتا ہے یہودی روزے رکھا کرتے تھے۔

انجیل متی باب ۴ ورس ۱-۱۱ و انجیل لوقا باب ۴ ورس ۱-۱۳ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے بھی جبکہ وہ بیابان میں تھے چالیس دن اور رات روزے رکھے تھے۔

ملاوہ اسکے انجیل متی کے باب ۲۷ ورس ۲۱ سے جسمیں یہ لکھا ہے کہ "پھر یہ اس قسم کا شیطان بجز نماز اور روزہ کے نہیں جاتا ہے"، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں روزہ بعض امور خاص میں اثر بد کے دفع کرنیکا ایک ذریعہ خیال کیا جاتا تھا۔

انجیل متی باب ۹ ورس ۱۴ کے مضمون سے عیسائی خیال کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ نے روزہ دن کا رکھنا موقوف کر دیا، مگر اسی کے ساتھ اُس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ بعد حضرت عیسیٰ کے رکھنے ہونگے۔

ان تمام حالات پر جو اوپر بیان ہوئے غور کرنے سے اتنی بات تو ضرور ثابت ہوتی ہے کہ یہودیوں پر ایک روزہ جو ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو رکھا جاتا تھا اور جو کفارہ کا روزہ کہلاتا تھا بلاشبہہ فرض تھا

ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے ہدایت واسطے لوگون کی اور علانیہ نشانیان ہدایت کی، اور حق و باطل کو جدا کرنیوالا، پھر تم میں سے جو کوئی اُس مہینے میں موجود ہو تو چاہیے کہ اُس میں روزہ رکھے۔

اور جو کہ عیسائی بھی یہودی شریعت کے تابع ہیں اسلئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ روزے اُن پر بھی فرض تھے چالیس دن کے روزے جو حضرت موسیٰ نے کوہ سینا پر اور حضرت عیسیٰ نے بیابان میں رکھے ممکن ہے کہ فرض ہوں، مگر توریت یا انجیل میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس سے فرضیت ان روزون کی ثابت کیجا سکے۔ علاوہ اسکے جسقدر روزوں کا بیان ہے وہ سب روزے کیا یہودی مذہب میں اور کیا عیسائی مذہب میں فرض روزے نہیں معلوم ہوتے بلکہ بطور نفل روح کے تزکیہ و عبادت کے ثواب حاصل کرنے کے لئے معلوم ہوتے ہیں۔

چوتھی بات کی نسبت بھی مفسروں میں اختلاف ہے۔ جن لوگوں کی یہ رائے ہے کہ لفظ "کما" کی تشبیہ سے روزون کے عدد میں مشابہت مراد تھی اُنکی رائے کی غلطی تو صریح ظاہر ہے، کیونکہ یہود اور نصاریٰ پر نہ ایام بیض کے روزوں کا فرض ہونا پایا جاتا ہے نہ رمضان کے تیس یا اُنتیس روزون کا اور جن لوگوں کی یہ رائے ہے کہ اس تشبیہ سے روزے کی مدت میں مشابہت مراد ہے یعنی جس وقت سے جس وقت تک یہودی روزہ رکھتے تھے اُسی وقت سے اُسی وقت تک مسلمانون پر بھی روزہ فرض ہوا ہے یہ رائے بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی اسمیں کچھ شک نہیں کہ یہودی دن کے ختم ہونیکے بعد روزہ کھولکر کچھ کھا پی لیتے تھے اور پھر اُسی وقت سے اُنکا روزہ شروع ہو جاتا تھا، اور اسی وجہ سے توریت اور انجیل میں دن رات کا روزہ رکھنا بیان ہوتا ہے کیونکہ رات بھی روزے میں داخل تھی مسلمان بھی اُن باتون میں جنکی نسبت کوئی خاص حکم نہیں ہوتا تھا اکثر یہودیون کی پیروی کرتے تھے اور اس لئے وہ بھی یہودیون کیطرح روزہ رکھتے تھے لیکن کوئی خاص حکم اس طرح پر روزہ رکھنے کا مسلمانون کے لئے نہ تھا۔

"کما" کے لفظ کے ساتھ جو اس آیت میں ہے کوئی ایسا اشارہ نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ یہ مشابہت روزہ کی مدت میں تھی اس آیت میں صرف اسقدر بیان ہوا ہے کہ جسطرح تم سے اگلون پر روزے مقرر کئے گئے تھے

وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ

اسی طرح تم پر بھی مقرر کئے گئے ہیں" اور اس تشبیہ سے مدت میں مشابہت قرار دینے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اکثر مفسرین کی یہ رائے ہے کہ صرف نفس فرضیت میں تشبیہ مراد ہے۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں زجاج کا قول لکھا ہے کہ "موضع کما نصب علی المصدر لان المعنی فرض علیکم فرضا کالذی فرض علی الذین من قبلکم" اور ابو علی کا قول لکھا ہے کہ "هو صفة لمصدر محذوف تقدیره کتابة کما کتب علیهم فحذف المصدر واقیم نعته مقامه" مگر یہ بات اب تک ثابت نہیں ہوئی کہ رمضان کے روزے خدا کی طرف سے یہودیوں اور عیسائیوں پر روزے فرض تھے تو "کما" کے لفظ سے نفس فرضیت میں ہی تشبیہ کو ترجیح ہو۔

ان چاروں آیتوں کی نسبت جو میری سمجھ ہے وہ یہ ہے کہ (۱) ان روزوں سے جو کتب علیکم الصیام کی آیت میں ہیں ماہ رمضان کے سوا روزے مراد ہیں (۲) "من قبلکم" سے اہل کتاب مراد ہیں (۳) اس آیت میں اس بات سے کہ اہل کتاب پر کون روزے فرض تھے یا نہ تھے کچھ علاقہ نہیں ہے۔ (۴) "کما" کے لفظ سے نہ تعداد میں تشبیہ مراد ہے نہ مدت میں اور نہ نفس فرضیت میں بلکہ صرف سبب صیام میں تشبیہ مراد ہے۔ زمانہ نزول توریت میں حضرت موسیٰ نے چالیس دن پہاڑ پر اور حضرت عیسیٰ نے چالیس دن بیابان میں بسر کئے توریت اور انجیل دونوں سے پایا جاتا ہے کہ ان دنوں میں وہ روزہ دار تھے۔ لیکن انکی امت نے انکی متابعت کے خیال سے ان دنوں میں سال بسال روزے رکھنے اختیار کئے تھے۔ آنحضرت صلعم نے ماہ رمضان کو جو نزول وحی کا مہینہ تھا کوہ حرا میں بسر کیا اور آپ بھی اس زمانہ میں روزہ دار تھے۔ پس خدا نے فرمایا کہ جسطرح یہودیوں اور عیسائیوں نے بمتابعت اپنے نبی کے اس زمانہ میں روزے اختیار کئے تھے اسیطرح تم بھی اختیار کرو۔ پس جو سبب کہ اہل کتاب کے روزے اختیار کرنیکا تھا وہی سبب مسلمانوں پر روزوں کے مقرر ہونیکا ہے اور "کما" کے لفظ سے اسی سبب صیام میں تشبیہ دی گئی ہے۔

مگر میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ ان آیتوں میں سے کوئی آیت منسوخ ہے۔ یہ کہنا کہ پہلی آیت میں جن روزوں کا ذکر ہے وہ روزے رمضان کے سوا تھے اور یہ تسلیم کرنا کہ اسکے بعد کی آیت نے جسمیں رمضان کے روزوں کا ذکر ہے پہلی آیت کے حکم کو منسوخ کر دیا ہے ایسا ہی مشکل ہے جیسے کہ [illegible] کو تسلیم کرنا کہ پہلی

اور جو کوئی کہ بیمار ہو یا سفر پر ہو تو شمار کر لے اور دنوں میں، اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے
اور تم پر دشواری نہیں چاہتا، اور تاکہ تم پورا کر لو تعداد کو

آیت میں جن روزوں کا ذکر ہے وہ رمضان ہی کے روزے ہیں گو پچھلی آیت سے جو اختیار کہ روزہ رکھنے یا فدیہ دینے میں تھا منسوخ ہو گیا ہے تسلیم کرنا مشکل ہے۔ پچھلی آیت میں جسکو ناسخ قرار دیا جاتا ہے کوئی اشارہ کسی قسم کا پہلی آیت کے حکم کے منسوخ ہونیکا نہیں ہے، صرف قیاساً یہ بات قرار دیجاتی ہے کہ پہلی آیت کے روزے رمضان کے روزوں سے علحدہ تھے نہ جنکی نسبت قرآن میں بیان ہے کہ وہ کونسے تھے اور کونسے نہ تھے اور اس قیاس کے قرار دینے کے بعد کہا جاتا ہے کہ رمضان کے روزوں کی آیت نے اس حکم کو منسوخ کر دیا جس میں کچھ بھی اشارہ منسوخ کرنیکا نہیں ہے۔ حدیث پر جو استدلال کیا گیا ہے اول تو اسکی صحت میں کلام ہے پھر اس بات میں کلام ہے کہ حدیث اور خصوصاً خبر احاد سے قرآن کا حکم منسوخ ہو سکتا ہے یا نہیں یا قیاساً یہ بات قرار دیجاتی ہے کہ پہلی آیت میں جن روزوں کا ذکر ہے وہ وہی رمضان کے روزے ہیں جنکا پچھلی آیت میں ذکر ہے۔ اور پھر بغیر کسی اشارہ کے کہا جاتا ہے کہ جو اختیار کہ روزہ رکھنے یا فدیہ دینے میں تھا وہ پچھلی آیت سے منسوخ ہو گیا۔ اگر قرآن میں اسطرح پر ناسخ و منسوخ کو تسلیم کیا جاوے تو اسکے احکام کا منسوخ ہونا اور قائم رہنا صرف لوگوں کے قیاس پر منحصر رہجاتا ہے جو کسی طرح تسلیم کے لایق نہیں۔

فدیہ دینے کی آیت میں جو حکم ہے وہ منسوخ نہیں ہوا، اور وہ آیت یہ ہے "وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین فمن تطوع خیرا فھو خیر لہ وان تصوموا خیر لکم ان کنتم تعلمون"۔ اس آیت میں جو لفظ "یطیقون" کا ہے اسکی اور بھی قراتیں ہیں مثلاً "یطوقونہ" یے کے پیش اور واو کے تشدید سے یا یے کے زبر اور طوی اور واو دونکی تشدید سے جسکے معنی کسی کام کے تکلیف اٹھا کر سونیکے ہیں مگر جو مشہور قرأت ہے ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں بعض علما مفسرین کی یہ رائے ہے کہ فدیہ کا حکم بھی مسافر اور مریض سے علاقہ رکھتا ہے کیونکہ بعض مریض اور مسافر ایسے ہوتے ہیں جو شخص روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ پہلی قسم کے مسافر اور بیمار کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ اور دنوں میں روزہ رکھ لیں اور دوسری قسم کے مسافر اور بیمار کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ چاہیں روزہ رکھیں اور چاہیں فدیہ دیدیں مگر یہ معنی صحیح نہیں ہو سکتے کیونکہ "علی الذین" سے بالتخصیص

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۱۸۱)

بیمار اور مسافر و اِد۔ ینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اور جو رعایت اول قسم کے بیمار اور مسافر کی ہونی چاہیے تھی وہ دوسرے قسم کے بیمار اور مسافر کی ہوتی ہے۔

بعض علما کا یہ قول ہے (تفسیر کبیر جلد ا صفحہ ۶۵۰) کہ "یطیقونہ" کے معنی ہی مشکل اور تکلیف سے کسی کام کے انجام ہونے کے ہیں۔ دو لفظ ہیں ایک "وسع" اور ایک "طاقت"۔ "وسع" اُس شخص کی نسبت بولا جاتا ہے جو کسی کام کرنے پر آسانی سے اور بغیر تکلیف کے قادر ہو۔ اور طاقت اُس شخص کی نسبت بولا جاتا ہے جو کسی کام کرنے پر مشکل سے اور تکلیف اٹھا کر قادر ہو اور وہ شاذ قرأتین جنکا اوپر ذکر کیا ہے اِسی مطلب کی تائید کرتی ہیں پس "یطیقونہ" کے معنی "یستصعبونہ" کے ہونگے۔ جو لوگ کہ روزہ رکھنے کی نہایت تکلیف اور سختی اٹھا کر طاقت رکھتے ہیں اُنکو اجازت ہے کہ روزہ رکھنے کے بدلے فدیہ دیدیں۔ پس یہ آیت منسوخ نہیں ہے اور اپنے حکم پر بحال ہے۔

بعض علمائے مفسرین نے بھی جیسا کہ تفسیر کبیر میں مندرج ہے اِس بات کو تسلیم کیا ہے مگر یہ بحث پیش کی ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو نہایت تکلیف اور سختی اٹھا کر روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ سدی کا قول ہے کہ وہ لوگ وہ ہیں جو بہت بڈھے ہوگئے ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت انس اپنے مرنے سے پہلے روزہ نہیں رکھتے تھے۔ اُنکو روزہ رکھنے میں سختی اور دشواری معلوم ہوتی تھی اور ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلا دیتے تھے۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ بڈھے آدمی کی کیوں قید لگائی ہے۔ قرآن مجید میں کوئی ایسا اشارہ نہیں ہے جس سے "الذین" سے صرف بڈھا ہی آدمی مخصوص کیا جائے تمام انسان بڈھے ہوں یا جوان اُنکی حالت باعتبار خلقت اور موسم اور ملک کے مختلف ہوتی ہے بہت سے جوان آدمی بلحاظ اپنی خلقت کے ایسے ہوتے ہیں کہ اُنکو روزہ میں بے انتہا تکلیف اور مشقت ہوتی ہے۔ اور بعضے بڈھے ایسے ہوتے ہیں کہ اُنکو روزہ معلوم بھی نہیں ہوتا۔ یہ موسم کے اختلاف کے سبب سے بہت اختلاف پڑ جاتا ہے وہی لوگ جو ایک موسم میں نہایت آسانی سے روزہ رکھ سکتے ہیں۔ دوسرے موسم میں روزہ رکھنے میں نہایت سختی اور تکلیف اوٹھاتے ہیں۔ ایک ملک کے لوگ جبکہ دن ایک سیت (؟) اُن ... آسانی سے روزہ رکھینگے اور وہی لوگ جبکہ دن بڑا ہوتا ہے نہایت

اور تاکہ اللہ کو اُس بات پر جسکی تم کو ہدایت کی ہی بزرگی سی یاد کرو، اور تاکہ تم شکر کرو (۱۸۱)

تکلیف اور سختی روزہ رکھنے میں اُٹھاوینگے۔ بلکہ بعض ملکوں میں کبھی دن اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ انسان کی طاقت سے روزہ رکھنا خارج ہوتا ہے۔ جیسے کہ عرض تسعین میں جہاں چھ مہینے کا دن ہوتا ہے، اور عرض ستین میں جہاں بعض موسموں میں غروب اور طلوع میں اسقدر فاصلہ ہوتا ہے جسکی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ رات ہوتی ہی نہیں۔ پس خدا تعالیٰ نے ان تمام حالات کے لحاظ سے جو اُسکے علم میں تھے نہایت عمدہ ترتیب سے جو فطرت انسانی کے بالکل مطابق ہے یہ حکم دیا ہے کہ "وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین" پھر اُسکو شخص دون شخص سے مقید کرنا ایک غلطی اور زیادتی علی الکتاب ہے یہ پہلی آیتوں میں جہاں بیمار اور مسافر کا اور اُن لوگوں کا جو بدشواری روزہ برداشت کرسکتے ہیں حکم ہے اُن آیتوں کا علانیہ یہ منشاء تھا کہ مریض اور مسافر کو روزے کا نہ رکھنا بہتر ہے مگر اُن لوگوں کی نسبت جو بدشواری روزہ رکھ سکتے تھے یہ منشاء تھا کہ اُنکو روزہ رکھنا بہتر ہے جیسا کہ ان لفظوں سے کہ "وان تصوموا خیر لکم" پایا جاتا ہے۔ اسی منشاء سے پچھلی آیتوں میں جن میں روزوں کو رمضان کے ساتھ مخصوص کیا ہے مریض اور مسافر کا مکرر ذکر کیا، اور اُن لوگوں کا جو بدشواری روزہ برداشت کرسکتے تھے ذکر چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ اُنکے حق میں فدیہ دینے سے روزہ رکھنا بہتر تھا۔

ان تمام بحثوں کے بعد یہ نتیجہ نکلا کہ پہلی آیت میں جن روزوں کا ذکر ہے وہ رمضان ہی کے روزے ہیں اور کوئی حکم اور کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ اور تمام آیتوں پر لحاظ کرنیکے بعد روزوں کی نسبت مفصلہ ذیل حکم پائے جاتے ہیں۔

۱- روزے رمضان کے ہر مسلمان پر لکھے گئے ہیں جسکو شرعی اصطلاح میں فرض کہتے ہیں۔

۲- روزوں کے رکھنے سے یہ فرض ادا ہوتا ہے۔

۳- اگر رمضان کے مہینے میں کوئی شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اُسکو روزہ رکھنا نہیں چاہیئے اور اور دنوں میں جبکہ وہ تندرست ہو اور سفر ختم ہو جاوے تو اُسکے بدلے روزے رکھنے ہے۔

۴- جن لوگوں کو روزہ رکھنے میں زیادہ سختی اور تکلیف ہوتی ہے اور بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں اُنکو اجازت ہے کہ روزوں کے بدلے فدیہ دیں۔ مگر اُنکے حق میں فدیہ دینے سے روزہ رکھنا بہتر ہے

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

جو لوگ کہ روزہ پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ وہ انسان کی تکلیف کا باعث ہے اور صحت جسمانی کو نہایت مضر ہے اور بعض ملکوں میں اُسکا ادا کرنا غیر ممکن ہے اُنکو تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ جس ترتیب اور خوبی سے خدا نے روزہ کا حکم دیا ہے وہ نہ تکلیف کا باعث ہے اور نہ صحت جسمانی کو مضر ہے اور نہ خلاف فطرت انسانی ہے اور نہ کسی ملک کے رہنے والوں کے خلاف طاقت ہے۔ مگر ایک بحث البتہ باقی ہے کہ آیا وہ فی نفسہ عبادت بھی ہے یا نہیں اور اگر عبادت ہے تو کیوں۔ چنانچہ اِس بحث کو ہم شروع کرتے ہیں۔

جس قدر کثرت سے یہود اور متقدمین عیسائی روزے رکھتے تھے اُس سے ظاہر ہے کہ اُنکا خیال روزہ رکھنے سے تزکیہ نفس اور خدا کی رضامندی اور خدا کی عبادت کا تھا۔ ابتدائے زمانہ میں جبکہ انسان نے شائستگی کی طرف میلان شروع کیا تھا تمام لوگوں کو یہ خیال تھا کہ خدا اپنی مخلوق سے نہایت راضی ہوتا ہے اگر مخلوق قصداً اپنے بدن کو اپنی روح کو خدا کی خوشنودی کی نیت سے تکلیف و مصیبت میں ڈالے اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض قوموں نے تکالیف شاقہ اپنے پر گوارا کی ہیں۔ کسی نے ایک غار میں اپنی تمام زندگی بسر کر دی ہے۔ جب ہم ہندو جوگیوں اور قدیم عیسائی فقیروں کے رہنے کے غار اور پہاڑوں کی تنگ و تاریک کھوہیں دیکھتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے" اور مذہبی خیالات کا جو غلبہ انسان پر ہوتا ہے اُسکا اندازہ کیا جاتا ہے" اور دیکھا جاتا ہے کہ اُنہی خیالات کے سبب سے انسان نے کسقدر تکلیفیں اپنے پر گوارا کی ہیں۔ کوئی اپنا ہاتھ اونچا کر کے سکھا دیتا ہے، کوئی بیٹھنا اور لیٹنا چھوڑ دیتا ہے اور تمام عمر کھڑے رہکر گذار دیتا ہے۔ کوئی لذیذ غذا کو چھوڑ دیتا ہے، اور تمام عمر صرف نہایت حقیر روٹی پر زندگی بسر کرتا ہے۔ کوئی پلنگ پر سونا اور شادی کرنا چھوڑ دیتا ہے، ایسی بہت سی مثالیں اب بھی ہمکو ہزاروں عیسائی مانک اور ننیں دکھائی دیتی ہیں۔ غرضکہ تمام جسمانی یا ضعفوں کا اسی غلط خیال پر رواج ہوا ہے۔ اسی خیال سے جان کی قربانی مروج ہوئی، اور یہانتک نوبت پہونچی کہ انسان نے اپنی جان کی اور اپنی اولاد کی جان کی گناہ سے روح کو پاک کرنیکے خیال سے قربانی کی۔ یہ ایک عجیب خیال تھا کہ خدا یا دیوتا انسانکی زندگی کو آسایش سے بسر کرنا پسند نہیں کرتا۔ تمام یونانی اور رومی مذہبی افسانوں سے یہ خیال مترشح ہوتا ہے کہ دیوتا یا خدا انسان کے عیش کو روا نہیں رکھتا۔

ابتدا میں جبکہ انسان کی غذا صرف زمین کی قدرتی پیداوار اور جنگل کے جانوروں کے شکار پر

اور جب تجھ سے میرے بندے میرے حال سے سوال کریں تو بیشک میں نزدیک ہوں جواب دیتا ہوں ہر ایک پکارنیوالے کی پکار کو

منحصر تھی کبھی کبھی فاقہ کرنا لازمی امر ہوگا۔ نیم وحشی انسانوں کو غذا سے زیادہ کوئی چیز خوشی دینے والی نہ ہوگی۔
اس لئے ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دیوتا یا خدا انسان کی جسمانی تکلیف سے خوش ہوتے ہیں تو اس وقت
روزہ ایک مذہبی امر ہو کر رواج پایا ہوگا۔ توریت میں جہاں روزہ رکھنے کا حکم ہے وہیں حضرت موسیٰ
نے بنی اسرائیل سے کہا ہے کہ اپنی روحوں کو مبتلا کرو۔ عبری زبان کے قدیمی محاورے کے موافق روح کے مبتلا
کرنے سے روزہ رکھنا مراد ہوتا ہے پس کچھ شبہ نہیں ہے کہ روزہ رکھنا اسی خیال سے کہ خدا ریاضت بدنی
سے راضی ہوتا ہے مذہبی امر قرار پایا ہے۔

محمد رسول اللہ نے اس خیال کو کہ خدا انسان کی ریاضت بدنی یعنی جسم اور روح کو دکھ دینے میں ڈالنے
سے راضی ہوتا ہے متعدد طرح سے باطل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ رہبانیت اسلام میں نہیں ہے اسلئے
یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت صلعم نے اس خیال پر رمضان کے روزوں کو مقرر کیا ہو مگر دنیا کا
کام صرف سمجھدار ہی لوگوں پر منحصر نہیں ہے بلکہ انکو عام لوگوں سے کام پڑتا ہے اور عام لوگوں کو ایسے
امور کی نسبت جن سے انکو خدا کے رضامند کرنیکا خیال پیدا ہو زیادہ خیال ہوتا ہے۔ عرب کے لوگ
یہودیوں اور عیسائیوں کو دیکھتے تھے کہ خدا کے خوش کرنیکے خیال سے اور اپنے مذہب کی پیروی کی
نظر سے روزہ رکھتے ہیں۔ آنحضرت صلعم نے بھی اس رسم کے جاری رکھنے کی ایک عمدہ اور آسان اور غیر
خلاف فطرت انسانی کے طریقہ میں اجازت دی۔ چنانچہ الفاظ "کما کتب علی الذین من قبلکم"
صاف اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلعم اس رسم کے موجد نہ تھے بلکہ اس رسم کو صرف بدستور
قایم رہنے دیا تھا۔ باایں ہمہ اس رسم کی سختی کو نہایت عمدگی سے نرم اور قابل برداشت کر دیا کہ
بیماروں اور مسافروں کو اور دنوں میں اور جو لوگ روزہ سے زیادہ تکلیف اٹھاتے ہیں روزہ رکھنے
اور فدیہ دینے میں مجاز کر دیا۔

باوجود ان سب باتوں کے جبکہ روزہ حد اعتدال سے نہ گذر جاوے اور وبال جان نہ ہو جاوے اور انسان پر
صعوبت نہ ڈالے جسکا اشارہ "یطیقونہ" کے لفظ میں ہے تو بلاشبہ تزکیہ نفس اور روح میں نیکی اور صلاحیت

اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ (۱۸۲)
اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ
وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ
عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ
وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ
الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ
وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (۱۸۳)

پیدا ہونیکا ذریعہ ہے۔ کم کھانا بلاشبہ انسان کے دل ودماغ کو زیادہ صحیح اور درست رکھتا ہے اور انسان کے دل کو خدا کی طرف زیادہ تر متوجہ کرتا ہے اور جو عبادت خدا کی غیر روزہ کی حالت میں کیجاتی ہے روزہ کی حالت میں زیادہ تر دلی توجہ سے ہوتی ہے۔ اسکا یہ سبب نہیں ہے کہ انسان کو اپنے تئیں تکلیف میں ڈالنا خدا کو پسند آتا ہے۔ بلکہ یہ سبب ہے کہ انسان میں یہ ایک فطرتی امر ہے کہ جب کسی خاص امر کی طرف زیادہ تر متوجہ ہوتا ہے تو اسکو غذا کی طرف کم رغبت یا کم توجہ ہوتی ہے اسیطرح قلیل غذا انسانکو اسطرف جسپر وہ توجہ کرنی چاہتا ہے زیادہ تر متوجہ کردیتی ہے۔ یہی باعث ہے کہ روزہ کی حالت میں خدا کی عبادت غیر روزہ کیحالت کی بہ نسبت زیادہ تر توجہ اور خلوص سے ہوتی ہے۔ اسی سبب سے آنحضرت صلعم نے روزہ رکھنے کی رسم کو ایک نہایت اعتدال پر جاری رہنے دیا۔ حضرت موسیٰ نے کوہ سینا پر یا حضرت عیسیٰ نے بیابان میں یا محمد رسول اللہ نے کوہ حرا میں جب کہ زمانہ نزول وحی قریب تھا روزے رکھنے اختیار کئے یا غذا سے پرہیز کیا یا معمولی غذا میں کمی کی اسکا یہی سبب تھا۔

جب وہ مجھکو پکارتا ہے پس چاہیئے کہ قبول کرو مجھکو اور چاہیے کہ ایمان لاؤ مجھپر تاکہ وہ

راہ پاویں (۱۸۲) حلال کیا گیا تمھارے لئے روزہ کی رات کو اپنی بی بیوں سے اختلاط

کرنا وہ زیبایش ہیں تمھاری لئے اور تم زیبایش ہو انکے لئے خدا نے جانا کہ تم اپنے لئی خیانت

کرتے تھے پھر معاف کیا تمکو اور درگذر کی تمسے پھر اب ان سے مخالطت کرو اور تابعداری

کرو اسکی) جو لکھا ہے اللہ نے تمھارے لئی اور کھاؤ اور پیو جبتک کہ نمودار ہو تمکو صبح کا

سفید ڈورا سیاہ ڈورے سے، پھر پورا کرو روزہ کو رات تک اور مت مخالطت کرو بیبیوں

سے ایسی حالت میں کہ تم مسجدونمیں اعتکاف کرنیوالی ہو یہ ہیں (مقرر کی ہوئی) حدیں

اللہ کی پھر انکے پاس مت جاؤ اسیطرح اللہ بیان کرتا ہے لوگوں کیلئے اپنی نشانیاں

تاکہ وہ پرہیزگاری کریں (۱۸۳)

پس جبکہ روزہ ایسی حالت میں کہ اسکا رکھنا شاق نہ گذرے تزکیہ نفس اور روحانی نیکی کا ذریعہ ہے، تو اس رسم کا نہایت اعتدال کے ساتھہ قایم رکھنا جسطرح کہ محمد رسول اللہ صلعم نے قایم رکھی فطرت انسانی کے بالکل مطابق و موافق ہے۔

(۱۸۳) (احل لکم) یہودی اور عیسائی دن رات کا روزہ رکھتے تھے یعنی روزہ افطار کرنیکے بعد ہی سے دوسرا روزہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ توریت اور انجیل میں جہاں روزہ کا ذکر ہے دن رات کا روزہ بیان ہوا ہے۔ رمضان کے روزوں کا جب حکم ہوا تو کوئی حد روزے کی مقرر نہ تھی۔ مسلمان بھی یہودیوں کی دیکھا دیکھی دن رات کا روزہ رکھتے تھے جو انپر نہایت شاق گذرتا تھا اور جس منشا سے کہ محمد رسول اللہ صلعم نے اس رسم کو قایم رکھا تھا اسکے بھی مخالف تھا اسلئے اس آیت میں خدا کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ صرف دن ہی کا روزہ رکھنا چاہیے۔

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۸۶﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ

رات جو آرام کیلئے ہے وہ روزہ میں داخل نہیں ہے۔ اس آیت سے یہ سمجھنا کہ پہلے مسلمانونکو بھی رات کو روزہ رکھنے کا حکم تھا اور وہ حکم اس آیت سے منسوخ ہو گیا محض غلطی ہے۔

(۱۸۶) (وقاتلوا فی سبیل اللہ) اس آیت میں اور جو آیتیں کہ اسکے بعد ہیں اُن میں کافروں یا دشمنوں سے لڑنیکا حکم ہے مگر صاف بیان کیا گیا ہے کہ جو تم سے لڑیں اُن سے لڑو اور زیادتی مت کرو اکثر لوگ مذہب اسلام پر یہ طعنہ دیتے ہیں کہ اُس میں تحمل اور بردباری اور عاجزی اور مذہب کے سبب سے جو تکلیفیں کافروں کی طرف سے پہونچیں اُنکی صبر سے برداشت نہیں ہے۔ اور یہ باتیں مذہب کی سچائی اور نیکی اور اخلاق اور خدا کی راہ میں تکالیف برداشت کرنیکے برخلاف ہیں۔ مگر یہ ایک بڑی غلطی اور ناسمجھی ہے اسمیں کچھ شک نہیں کہ قرآن مجید میں جو احکام لڑائی کے نہایت نیکی اور انصاف پر مبنی تھے اُنکو مسلمانوں نے جو خلیفوں یا بادشاہوں کے نام سے مشہور

اور مت کھاؤ اپنے آپس میں (ایک دوسرے کا) مال ناحق، اور مت ڈالو اُسکا جھگڑا
حاکموں تک، تاکہ کھاؤ ایک ٹکڑا لوگوں کے مال کا ساتھ گناہ کی، حالانکہ تم جانتے ہو (۱۸۴)
پوچھتے ہیں تجھ سے نئے چاندوں (کے حال) سے، تو کہدے کہ یہ مقررہ وقت ہیں
لوگوں کے لئے اور حج کیلئے، اور ایمیں کچھ نیکی نہیں ہے کہ گھروں میں آؤ اُنکے پچھواڑے
سے ولیکن نیکی اُس شخص کیلئے ہے جو پرہیزگاری کرے اور آئے گھروں میں اُنکے دروازوں
سے اور ڈرو اللہ سے تاکہ تم فلاح پاؤ (۱۸۵) اور لڑو اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے جو
تم سے لڑیں، اور زیادتی مت کرو، بیشک اللہ دوست نہیں رکھتا زیادتی کرنیوالوں کو (۱۸۶)
اور مار ڈالو اُنکو جہاں اُنکو پاؤ اور نکالو اُنکو اُس جگہہ سے کہ اُنہوں نے تمکو نکالا ہے، اور (لوگوں کو
مصیبت میں ڈالدینا) زیادہ سخت ہے مار ڈالنے سے

ہوے دینداری کے بہانے سے اپنی خواہش نفسانی کے پورا کرنے اور ملک گیری کے لئے نہایت بداخلاقی اور ناانصافی سے برتا۔ اور وحشی درندوں سے بھی بدتر کام کئے، اور علماے اسلام نے اُنکی تائید کے لئے ایسے مسئلے بیان کئے جو اسلام کی روحانی نیکی کے برخلاف تھے مگر اُنکے ایسا کرنے سے جو بُرائی یا عیب قرار دیا جاوے وہ اُنھی پر محدود ہے جنہوں نے ایسا کیا نہ اسلام پر۔ ہر ایک منصف مزاج کا اور ہر ایک معترض او نکتہ چین کا یہ فرض ہے کہ اُن ظالموں کے کردار کو اُنھی پر محدود رکھے نہ یہ کہ اُنکے کردار سے مذہب اسلام پر نکتہ چینی کرے۔

مذہب اسلام میں اگرچہ جابجا عفو و صبر و تحمل کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں اور لوگوں کو اُسپر رغبت دلائی گئی ہے مگر اُسی کے ساتھہ بدلا لینے کی بھی بغیر زیادتی کے اجازت دی ہے۔ کیا یہ قانون دنیا کے پیدا کرنیوالے کے قانون قدرت کے مناسب نہیں ہے؟ اور کیا اس قانون سے زیادہ عمدہ اور سچا کوئی قانون ہو سکتا ہے

وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۗ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸۷﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ

انسان جب اخلاق کی باتوں پر گفتگو کرتا ہے تو بہت سی ایسی باتیں اور ایسے اصول بیان کرتا ہے جو کان کو اور دل کو نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں، اور سننے و پڑھنے والے خیال کرتے ہیں کہ یہی اصول اخلاق کے اور یہی اصول اعلیٰ درجہ کی نیکی کے ہیں، مگر درحقیقت وہ ہوا کی آواز سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتے اور جو کہ وہ اصول فطرت انسانی کے بلکہ قانون قدرت کے برخلاف ہوتے ہیں کبھی اُن پر عملدرآمد نہیں ہو سکتا ایسا قانون بنانے سے جس پر کبھی عملدرآمد نہو سکے کوئی نتیجہ اور فائدہ مترتب نہیں ہوتا، بلکہ دل میں اُس قانون کی حقارت بیٹھتی ہے کہ وہ قانون قدرت کے برخلاف ہے۔

کوئی کتاب دنیا میں انجیل سے زیادہ انسان کو نرم مزاج اور بردبار و متحمل کرنیوالی اور اخلاق کو ایسی چمک سے دکھلانیوالی جس سے آنکھوں میں چکاچوند آجاوے نہیں ہے۔ گو اسکے مقولے ایسے نہیں ہیں کہ سب سے پہلے اسی میں بیان کئے گئے ہوں۔ بلکہ بہت سے ایسے ہیں جو اُس سے پہلے لوگوں نے بھی جنکو ہم اب بت پرست و کافر گنتے جاتے ہیں بیان کئے ہیں۔ مگر ہمکو دیکھنا چاہیئے کہ اُنکا لوگوں میں کیا اثر ہوا تھا۔

انجیل میں لکھا ہے کہ اگر کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اُسکے سامنے کر دے۔ بلا شبہہ یہہ مسئلہ اخلاق کے خیال سے تو بڑا عمدہ معلوم ہوتا ہے مگر کسی زمانہ کے لوگوں نے اسپر عمل کیا ہے؟ اگر دنیا اسپر عمل کرے تو دنیا کا کیا حال ہو؟ اسی طرح آباد رہے اور اسیطرح لوگوں کی جان و مال امن میں رہے؟ نہایت دلچسپ جواب دیا جاتا ہے کہ جب سب ایسے ہی ہو جاویں تو دنیا سے شر اُٹھ جاوے مگر پوچھا جاتا ہے کہ کبھی ایسا ہوا ہے؟ یا کبھی ایسا ہوگا؟ یہہ سب ناشدنی باتیں ہیں جو خیال میں شدنی قرار دیکر انسان خیالی اور جھوٹی خوشی حاصل کرتا ہے۔ انجیل میں لکھا ہے کہ "تو اپنے کل کے کھانے کی فکر مت کر، خدا کل کی روزی پہونچانے کی فکر کرنے والا ہے" اول کو یہ مقولہ نہایت ہی پیارا اور اُس پیارے خدا پر اعتماد دلانیوالا معلوم ہوتا ہے، مگر کبھی کسی نے

اور مت لڑو اُنسے مسجد حرام کے پاس جبتک کہ وہ تمسے اُس میں نہ لڑیں پھر اگر وہ تمسے لڑیں تو تم اُنکو مار ڈالو، اسیطرح ہے سزا کافروں کی (۱۸۷) پھر اگر وہ باز رہیں تو بیشک اللہ بخشنے والا ہے مہربان (۱۸۸) اور لڑو اُنسے جبتک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور اللہ کا دین ہو جاوے۔

اسپر عمل کیا ہے؟ آیندہ کبھی اُسپر عمل ہوگا؟ اگر ہم اس ناشدنی امر کو ایک لمحہ کے لئے شدنی تصور کرکے تمام دنیا کے لوگوں کو اسی مقولہ پر عمل کرتا ہوا سمجھیں تو دنیا کا کیا حال ہوگا؟ پس اس قسم کی تمام باتیں انسان کو دہوکا دینے والی ہیں اور قانون قدرت کے برخلاف ہونے سے خود اپنی سچائی کو مشتبہ کرتی ہیں عیسائی مذہب جسکی جڑ ایسی نیکی اور نرمی اور اخلاق میں لگائی گئی تھی وہ پہولا پہلا اور سرسبز و شاداب ہوا۔ اسکو چہوڑ دو کہ وہ کس سبب سے بڑہا اور سرسبز ہوا مگر دیکھو کہ اُسنے کیا پہل پیدا کیا۔ ایک بہی نصیحت اُسکی کام نہ آئی، اور خود مذہب نے جو خونریزی اور بیرحمی اور نا انصافی، اور درندوں سے بہی زیادہ بدتر خصلت دکہلائی وہ شاید دنیا میں بےمثل ہوگی، اور جس نیکی میں اُسکی جڑ لگائی گئی تہی اُسنے کچہ پہل نہیں دیا، کیونکہ قانون قدرت کے برخلاف لگائی گئی تہی۔ جو خوبی کیا روحانی اور کیا اخلاقی اور کیا تمدنی اب ہم بعض عیسائی ملکوں میں دیکھتے ہیں، کیا یہ پہل اُسی درخت کا ہے جسکی جڑ ایسی نیکی میں لگائی گئی تہی جو خلاف قانون قدرت تہی؟ حاشا وکلا، بلکہ یہ اُسکا پہل ہے کہ اُس درخت کو وہاں سے اُکہاڑ کر دوسری زمین پر لگایا ہے جو قانون قدرت کی زمین ہے، اور جسقدر کہ پہلی زمین کی مٹی اُسکی جڑ میں لگی ہوئی ہے اُسی قدر اُسمیں نقصان ہے۔

اِس سے بہی زیادہ رحیم مذہب کا حال سنو جسنے ایک چہوٹے سے چہوٹے جانور کی جان کو بہی مارنا سخت گناہ قرار دیا ہے۔ خون کا بہانا، آدمی کا ہو یا درندے یا ایک پشہ کا، خدا کی صنعت کو ضائع کرنا سمجہا ہے، مگر تاریخ اور زمانہ موجود ہے اِس اصول نے جو قانون قدرت کے مخالف تہا کیا نتیجہ دیا، قتل و خونریزی ویسی ہی رہی اور ویسی ہی ہے جیسے کہ قانون قدرت سے ہونی چاہیئے۔ وہی جو ایک پشہ کا مارنا گناہ عظیم سمجہتے تھے ہزاروں آدمیوں کو اپنے ہاتہ سے قتل کرتے تھے اور قتل کرتے ہیں۔ پس کوئی قانون گو وہ ظاہر میں کیسا ہی چمکیلا اور خوش آیند ہو جبکہ قانون قدرت کے برخلاف ہے

فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸۹﴾ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا

محض نکما اور بے اثر ہے۔ اسلام میں جو خوبی ہے وہ یہی ہے کہ اُسکے تمام قانون قانون قدرت کے مطابق اور عملدرآمد کے لایق ہیں۔ رحم کی جگہہ جہانتک کہ قانون قدرت اجازت دیتا ہے رحم ہے۔ معافی کی جگہہ اُسی اُصول پر معافی ہے۔ بدلے کی جگہہ اُسی کے مطابق بدلا ہے۔ لڑائی کی جگہہ اُسی کے اصولوں پر لڑائی ہے۔ ملاپ کی جگہہ اُسی کی بنا پر ملاپ ہے۔ اور یہی بڑی دلیل اُسکی سچائی کی اور قانون قدرت کے بنانے والے کی طرف سے ہونے کی ہے۔

اسلام فساد اور دغا اور غدر و بغاوت کی اجازت نہیں دیتا۔ جسنے اُنکو امن دیا ہو مسلمان ہو یا کافر اُسکی اطاعت اور احسان مندی کی ہدایت کرتا ہے۔ کافروں کے ساتھہ جو عہد و اقرار ہوئے ہوں اُنکو نہایت ایمانداری سے پورا کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ خود کسی پر ملک گیری اور فتوحات حاصل کرنیکو فوج کشی اور خونریزی کی اجازت نہیں دیتا۔ کسی قوم یا ملک کو اس غرض سے کہ اُنمیں بالجبر اسلام پھیلایا جاوے حملہ کرکے مغلوب و مجبور کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہانتک کہ کسی ایک شخص کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا نہیں چاہتا۔ صرف دو صورتوں میں اُسنے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے ایک اِس حالت میں جبکہ کافر اسلام کی عداوت سے اور اسلام کے معدوم کرنے کی غرض سے نہ کسی ملکی اغراض سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوں۔ کیونکہ ملکی اغراض سے جو لڑائیاں واقع ہوں۔ خواہ مسلمان مسلمانوں میں خواہ مسلمان و کافروں میں۔ وہ دنیاوی بات ہے مذہب سے کچھہ تعلق نہیں ہے۔ دوسرے جبکہ اُس ملک یا قوم میں مسلمانوں کو اُس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں اُنکی جان و مال کو امن نہ ملے اور فرائض مذہبی کے ادا کرنے کی اجازت نہ ہو۔ مگر اس حالت میں بھی اسلام نے کیا عمدہ طریقہ ایمانداری کا بتایا ہے کہ جو لوگ اُس ملک میں جہاں بطور رعیت کر رہتے ہوں یا

پھر اگر وہ باز رہیں تو زیادتی کرنا نہیں چاہیئے مگر ظالموں پر (۱۸۹) حرمت والا مہینا بدلے حرمت والے مہینے کے اور حرمتوں کا ایک دوسرے سے بدلا ہوتا ہی پھر جس نے زیادتی کی تم پر پس زیادتی کرو تم اُس پر جس طرح کہ اُسنے تم پر زیادتی کی اور ڈرو اللہ سے اور جان لو کہ

امن کا علانیہ یا ضمناً اقرار کیا ہو اور گو صرف بوجہ اسلام اُن پر ظلم ہوتا ہو تو بھی اُنکو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی۔ یا اُس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں یعنی اُس ملک کو چھوڑ کر چلے جاویں۔ ہاں جو لوگ خود مختار ہیں اور اُس ملک میں امن لیے ہوئے یا بطور رعیت کے نہیں ہیں بلکہ دوسرے ملک کے باشندے ہیں اُنکو اُن مظلوم مسلمانوں کے بچانے کو جنپر صرف اسلام کی وجہ سے ظلم ہوتا ہی یا اُنکو امن اور اُنکے لئے ادائے فرائض مذہبی کی آزادی حاصل کرنے کو تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن جس وقت کوئی ملکی یا دنیوی غرض اِس لڑائی کا باعث ہو اُسکو مذہب اسلام کی طرف نسبت کرنے کی کسی طرح اسلام اجازت نہیں دیتا۔

یہی بات ہے جس پر اسلام نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے۔ یہی لڑائی ہے جسکے کرنے کی ترغیب دی ہے یہی لڑائی ہے جسکا نام جہاد رکھا ہے۔ یہی لڑائی ہے جسکے مقتولوں کو روحانی ثواب کا وعدہ دیا ہے یہی لڑائی ہے جسکے لڑنیوالوں کی فضیلتیں بیان ہوئی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہی کہ اس قسم کی لڑائی نا انصافی اور زیادتی ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی اخلاق کے برخلاف ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی قانون قدرت انسان کی فطرت کی مخالف ہی؟ کون کہہ سکتا ہی کہ اس لڑائی کا حکم خدا کی مرضی کے برخلاف ہی؟ کون کہہ سکتا ہی کہ اس حالت میں بھی لڑائی کا حکم نہ ہونا بلکہ دہلے گال پھیر دینا خدا کی مرضی کے مطابق ہوگا؟ لڑائی شروع ہونے کے بعد تلوار ہر ایک کی دوست ہوتی ہے۔ اُس میں بجز اِسکے کہ دشمنوں کو قتل کرو، لڑائی میں بہادری کرو، دل کو مضبوط رکھو، میدان میں ثابت قدم رہو، فتح کرو یا مارے جاؤ اور کچھ نہیں کہا جاتا۔ وہی قرآن نے بھی کہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص اُس موقع اور محل کو جسکی نسبت قرآن میں لڑنیوالوں کے دلوں کے مضبوط کرنے کی آیتیں نازل ہوئی ہیں چھوڑ کر اُن آیتوں کو عموماً

إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿١٩٠﴾ وَأَنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٩١﴾ وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ

خونخواری اور خونریزی پر منسوب کرے جیسا کہ اکثر نادان عیسائیوں نے کیا ہے، تو یہ خود اُسکا قصور ہوگا نہ اسلام کا۔

لڑائی میں بھی جو رحم قانونِ قدرت کے موافق ضرور ہے اسلام نے اُس میں بھی فروگذاشت نہیں کیا۔ عورتوں کو بچوں کو بوڑھوں کو، جو لڑائی میں شریک نہ ہوئے ہوں اُنکو قتل کرنے کی ممانعت کی۔ عین لڑائی میں اور صفِ جنگ میں جو مغلوب ہو جاوے اُسکے قتل کی اجازت نہیں دی صلح کو، معاہدہ امن کو قبول کرنے کی رغبت دلائی۔ باغ کو کھیتوں کو جلانے کی ممانعت کی۔ قیدیوں کو احسان رکھکر یا فدیہ لیکر چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ نہایت ظالمانہ طریقہ جو لڑائی کے قیدیوں کو عورت ہوں یا مرد غلام اور لونڈی بنا لینے کا تھا اُسکو معدوم کیا۔ اِس سے زیادہ لڑائی کی حالت میں انصاف اور رحم کیا ہو سکتا ہے؟ ہاں یہ سچ ہے کہ مسلمانوں نے اِس میں سے کسی کی بھی پوری تعمیل نہیں کی، بلکہ برخلاف اِسکے بے انتہا ظلم و ستم کئے۔ مگر جبکہ وہ اسلام کے حکم کے برخلاف تھے تو اسلام کو اُس سے داغ نہیں لگ سکتا۔ وہ بھی تو مسلمانوں ہی میں سے تھے جنہوں نے عمرؓ کو عثمانؓ کو علیؓ کو حسینؑ کو ذبح کر ڈالا تھا، کعبہ کو جلا دیا تھا۔ پس اُنکے کردار سے اسلام کو کیا تعلق ہے۔

مشرکینِ مکہ نے اُن لوگوں پر جو مسلمان ہو گئے تھے صرف اسلام کی عداوت سے، اور خود رسولِ خدا صلعم پر بہت سے ظلم کئے تھے اور تکلیفیں پہونچائی تھیں، قتل کے درپے تھے یہانتک کہ ایک دفعہ مسلمانوں نے حبشہ میں جا کر پناہ لی اور آخرکار آنحضرت صلعم اور سب مسلمان مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے آئے۔ پھر اُنہوں نے وہاں بھی تعاقب کرنا چاہا، اور کعبہ میں حج کے آنے سے روکا، لڑائی پر آمادہ ہوئے۔ تب اسلام نے بھی اُنسے لڑنے کا حکم دیا۔ پس جسقدر احکام قتلِ مشرکین کے ہیں وہ سب اُنہی لڑنیوالوں سے متعلق ہیں

بیشک اللہ ڈرنیوالوں کے ساتھ ہی (۱۹۰) اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اور مت ڈالو اپنے تئیں اپنے ہاتھوں سے تہلکہ میں، اور احسان کرو بیشک اللہ دوست رکھتا ہے احسان کرنیوالوں کو (۱۹۱) اور پورا کرو حج کو اور عمرہ کو اللہ کے لیئے پھر اگر تم روکے جاؤ تو جو کچھ میسر ہو قربانی سے (وہ کرلو)

وہ بھی اُسی وقت تک کہ فتنہ و فساد رفع ہو جاوے۔ جیسے کہ خود خدا نے فرمایا ہے کہ "وقاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ ویکون الدین للہ" امام فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ مشرکین کا فتنہ یہ تھا کہ وہ مکہ میں مسلمانوں کو مارتے تھے اور ایذا دیتے تھے تاتنگ ہو کر مسلمان حبشہ کو چلے گئے پیچھے بھی وہ برابر ایذا اور تکلیف دیتے رہے یہانتک کہ مسلمان مدینہ میں ہجرت کر گئے، اور مشرکین کی غرض ایذاؤں اور تکلیفوں سے یہ تھی کہ مسلمان اپنا اسلام چھوڑ کر پھر کافر ہو جاویں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ کافروں سے لڑو جبتک کہ اُن پر غالب ہو جاؤ تاکہ وہ تم کو تمہارے دین سے پھیرنے کے لیئے ایذا نہ دے سکیں، اور تم شرک میں نہ پڑو۔

"یکون الدین للہ" کا فقرہ بھی اُنھی آیتوں کے ساتھ ہی جو مشرکین عرب کے حملہ کے دفعہ کرنیکو لڑنے کی بابت نازل ہوئی ہیں۔ اِسکے یہ معنی سمجھنے کہ اتنا لڑنا چاہیئے کہ اسلام کے سوا کوئی دین نہ رہے یہ تو محض نادانی کی بات ہے جو سلف سے آج تک نہ کبھی ہوئی اور نہ ہونے کی توقع ہو سکتی ہے۔ اِسکے معنی صاف صاف یہ ہیں کہ اسقدر لڑنا چاہیئے کہ اللہ کے دین کے بجالانے میں جو کافر ہرج ڈالتے ہیں وہ نہ رہے، اور اللہ کے لیئے دین ہو جاوے کہ مسلمان خدا کے لیئے اُسکو بے ایذا کے بجالاسکیں۔

(۱۹۲) (واتموا الحج والعمرۃ للہ) اس آیت سے حج کے احکام شروع ہوئے ہیں، مگر قبل اسکے کہ ہم اسکی بابت اور اُسکے اسرار پر بحث کریں پہلے سیدھی سادی طرح سے بتا دینا چاہیئے کہ مسلمان عمرہ اور حج کیونکر کرتے ہیں اور یہہ بتانا چاہیئے کہ جو کچھ حج میں کیا جاتا ہے اُس میں سے قرآن مجید میں کس کس چیز کا ذکر ہے۔

حج میں اتنی چیزیں ہیں، احرام و نیت، طواف قدوم، سعی بین الصفا والمروۃ، خروج منیٰ، وقوف عرفہ، [illegible] طواف الزیارت، طواف الصدر، چنانچہ ہم ان میں سے ہر ایک چیز کو علیحدہ بیان کرتے ہیں۔

وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۫ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۭ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَھْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۱۹۲)

احرام اور نیت حج

احرام باندھنے کے لئے مقامات معین ہیں جو میقات کہلاتے ہیں۔ مکہ کے رہنے والوں کیلئے خاص حرم کعبہ میقات ہے، اور مدینہ کی طرف سے آنیوالوں کو ذوالحلیفہ اور عراق کی طرف سے آنے والوں کے لئے ذات عرق، اور شام کی طرف سے آنے والوں کیلئے جحفہ اور نجد کی طرف سے آنیوالوں کے لئے قرن، اور یمن کی طرف سے آنیوالوں کے لئے جس میں ہندوستان سے جانیوالے بھی داخل ہیں یلملم میقات پر پہونچکر صرف حج کی یا صرف عمرہ کی یا حج اور عمرہ دونوں کی نیت سے احرام باندھا جاتا ہے۔ احرام کے معنی ایسے بزرگ اور مقدس کام کے شروع کرنے کے ہیں جسکا ادب نہ توڑا جاسکے۔ احرام میں صرف ایک چادر بطور تہبند کے باندھتے ہیں، اور ایک چادر اوڑھنے کیلئے ہوتی ہے۔

مگر سر پر چادر نہیں اوڑھی جاتی سر کھلا رہتا ہے۔ چادر ایک پاٹ کی ہو خواہ پاٹ کی سی ہوئی کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ قطع کیا ہوا کپڑا جو قینچی سے قطع کرکے سیتے ہیں پہننا منع ہے۔

میقات پر پہونچکر غسل کیا جاتا ہے یا وضو اور اسکے بعد نیت کرکے احرام باندھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں لبیک اللھم لبیک لاشریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک والملک لاشریک لک لبیک، اور ہر نماز کے بعد یا جب اونچی جگہہ چڑھے یا نیچی جگہہ اترے تو یہی جملہ کہنا چاہیئے۔

اور اپنے سروں کو مت منڈاؤ جبتک کہ پہونچے قربانی اپنی جگہ، پھر تم میں سے جو شخص کہ بیمار ہو یا اُسکے سر میں کچھ دکھ ہو تو اُسکا بدلا ہے روزہ یا صدقہ یا قربانی کے ساتھ پھر جب تم امن میں ہو تو جو شخص فائدہ اُٹھاوے عمرہ کے ساتھ حج کا تو جو کچھ میسر ہو قربانی سے (وہ کرے) پھر جو شخص کہ نپاوے تو تین روزے حج کے دنوں میں ہیں اور سات جبکہ تم پھرو یہ پورے دس ہوئے، یہ اُسکے لئے ہے جسکے اہل (وعیال) مسجد حرام کے رہنے والے نہوں، اور ڈرو اللہ سے اور جان لو کہ بیشک اللہ سخت عذاب کرنیوالا ہی (۱۹۲)

زمانہ احرام میں سر کو ڈہانکنا، یا ایسا کپڑا جو قطع ہو کر سیا گیا ہو پھننا، موزہ یا جراب ہی یا دستانے ڈھانکنا، شکار کھیلنا یا دوسرے کو شکار بتانا، سر منڈانا، ناخن ترشوانا، عورت کے پاس جانا منع ہے۔

طوافِ قدوم

جب مکہ میں پھونچے اور حرم کعبہ دکھائی دی تو کہے "اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد"۔

جب حرم کے اندر جائے حجر اسود کے سامنے کھڑا ہو، اگر ممکن ہو تو اُسکو بوسہ دے ورنہ ہاتھ سے بوسہ لینے کا اشارہ ہی کرلے، اور کعبہ کے گرد گھومنا شروع کرے، اور جب حجر اسود کے سامنے آوے یا اُسکا بوسہ لے یا اُسی طرح سے اشارہ کرے۔ سات مرتبہ گھومے اور کوئی دعا جو اُسکا جی چاہے پڑہتا رہے، اور اُس گھومنے میں تیز مونڈھے ہلا کر چلے۔

سات دفعہ گھومنے کے بعد جسکو طواف کہتے ہیں مقام ابراہیم میں دو رکعت نماز کی پڑھے۔

سعی بین الصفا والمروہ

اُسی دن طواف کے بعد صفا و مروہ میں جو نہایت چھوٹے چھوٹے پہاڑ ہیں سات دفعہ پھرے۔ صفا کی پہاڑی پر چڑھے، اور کعبہ کیطرف منھہ کر کے کہے "اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد۔ اللھم صل علی محمد وعلی ال محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی ال ابراھیم انک حمید مجید"، اسکے بعد جو دعا چاہے مانگے، اور صفا پر سے

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۚ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ (۱۹۳)

اتر کر مروہ کو جاوے۔ اس رستہ میں دو نشان بنے ہوئے ہیں اُن نشانون کے بیچ میں دوڑ کر چلے۔ جب مروہ پر چڑھے تو کعبہ کی طرف منہہ کر کے وہی تمام جملہ جو صفا پر پڑہا تھا پڑہے۔ یہ ایک دوڑ ہوئی جسکو ایک شوط کہتے ہیں۔ اسی طرح سات دفعہ کرے۔ ساتوین دوڑ مروہ پر ختم ہوگی۔

اگر احرام باندہتے وقت صرف عمرہ کی نیت کی ہے تو عمرہ ختم ہوگیا۔ احرام کہولدے اور پہر آٹھوین ذیحجہ کو حرم کے اندر جاکر حج کا احرام باندہے۔ اور اگر حج اور عمرہ دونون کی اکٹھی نیت کی ہو یا صرف حج کی نیت کی ہو تو بدستور احرام باندہے رہے

خروج منیٰ

جو لوگ عمرہ ادا کر کے احرام سے خارج ہوگئے ہیں اُنکو چاہیئے کہ حرم میں جا کر صبح کی نماز پڑہیں اور حج کا احرام باندہیں اور منیٰ کو روانہ ہوں اور جن لوگوں نے احرام نہیں کھولا وہ صبح کی نماز کے بعد منیٰ کو روانہ ہوں۔ رات کو منیٰ میں رہیں۔ نوین تاریخ صبح کی نماز کے بعد علی الصباح عرفات کے میدان میں جاویں، اور غروب آفتاب تک اُسی میں رہیں، اور جو دعائیں چاہیں مانگتے رہیں، وہان امام اونٹنی پر چڑہکر خطبہ پڑہتا ہے، اور لوگوں کو نیکی اور خدا پرستی کی نصیحت کرتا ہے، اور ہزارون لوگ اُسکے گرد کھڑے ہو کر سنتے ہیں اور جو نہیں سن سکتے وہ اپنی ہی جگہ دعا وغیرہ پڑہتے ہیں۔

وقوف مزدلفہ

مغرب کی نماز کے بعد اُس میدان سے لوگ روانہ ہوتے ہیں، اور مزدلفہ کے میدان میں آکر رات بسر کرتے ہیں۔

منیٰ اور رمی جمار

دسوین ذیحجہ کو مزدلفہ سے چلکر منیٰ میں پہونچتے ہیں منیٰ کے میدان میں تین ستون بطور نشان کے بنے ہوئے ہیں ہر ایک ستون پر سات سات کنکریان ایک ایک کر کے مارتے ہیں، اور ہر کنکری کے مارنے کے وقت یہ پڑہتے ہیں "اللہ اکبر" "لا الٰہ الا اللہ اللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد"

حج کے لئے مہینے معلوم ہیں پس جس شخص نے کہ اُن مہینوں میں اپنے پر حج فرض کیا تو حج میں
نہ عورتوں سے مخالطت کرنی چاہیئے اور نہ بدکاری اور نہ لڑائی اور جو کچھ تم نیکی کرتے ہو اُسکو
اللہ جانتا ہے اور توشہ لو پھر بیشک اچھا توشہ پرہیزگاری ہے اور مجھ سے ڈرو اے عقل والو (۱۹۳)

جب تینوں ستونوں پر کنکریاں ماریں تو ہر بلندی و پستی پر اور نماز کے بعد جو لبیک کہتا تھا وہ کہنا موقوف کر دے" اور جمرۃ العقبہ کے پاس ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے وہاں قربانی کرے" اور سر منڈوائے یا بال کتروائے اور احرام کھولدے اور کپڑے پہن لے" مگر عورت کے پاس جانے کی ابتک اجازت نہیں ہے۔

گیارہویں اور بارہویں کو بدستور منٰی میں رہے" اور دونوں دن بھی اُن تینوں ستونوں کو سات سات کنکریاں اُسی طرح مارے جسطرح کہ دسویں تاریخ کو ماری تھیں۔

طواف الزیارت

انہی تاریخوں میں یعنی دسویں یا گیارہویں یا بارہویں کو قربانی کے بعد منٰی سے حرم میں آوے اور خانہ کعبہ کا طواف اُسی طرح کرے جس طرح اوپر بیان ہوا" اور پھر منٰی میں چلا جاوے۔ بعد اُسکے اپنے کام میں لگے اور جو چاہے سو کرے" اگر کسی نے طواف قدوم کے بعد سعی بین الصفا و المروہ نہ کی ہو تو اُسکو اس طواف کے بعد کرنی چاہیئے۔

طواف الصدر

جو لوگ اور ملکوں سے حج کرنیکو آئے ہیں اور حج کے بعد واپس جانا چاہتے ہیں تو اُنکو صرف طواف کر کے روانہ ہونا چاہیئے

اقسام حج

حج تین قسم ہے۔ افراد" قران" تمتع۔ اگر صرف حج کی نیت سے احرام باندھا ہے اُسکا نام تو حج افراد ہے" اور اگر حج اور عمرہ دونوں کی نیت سے احرام باندھا ہے اُسکا نام قران ہے۔ اور اگر صرف عمرہ کی نیت سے اور عمرہ کرنے کے بعد پھر حج کی نیت سے احرام باندھا ہے" تو حج تمتع ہے۔

حج افراد اور تمتع کی تو بالکل وہی صورت ہے جو بیان ہوئی" الا حج قرآن میں اسقدر فرق ہے کہ طواف قدوم اور سعی بین الصفا و المروہ دو دو دفعہ کرنی لازم ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ ﴿۱۹۴﴾ ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۹۵﴾

ارکانِ حج جو قرآن مجید مین مذکور ہین

میقات کا ذکر قرآن مجید مین نہیں ہے۔ غالبًا جو لوگ باہر سے کعبہ کی زیارت کو یا حج کو آتے تھے، اور جب قریب پہونچتے تھے تو حج کی نیت سے ایسی باتوں کے کرنے سے جنکو تقدس اور ادب کے برخلاف سمجھتے تھے اجتناب کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ مقامات بطور میقات قرار پا گئے، اور زمانہ کے گذرنے پر انہی مقامات سے مسافروں کا احرام میں داخل ہونا ایک امر لازمی اور ضروری قرار پا گیا۔ اگر کوئی شخص بلا ارادہ حج اور بغیر باندھے احرام کے میقات پر مکہ میں چلا جاوے، اور مکہ میں پہونچنے کے بعد حج کا ارادہ کرے اور احرام باندھے، تو اُسکے حج میں بھی کوئی نقص نہیں ہونیکا۔

احرام کے وقت تہبند باندھنے اور بغیر قطع کیا ہوا کپڑا پہننے کا بھی قرآن مجید میں ذکر نہیں ہے۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اُسکا رواج زمانۂ جاہلیت سے برابر چلا آتا تھا، اور اسلام میں بھی قایم رہا۔ یہ پوشاک جو حج کے دنوں میں پہنی جاتی ہے ابراہیمی زمانہ کی پوشاک ہے۔ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں دنیا نے سویلزیشن میں جو تمدنی امور سے علاقہ رکھتی ہے کچھ ترقی نہیں کی تھی۔ وہ قطع کیا ہوا کپڑا پہننا نہیں جانتے تھے۔ اُس زمانہ کی پوشاک یہی تھی کہ ایک تہبند باندھ لیا۔ کسیکو اگر کچھ زیادہ میسر ہوا تو ایک ٹکڑا کپڑے کا بطور چادر کے اوڑھ لیا۔ سر کو ڈہانکنا اور قطع کیا ہوا کپڑا پہننا کسی کو نہیں معلوم تھا۔ پس جو اس بڈھے خدا پرست کی عبادت کی یادگاری میں قایم ہوا تھا جسنے بہت سوچ بچار کر کہا تھا، "انی وجہت وجہی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین"، تو اس عبادت کو اُسی طرح اور اُسی لباس میں ادا کرنا قرار پایا تھا جسطرح اور جس لباس میں اُسنے کی تھی۔ محمد

تم پر کچھ گناہ نہیں ہے کہ (موسم حج میں) تلاش کرو فضل (یعنی روزی) اپنے پروردگار سے پھر جب کہ تم پھرو عرفات سے تو ذکر کرو اللہ کا مشعر حرام (یعنی مسجد حرام) کے پاس اور اللہ کا ذکر کرو جس طرح کہ تم کو ہدایت کی ہے اور اگرچہ اُس سے پہلے البتہ تم گمراہوں میں سے تھے (۱۹۴) پھر پھرو جہاں سے لوگ پھرتے ہیں اور اللہ سے بخشش چاہو بیشک اللہ بخشنے والا ہی مہربان (۱۹۵)

رسول اللہ نے شروع سویلزیشن کے زمانہ میں بھی اُسی وحشیانہ صورت اور وحشیانہ لباس کو ہمارے بڈھے دادا کی عبادت کی یادگاری میں قایم رکھا۔

احرام میں داخل ہونے اور حج کی نیت یعنی حج کے قصد کرنیکا اشارہ قرآن مجید کے ان لفظوں سے کہ "فمن فرض فیھن الحج" پایا جاتا ہے۔

احرام کے دنوں میں جنگل کے جانوروں کے شکار کی ممانعت بھی قرآن سے پائی جاتی ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے "یاایھا الذین امنوا لاتقتلوا الصید وانتم حرم۔ احل لکم صید البحر وطعامہ متاعا لکم وللسیارۃ وحرم علیکم صید البر مادمتم حرما"۔

احرام کے دنوں میں لڑائی اور فساد اور عورت کے پاس جانے کی ممانعت بھی قرآن کی اس آیت سے پائی جاتی ہے۔ "فمن فرض فیھن الحج فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج"

احرام اور ارکان کے ختم ہونے تک سر منڈانے کی ممانعت کا بھی اشارہ اِس آیت سے نکلتا ہی "ولا تحلقوا رؤسکم حتی یبلغ الھدی محلہ"

طواف کا اور اُس میں ذکر اللہ کرنے کا اشارہ بھی قرآن سے پایا جاتا ہے جیسا کہ اِن آیتوں میں ہے "ولیطوفوا بالبیت العتیق"

"فاذکروا اللہ عند المشعر الحرام" مگر سات دفعہ پھرنیکا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ غالباً ایام جاہلیت سے برابر چلا آتا ہے

سعی بین الصفا والمروۃ جسطرح ایام جاہلیت میں لوگ کرتے تھے اسی طرح اب بھی کرتے ہیں۔ اسکا بھی اشارہ قرآن مجید میں موجود ہے جہاں فرمایا ہے "ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ فمن حج البیت

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (۱۹۶)

او اعتمر فلا جناح علیہ ان یطوف بہما"

عرفات میں جانیکا بھی قرآن کی اس آیت سے اشارہ پایا جاتا ہے "فاذا افضتم من عرفات فاذکروا اللہ عند المشعر الحرام"

مزدلفہ میں رہنے اور منیٰ میں ایام تشریق تک ٹھیرنے کا بھی اشارہ ان آیتوں سے پایا جاتا ہے "ثم افیضوا من حیث افاض الناس" "واذکروا اللہ فی ایام معدودات فمن تعجل فی یومین فلا اثم علیہ ومن تاخر فلا اثم علیہ"

قربانی جو حج میں کیجاتی ہے اُسکا ذکر بھی قرآن میں ہے۔ وہ قربانی تین طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو جانور کو ساتھ لے کر جاتے ہیں اس ارادہ سے کہ مکہ میں جاکر ذبح کرینگے۔ اُسکا ذکر تو اس آیت میں ہے "والبدن جعلناھا لکم من شعائر اللہ لکم فیہا خیر فاذکروا اسم اللہ علیہا صواف فاذا وجبت جنوبہا فکلوا منہا واطعموا القانع والمعتر"

دوسری قسم قربانی کی وہ ہے جو حج تمتع میں کی جاتی ہے اور اُسکا ذکر اس آیت میں ہے "فاذا امنتم فمن تمتع بالعمرۃ الی الحج فما استیسر من الہدی فمن لم یجد فصیام ثلاثۃ ایام فی الحج وسبعۃ اذا رجعتم"

تیسری قربانی عام طور پر حج کے بعد ہے اور اُسکا ذکر اس آیت میں ہے "ویذکروا اسم اللہ من ایام معلومات علی ما رزقہم من بہیمۃ الانعام فکلوا منہا واطعموا البائس الفقیر"۔

حجر اسود اور رمی جمار کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ حجر اسود کعبہ کے ایک کونے میں لگایا گیا تھا اُس سے مقصد صرف یہ تھا کہ طواف کی تعداد معلوم رہے۔ اُسی کونے سے طواف شروع ہوتا ہے اور اُسی مقام پر ختم ہوتا ہے اور حجر اسود کو چھو لیا جاتا ہے یا بوسہ دیا جاتا ہے یا اُسکی طرف اشارہ کر لیا جاتا ہے جس سے معلوم ہو کہ ایک طواف ختم ہوا۔ رمی جمار کی کوئی ٹھیک وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ تمام ارکان حج اسلام میں وہی بحال رہے

پھر جب تم پورے کرچکو اپنے ارکان حج، پھر یاد کرو اللہ کو جسطرح کہ یاد کرتے ہو تم اپنے باپ دادا کو یا اُس سے زیادہ یاد کرنا، پھر لوگوں میں سے کوئی کہتا ہے کہ اے ہمارے پروردگار ہمکو دے دنیا میں، اور نہیں ہے اُسکو آخرت میں کچھ حصہ (۱۹۶)

جو زمانہ جاہلیت میں تھے، اور اسلئے کہا جاسکتا ہے کہ وہی رسم رمی جمار کی جو زمانہ جاہلیت میں تھی اسلام میں بھی مثل دیگر ارکان حج کے عمل در آمد رہی۔

حج کی حقیقت

جبکہ حضرت اسمٰعیل مکہ میں آباد ہوئے، اور ابراہیم اور اسمٰعیل نے کعبہ کو بنایا، تو اور قومیں جو گرد نواح میں خانہ بدوش پھرتی تھیں وہاں آکر آباد ہوئیں، اور جیسا کہ دستور ہے اس مقدس مسجد کی زیارت کو لوگ آنے لگے۔ وہاں کوئی زیارت کی چیز بجز بے چھت کی مسجد کی دیواروں کے اور کچھ نہ تھی۔ جو کچھ زیارت تھی وہ یہی تھی کہ لوگ جمع ہو کر اُس زمانہ قدیم کے وحشیانہ طریقہ پر خدا کی عبادت کرتے تھے، ننگے سر تہبند بندہا ہو لنگ دھڑنگ اُن دیواروں کے گرد جو خدا کے گھر کے نام سے بنائی گئی تھیں اُچھلتے اور کودتے اور حلقہ باندھکر چوگرد پھرتے تھے، جسکا اب ہمنے طواف نام رکھا ہے۔

حضرت ابراہیم نے بغرض آبادی مکہ اور ترقی تجارت یہ بات چاہی کہ لوگوں کے آنے اور زیارت کرنے اور اُس مقام پر عبادت معبود کی بجالانے کے لئے ایام خاص مقرر کئے جائیں، تاکہ لوگوں کے متفرق آنے کے بدلے موسم خاص میں مجمع کثیر ہوا کرے، اور سب ملکر خدا کی عبادت بجالاویں، اور مکہ کی آبادی اور تجارت کو ترقی ہو۔

اس امر کا ذکر قرآن مجید میں بھی موجود ہے جہاں حضرت ابراہیم کو کہا ہے کہ، "حج کو لوگوں میں مشہور کردے تیرے پاس پیدل اور دُبلی اونٹنیوں پر سوار ہو کر ہر ایک دور دراز رستے سے لوگ آئینگے تاکہ اپنے فائدوں کے لئے موجود ہوں"، تفسیر ابن عباس میں "لیشھدوا منافع لھم" کی تفسیر میں لکھا ہے "منافع الدنیا و الاخرۃ و منافع الاخرۃ بالدعاء و العبادۃ و منافع الدنیا بالبیع و التجارۃ" یعنی منافع سے دنیا اور آخرت دونوں کے منافع مراد ہیں۔ آخرت کا منافع دعا مانگنے اور عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے،

> اذ بوانا لابراھیم مکان البیت ان لا تشرک بی شیئا و طھر بیتی للطائفین والعاکفین والرکع السجود واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالا و علی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق لیشھدوا منافع لھم (سورۃ حج)

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۷﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۸﴾

اور دنیا کا منافع فائدہ اُٹھانے اور تجارت سے۔

آنحضرت صلعم نے بھی اِس رسم کو اُنہی اغراض کے لئے جاری رکھا جس غرض سے کہ حضرت ابراہیم نے مقرر کی تھی جسکا اشارہ اس آیت میں ہے "لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم" یعنی حج کے دنوں میں اگر تم تجارت سے روزی کمانے کی تلاش کرو تو تم پر کچھ گناہ نہیں ہے پس یہ سمجھنا کہ بانی اسلام نے کعبہ شریف کو مثل پارس پتھر کے قرار دیا تھا کہ جسنے اسکو چھوا اور سونا ہو گیا یہ ایک غلط خیال ہے۔ ابراہیم اور اسمٰعیل کی بنائی ہوئی مسجد میں لوگ نماز پڑھنے کو آتے تھے اور ابراہیمی طریقہ پر نماز پڑھتے تھے۔ جو سختی اور اضطراب کہ اسمٰعیل اور اُسکی ماں ہاجرہ پر صفا و مروہ کے مقام پر پانی کی تلاش میں گذرا تھا، اور اُس بیقراری کی حالت میں جسطرح اُسنے اپنے خدا کو یاد کیا تھا اور دعا مانگی تھی اُسکی یادگار میں وہی حالت اپنے پر طاری کرتے ہیں، اور خدا کی عبادت کا اپنے دل میں جوش پیدا کرتے ہیں موسم حج کا صرف تجارت کی نظر سے مقرر کیا گیا تھا تاکہ قوم اُس سے فائدہ اُٹھاوے، اور اُن ایام میں عرب کی قومیں قافلوں کے لوٹنے اور آپس میں لڑائی جھگڑوں سے باز رہیں۔

وہی تمام طریقے جو حج کی نسبت ابراہیم کے وقت سے چلے آتے تھے محمد رسول اللہ صلعم نے بھی قایم رکھے اس میں دنیاوی منفعت کے سوا روحانی بھی بہت بڑی تربیت ہے۔ اول اُس بزرگ کی سالانہ یادگاری ہے جو دنیا کی قوموں کے لئے اور خدائے واحد کا نام دنیا میں پھیلانے اور فطرت اسلام دین اللہ کو تمام دنیا میں شایع کرنے کا باعث ہوا۔ ایسے بزرگوں کی یادگاری قایم رکھنا، اور اُنکے پُرانے تاریخی واقعات کو زندہ کرنا اُنکے دائمی احسانوں کا اعتراف کرنا ہے، اور اِس بات کا ہمیشہ یاد رکھنا ہے کہ خدا نے کسطرح انسان تک اپنی برکت اور اپنا فضل پہونچایا تھا۔ یہ یادگاری آیندہ اُنہی نیکیوں اور فوائد کے جاری رکھنے میں بہت بڑی مددگار ہوتی ہے اور انسان کے دل کو نرم اور نیکیوں کی طرف راغب رکھتی ہے۔ ہمت بلند ہوتی ہے، دل اور روحانی قوت نیکیاں کرنے پر تازہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے تمام ارکان حج میں بجز ابراہیمی طریقہ کی نماز اور دعا اور خدا کی عبادت کے

اور اُن میں سے کوئی کہتا ہے کہ اے ہمارے پروردگار ہمکو دے دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھلائی اور بچا ہمکو آگ کے عذاب سے (۱۹۷) یہی لوگ ہیں کہ اُنکے لئے حصہ ہے اُس میں سے جو اُنھوں نے کمایا اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے (۱۹۸)

اور کچھ نہیں ہے، اور جبکہ وہ ایسے مقام پر کیجاتی ہے جسکے تاریخی واقعات صرف خیال ہی سے دل پر بہت بڑا اثر پیدا کرتے ہیں، اور جبکہ وہ ایک بہت بڑے جم غفیر کے ساتھ ادا کیجاتی ہے جو دور دراز رستوں اور مختلف ملکوں سے آکر خدا کی عبادت کے لئے جمع ہوئے ہیں تو صرف اُس ہیئت مجموعی ہی سے جو اثر دل پر اور انسان کی روح پر پڑتا ہے وہ کسی اور طرح پر ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک عملی طریقہ روحانی تربیت کا ہے جسکی مثل کوئی دوسرا طریقہ دنیا میں نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ چند روز کے لئے اُس وحشیانہ حالت میں زندگی بسر کرنی جو اُس بڈہے دادا کے زمانہ میں تھی بہت قوی اثر خدا کی محبت کا دل میں پیدا کرتی ہے۔ سویلیزیشن کے زمانہ میں جبکہ نیک دلی اور سچائی اور خدا پرستی اور خدا کے احسانات کی یادگاری میں وہی وحشیانہ سوانگ بھرا جاوے تو اُسکا نہایت قوی اثر دل پر ہوتا ہے خصوصاً جبکہ وہ ایک گروہ کثیر کے مجمع کے ساتھ ہو اور مجمع کا مجمع ایک شخص یا ایک ذات پاک کی یادگاری میں دیوانہ وار مستغرق ہو۔

انسویلیزڈ زندگی بھی ایک طرح پر نہایت عمدہ ہوتی ہے، اور دل کی سادگی اور بیگناہ زندگی کے سبب سے تقدس کی طرف زیادہ میلان رکھتی ہے، اور خیالات کو بن سمجھے خدا کی طرف زیادہ رجوع کرتی ہے۔ بے سمجھا یقین دل پر بہت بڑا اثر کرتا ہے۔ اُسکے بعد شک کا دور دورہ آتا ہے۔ جبتک کہ وہ مٹ نہ جاوے اور سمجھنے کے بعد دل پر یقین کا تسلط نہ ہو۔ پس اُس پاک خدا کی چند روزہ عبادت کے لئے اُسی مقدس زندگی کو اختیار کرنا روحانی تربیت کے لئے نہایت مفید ثابت ہوتا ہے۔

حقیقت حج کی ہماری سمجھ میں یہ ہے جو ہمنے بیان کی۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اُس پتھر کے بنے ہوئے چوکھونٹے گھر میں ایک ایسی متعدی برکت ہے کہ جہاں سات دفعہ اُسکے گرد پھرے اور بہشت میں چلے گئے یہ اُنکی خام خیالی ہے۔ کوئی چیز سوای خدا کے مقدس نہیں ہے۔ اُسی کا نام مقدس ہے اور اُسی کا نام مقدس رہے گا اُس چوکھونٹے گھر کے گرد پھرنے سے کیا ہوتا ہے۔ اُس کے گرد تو اونٹ اور گدہے بھی پھرتے ہیں،

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰى وَاتَّقُوا

اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ

يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ

وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۰﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ

فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۱﴾

وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ

جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۲﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ

مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ

اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۴﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ

الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۵﴾

وہ تو کبھی حاجی نہ ہوئے بیچ دو پاؤں کے جانور کو اُسکے گرد پھیر لینے سے ہم کیونکر حاجی جانیں۔ ہاں جو حقیقتاً حج کرے وہ حاجی ہے۔

اور یاد کرو اللہ کو گنے ہوئے دنوں میں (یعنی ایام تشریق میں جو پانچ دن ہیں ۹ سے ۱۳ تک) پھر جس شخص نے کہ جلدی کی (کوچ کر نیمیں) دو دن میں تو اُس پر کچھ گناہ نہیں اور جس نے کہ تاخیر کی (کوچ کرنیمیں) تو اُسپر بھی کچھ گناہ نہیں اُس شخص کے لئے جو پرہیزگاری کرتا ہے اور ڈرو اللہ سے اور جان لو کہ بیشک تم اُسکے پاس اکٹھے کئے جاؤ گے (۱۹۹) اور لوگوں میں سے وہ شخص ہے کہ اُسکی بات تجھکو دنیا کی زندگی کے تعجب میں ڈالتی ہے اور اللہ کو گواہ لاتا ہے اُس چیز پر جو اُسکے دل میں ہے حالانکہ وہ بڑا جھگڑالو ہے (۲۰۰) اور جب پیٹھ موڑتا ہے تو ملک میں کوشش کرتا ہے تاکہ اُسمیں فساد کرے اور ضایع کرے کھیتی کو اور مویشی کو اور اللہ نہیں دوست رکھتا فساد کو (۲۰۱) اور جبکہ اُس سے کہا جاوے کہ ڈر خدا سے تو اُسکو پکڑ لیتا ہے تکبر گناہ پر پھر کافی ہے اُسکو جہنم اور البتہ وہ بُری جگہ ہے (۲۰۲) اور بعض آدمی وہ ہیں جو بیچتے ہیں اپنے آپ کو خدا کی رضامندیوں کی طلب میں اور اللہ بندوں پر مہربان ہے (۲۰۳) ای لوگو جو ایمان لائے ہو داخل ہو اسلام میں سب کے سب اور مت پیروی کرو شیطان کی قدموں کی بیشک وہ تمہارا دشمن ہے علانیہ (۲۰۴) پھر اگر تم ڈگمگا جاؤ بعد اسکے کہ تمہارے پاس آئی ہیں نشانیاں تو جان لو کہ بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا (۲۰۵)

اس بیان سے حج کے ارکان کی بھی حقیقت بخوبی واضح ہوئی ہوگی۔ احرام باندھنا ابراہیمی زمانہ کی صورت کا بتانا ہے۔ طواف کرنا کعبہ کی دیواروں کے گرد صدقے ہونا نہیں ہے بلکہ درحقیقت وہ اُس طریقہ پر تنازع ہے جو

هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ
وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿۲۰۶﴾ سَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ
كَمْ آتَيْنَاهُم مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ وَمَن يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ
فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۲۰۷﴾ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا
وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۰۸﴾ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً
وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ
مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا
اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ
بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ
الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۲۰۹﴾

ابراہیمی زمانہ میں اُس جو کھوسنتے گھر کے گرد پڑ ہی جاتی تھی۔ صفا و مروہ میں سعی کرنا اسمٰعیل اور ہاجرہ
کے استقلال اور خدا پر کامل یقین کو یاد کرنا ہے، کہ اُس اضطرار اور اضطراب کی حالت میں بھی جو پانی کی
تلاش میں وہاں اُن پر گذری تھی اُنھوں نے نہیں چھوڑا تھا، اور ایسی حالت میں بھی خدا ہی پر اُنھوں
نے بھروسہ کیا۔ پس اُس یقین کو یاد کر کے اپنے دل کو خدا کی محبت میں زیادہ تر قوی کرنا ہے۔

کیا وہ (کسی اور بات کا) انتظار کرتے ہیں بجز اسکے کہ آوی اُنکے لئے اللہ سفید بادلونکی سایون میں اور فرشتے، اور پورا کر دیا جاوی کام اور اللہ ہی کیطرف سب کام رجوع کرتے ہیں (۲۰۶) پوچھ بنی اسرائیل سی کہ ہمنی اُنکو صحیح نشانیوں میں سی کسقدر دیں اور جو کوئی بدل ڈالی اللہ کی نعمت کو بعد اسکے کہ اُسکے پاس آچکی ہو تو بیشک اللہ تعالی سخت عذاب کرنیوالا ہی (۲۰۷) آراستہ کیگئی ہی اُن لوگوں کیلئے جو کافر ہوئے دنیا کی زندگی، اور وہ ٹھٹھا کرتے ہیں اُن لوگوں سی جو ایمان لائے ہیں، اور جو لوگ پرہیزگار ہیں قیامت کی دن اُن سے بالاتر ہونگے، اور اللہ رزق دیتا ہی جسکو چاہتا ہی بیحساب (۲۰۸) سب آدمی ایک گروہ تھی پھر بھیجا اللہ نے نبیون کو بشارت دینیوالی اور ڈرانیوالی اور اُنکے ساتھہ برحق کتاب اُتاری تاکہ لوگوںمیں اُس بات میں جسمیں وہ مختلف ہو گئی ہیں حکم دیں، اور اُس میں اختلاف نہیں کیا اُن لوگوں نے جنکو کتاب دیگئی تھی بعد اسکے کہ اُنکے پاس نشانیاں آگئیں مگر آپس کے حسد سی، پھر ہدایت کی اللہ نی اپنی مرضی سی حق بات کی اُن لوگوں کو جو اُس میں ایمان لائے جسمیں کہ اُنھوں نی اختلاف کیا تھا، اور اللہ ہدایت کرتا ہے جسکو چاہی سیدھی رستہ کی (۲۰۹)

حج میں قربانی کی کوئی مذہبی اصل قرآن مجید سے نہیں پائی جاتی- مکہ ایک بیابان غیر ذی زرع تھا اسقدر لوگون کے جمع ہونے سے خوراک کا میسر آنا مشکل تھا- اسلئے اکثر لوگ خوراک کے لئے جانور اپنے ساتھہ لیجاتے تھے جو بدن اور قلائد کے نام سے مشہور تھے، اور جو نہ لیجاتے تھے وہ مکہ میں خریدتے تھے، اُنکو ذبح کرکے خود بھی کھاتے تھے اور لوگوں کو بھی کھلاتے تھے حج میں صرف

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِيۡنَ
خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰى
يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ (۲۱۰)
يَسۡـئَلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ قُلۡ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ فَلِلۡوَالِدَيۡنِ
وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ
خَيۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ (۲۱۱) كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ وَهُوَ
كُرۡهٌ لَّكُمۡ (۲۱۲) وَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡــًٔا وَّهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ وَعَسٰۤى
اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡــًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمۡ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ (۲۱۳)
يَسۡـئَلُوۡنَكَ عَنِ الشَّهۡرِ الۡحَرَامِ قِتَالٍ فِيۡهِ قُلۡ قِتَالٌ فِيۡهِ كَبِيۡرٌ
وَصَدٌّ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَكُفۡرٌۢ بِهٖ وَالۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ

یہی اصل قربانی کی قرآن مجید سے پائی جاتی ہے، جہاں خدا نے فرمایا ہے "فکلوا منها واطعموا البائس
الفقیر" "لکم فیها منافع الی اجل مسمی ثم محلها الی البیت العتیق" "والبدن جعلنها
لکم من شعائر الله لکم فیها خیر فاذکروا اسم الله علیها صواف فاذا وجبت جنوبها
فکلوا منها واطعموا القانع والمعتر" وہاں نہ کوئی دیوتا ہوتا ہے نہ دیبی ہے نہ پہاڑ پر کوئی چیز ہی جس پر بکرا
یا مینڈھا یا اونٹ چڑھایا جاوے۔ نہ خدا کو اسکی بو خوش آتی ہے، نہ اسکا خون پیتا ہے، نہ اسکی جان لینے سے خوش ہوتا
ہے۔ بلکہ وہ تو صرف نیکی اور بھلائی چاہتا ہے، جیسے کہ خود اُسنے کہا ہے "لن ینال الله لحومها ولا دماؤها"

(اے ایمان والو) کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم داخل ہو گے جنت میں حالانکہ تم پر (ویسی مصیبت) نہیں آئی ہو جیسے کہ اُن لوگوں پر (آئی تھی) جو تم سے پہلے گذر گئے اُنکو خوف نے پکڑا اور تکلیف نے، اور کپکپا دئے گئے یہاں تک کہ رسول نے اور اُن لوگوں نے جو اُسپر ایمان لائے تھے کہا کہ کب خدا کی مدد ہوگی جان لو کہ بیشک اللہ کی مدد قریب ہے ⑳ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کسطرح (اپنا مال) خرچ کریں، تو کہدے کہ جو کچھ تم مال میں سے خرچ کرو تو ماں باپوں اور قرابت مندوں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے (خرچ کرو) اور جو نیکی تم کرتے ہو تو بیشک اللہ اُسکا جاننے والا ہے ㉑ لکھی گئی تم پر لڑائی، اور وہ بُری معلوم ہوتی ہے تمکو ㉒ اور شاید جس چیز کو تم بُرا جانتے ہو اور وہی بہتر ہو تمہارے لئے، اور شاید جس چیز کو تم دوست رکھتے ہو وہی بُری ہو تمہارے لئے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ㉓ تجھ سے پوچھتے ہیں حرمت والے مہینے میں لڑنے سے تو کہدے کہ اُسمیں لڑنا بڑا ہے اور خدا کی راہ سے روکنا ہے اور اُسکے ساتھ کفر کرنا ہے، اور مسجد حرام سے (روکنا ہے)

ولکن ینالہ التقویٰ منکم۔ پس اُس زمانہ میں جو حج کے دنوں میں حاجت سے زیادہ قربانی کی رسم ہے اور لاکھوں جانور ذبح کرکے جنگل میں ڈالتے ہیں، جنکو گیدڑ اور کوّے بھی نہیں کھاتے اُسکا کچھ بھی نشان مذہب اسلام میں نہیں ہے۔ خدا نے حج ادا کرنے کی زیادہ سختی انسان پر نہیں کی اور ہر شخص کی استطاعت پر اُسکو منحصر کیا ہے، جو نہایت وسیع معنی رکھتا ہے، وہ بھی تمام عمر میں ایک دفعہ اگر ہو سکے۔

وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ
وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا
وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ
حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ
جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۚ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ
كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۚ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ
مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ قُلِ الْعَفْوَ ۚ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ
لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى
قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ﴿۲۱۸﴾ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۚ وَاللّٰهُ
يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۚ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ
حَكِيْمٌ ﴿۲۱۹﴾ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۚ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ
خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ

اور اُسکے رہنیوالو نکو وہاں سی نکال دینا بہت زیادہ بُرا ہی اللہ کے نزدیک اور فتنہ (برپا کرنا) زیادہ بُرا ہے قتل سی اور تم سی ہمیشہ لڑتے جاوینگے جبتک کہ پھیر دیں تمکو تمھاری دین سی اگر وہ کر سکیں اور جو تم میں سی پھر جاوے اپنے دین سی پھر مرجاوی اور وہ کافر ہو تو یہی لوگ ہیں کہ مٹیامیل ہو جاتے ہیں اُنکے عمل دنیا میں اور آخرت میں اور یہی لوگ آگ میں جانے والے ہیں وہ اُسی میں ہمیشہ رہینگے (۲۱۴) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں وہی لوگ اُمیدوار ہیں خدا کی مہربانی کے اور اللہ بخشنے والا ہے مہربان (۲۱۵) تجھ سی پوچھتے ہیں شراب اور جوئے سے کہدے کہ اُن دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدے ہیں لوگوں کے لئے اور اُنکا گناہ بڑا ہے اُنکے نفع سے اور پوچھتے ہیں تجھ سی کہ کسطرح (اپنا مال) خرچ کریں (۲۱۶) کہدے حاجت سی زیادہ کو اسیطرح اللہ بیان کرتا ہی تمہارے لئے نشانیاں تاکہ تم فکر کرو (۲۱۷) دنیا اور آخرت (کے کاموں) میں اور پوچھتے ہیں تجھ سی یتیموں سے کہدے کہ اُنکے لئے اصلاح کرنی بہتر ہی (۲۱۸) اور اگر تم اُنکو ملالو تو وہ تمہارے بھائی ہیں اور اللہ جانتا ہے (یعنی تمیز کرتا ہے) فساد کرنیوالوں کو اصلاح کرنے والوں سی اور اگر خدا چاہتا تو سختی میں ڈالتا تم کو بیشک اللہ زبردست ہی حکمت والا (۲۱۹) اور مت نکاح میں لاؤ مشرک عورتوں کو جب تک کہ ایمان لاویں اور البتہ مسلمان لونڈی بہتر ہے مشرک عورت سے اگرچہ وہ تم کو اچھی لگتی ہو اور مت نکاح میں لو مشرک مردوں کو

حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ﴿۲۲۰﴾
اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ
بِاِذْنِهٖ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ
عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْ
هُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ
حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾
نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَلَا
تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا
بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ
فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ وَاللّٰهُ
غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ
اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾
وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

جب تک کہ ایمان لاویں، اور البتہ مسلمان غلام بہتر ہی مشرک مرد سے اور اگرچہ تمکو اچھا معلوم ہوتا ہو (۲۲۰) یہ لوگ بلاتے ہیں آگ (یعنی دوزخ) کی طرف اور اللہ بلاتا ہی جنت اور بخشش کیطرف اپنی مرضی سے، اور بیان کرتا ہی اپنی نشانیاں لوگوں کیلئے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں (۲۲۱) اور تجھ سے پوچھتے ہیں حیض سی کھدو کہ وہ نجاست ہی پس کنارہ رکھو عورتوں کو حیض کی حالت میں اور اُنسے مقاربت نہ کرو جبتک کہ پاک ہوں، پھر جب پاک ہو جاویں تو اُن پاس جاؤ جسطرح کہ خدا نے تم کو حکم کیا ہی، بیشک اللہ دوست رکھتا ہے معافی چاہنے والوں کو اور دوست رکھتا ہی ستھرائی والونکو (۲۲۲) عورتیں تمہاری کھیتی ہیں پھر اپنی کھیتی پاس جاؤ جسطرح تم چاہو، اور آگے بھیجو اپنے لئے (یعنی نیکی) اور ڈرو اللہ سے اور جان لو کہ بیشک تم اُس سی ملوگے، اور خوش خبری دے ایمان والوں کو (۲۲۳) اور مت بناؤ اللہ کو آڑا اپنے قسموں کی نیک کاموں سی بچنے کو، اور پرہیزگاری کرو اور لوگوں میں اصلاح کرو اور اللہ سننے والا ہی جاننے والا (۲۲۴) نہیں پکڑیگا اللہ تمکو تمہاری لغو قسموں میں لیکن تمکو پکڑیگا اُس چیز میں کہ کمائی ہی تمہارے دلوں نے، اور اللہ بخشنے والا ہی بردبار (۲۲۵) اُن لوگوں کیلئے جو قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی عورتوں (کے پاس جانے) سی توقف کرنا ہے چار مہینے پھر اگر وہ پھر جاویں (اپنی قسم سی) تو بیشک اللہ بخشنے والا ہے مہربان (۲۲۶) اور اگر اُنھوں نے طلاق دینے کا ارادہ کیا ہے تو بیشک اللہ سننے والا ہی جاننے والا (۲۲۷)

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْۤءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ
اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْۤ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْۤا
اِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ
عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲۲۸) اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ
بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا

(۲۲۷) (وان عزموا الطلاق) اسلام کے مخالفین نے حسد سے یا کج بحثی و ناسمجھی سے جو الزام اسلام پر لگائے ہیں انمیں سے طلاق کا بھی ایک مسئلہ ہے۔ یہودی تو یہ الزام لگا نہیں سکتے کیونکہ موسیٰ نے تو یہ حکم دیا ہے کہ جب کوئی طلاق دینی چاہے تو طلاق نامہ لکھدے بعض بت پرست قومیں جنکے ہاں طلاق نہیں ہے اور کسیقدر عیسائی جنکے ہاں بجز زنا کے کسی حالت میں طلاق جائز نہیں اس مسئلہ پر الزام دے سکتے ہیں۔ الزام کی بنا یہ ہے کہ یہ مسئلہ رحم و محبت و ہمدردی کے برخلاف ہے، جان ملٹن نے اس سے اختلاف کیا ہے اور نہایت عمدہ دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ جب شوہر و زوجہ میں ایسی ناموافقت ہو جاوے جو تمدن و حسن معاشرت کے منافی ہو تو انجیل کے احکام کی رو سے طلاق ناجائز نہیں ہے۔

بہر حال سو وقت تین شریعتیں طلاق کے معاملہ میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اول یہودیوں کی جس میں بغیر کسی سبب قوی کے مرد کو طلاق دے دینا جائز قرار دیا گیا ہے، اور ایسا کرنے میں کوئی گناہ یا الزام مرد پر عاید نہیں کیا گیا۔ بلا شبہ یہ شریعت ایک ناپسندیدہ شریعت ہے اور رحم و محبت اور حسن معاشرت و تمدن کے برخلاف ہے، ایسی شریعت سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور عورت کی وفاداری کا مرد کے ساتھ اعتبار نہیں رہتا۔ دوم بت پرستوں اور حال کے زمانہ کے عیسائیوں کی جس میں

اور جن عورتوں کو کہ طلاق دیگئی ہو ٹھیری رہیں اپنے آپ تین معتاد تک اور نہیں روا ہے اُنکو کہ چھپاویں جو کچھ کہ پیدا کیا ہے اللہ نے اُنکے رحموں میں اگر ہیں ایمان لانیوالی اللہ اور اخیر دن پر اور اُنکے خاوند زیادہ حق دار ہیں اُنکو پھیر لینے کے اُسمیں (یعنی اپنے نکاح میں) اگر وہ اصلاح چاہیں اور عورتوں کے لئے بھی (مردوں پر) اُسی کی مانند (حق) ہے جیساکہ (مردوں کا) اُنپر ہے ساتھ نکوئی کے اور مردوں کیلئے اُنپر (اس معاملہ میں) فضیلت ہے اور اللہ زبردست ہے حکمت والا (۲۲۸) طلاق (رجعی) دو دفعہ دینی ہے پھر یا تو نیکی سے روک لینا ہے یا احسان کی ساتھ چھوڑ دینا ہے اور نہیں حلال ہے تم کو کہ لو

طلاق جائز نہیں یا بجز زنا کے اور کسی حالت میں جائز نہیں۔ اس شریعت میں اس مقدس رسم کا بلاشبہ نہایت ادب کیا گیا ہے، مگر جسطرح کہ یہودی شریعت میں افراط تھی اسی طرح اس شریعت میں تفریط ہے اور دونوں فطرت انسانی کے برخلاف ہیں، اگر کسی سبب و حالت سے ایسی خرابیاں مرد و عورت میں پیدا ہو جاویں جو کسی طرح اصلاح کی قابل نہوں تو انکا بھی کچھ علاج ہونا چاہیئے، اور وہ علاج طلاق ہے پس کچھ شک نہیں کہ ایسی حالت میں بھی طلاق کا جائز نہ ہونا حسن معاشرت اور انسانی فطرت کی برخلاف ہے تیسری شریعت محمدیہ ہے جسکا ذکر اس آیت اور اُسکے بعد کی آیتوں میں اور آنحضرت صلعم کی نصیحتوں اور ہدایتوں میں ہے۔ اس شریعت حقہ نے اس خوبی اور اِس اعتدال سے اس مسئلہ کو قرار دیا ہے جس سے زیادہ عمدہ نہیں ہو سکتا، اور نہ اُس سے زیادہ تمدن اور حسن معاشرت کی حفاظت انسانی فطرت کے مطابق ہو سکتی ہے۔ شریعت محمدیہ نے طلاق کو ایسی حالت میں جائز قرار دیا ہے جبکہ زن و شوہر میں مرض ناموافقت و عدم محبت، کا ایسے درجہ پر پہونچ جاوے جو علاج کے قابل نہ ہو، یا یوں کہو کہ بجز طلاق کے دوسرا کوئی علاج اُسکا نہ ہو۔ مگر زن و شوہر کا معاملہ ایک ایسا نازک اور ایک عجیب قسم کے ارتباط و اختلاط کا ہے کہ اُسمیں جو خرابی پیدا ہو سوائے اُنہی دونوں

مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا

افْتَدَتْ بِهِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا وَمَنْ يَتَعَدَّ

حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٢٩﴾ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ

لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا

أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ

کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کا اندازہ نہیں کرسکتا کہ آیا وہ اس حد تک پہونچ گئی ہے جسکا علاج بجز طلاق
کے اور کچھ نہیں یا نہیں، اسلئے اس شریعت حقہ کے بانی نے اُس حد کی تعین انھی کی راے اور انھی
کی طبیعت پر منحصر کی ہے اور اُنھی کے اخلاق کو اُسکا قاضی بنایا ہے جسکی تسلی و موانست
کے لئے ابتداء میں عورت بطور انیس دلنواز اور مونس و غمگسار کے پیدا ہوئی تھی، اور اِس بات کا کہ وہ
علاج بے محل و بے موقع بداخلاقی اور بدخواہش نفسانی سے نہ کیا جاوے جہانتک کہ انسانی فطرت
کے مناسب حال تھا انسداد کیا ہے۔ مردوں کو فہمایش کی ہے کہ ہمیشہ عورتوں کے ساتھ محبت
رکھیں، اور اُنکے ساتھ مہربانی سے پیش آئیں، اُنکی سختی و بدمزاجی کو تحمل سے برداشت کریں۔ عورتونکو
فہمایش کی کہ اپنے مردون کی تابعداری کریں، اُنکے ساتھ محبت رکھیں، اُنکی وفادار ہوں۔ پھر طلاق کی نسبت
فرمایا کہ گو طلاق جائز کی گئی ہے مگر کوئی چیز زمین کے پردہ پر طلاق سے زیادہ خدا کو غصہ دلانے والی
پیدا نہیں ہوئی۔ عورت کی نسبت فرمایا کہ جو عورت بغیر لاعلاج ضرورت کے اور بغیر سخت حالت
کے اپنے شوہر سے طلاق کی خواہاں ہو اُس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ ہمارے پیغمبر خدا صلعم
طلاق سے ایسے ناراض ہوتے تھے کہ بعض دفعہ صحابہ کو شبہہ ہوا کہ طلاق دینے والے نے ایسا جرم کیا ہے

اُس چیز میں سے جو کچھ تمنے اُنکو دیا ہی کچھ بھی، مگر جبکہ اِس بات سے دونوں ڈریں کہ دونوں نہیں قایم رکھ سکنے کی حدیں اللہ کی پھر اگر تم ڈرو کہ دونوں نہیں قایم رکھینگے اللہ کی حدونکو تو اُن دونوںپر کچھ گناہ نہیں ہے اُس چیز میں کہ عورت اُسکو اپنے بدلے دی، یہ ہیں اللہ کی حدیں پھر اُنسے تجاوز مت کرو اور جسنے تجاوز کیا اللہ کی حدوں سے پھر یہی لوگ ہیں جو ظالم ہیں (۲۲۹) پھر اگر عورت کو طلاق دیدی (یعنی تیسری بار) تو اسکے بعد اُسکو حلال نہیں ہے جبتک کہ نکاح کرے اُسکے سوا دوسری شوہر سے، پھر اگر وہ اُسکو طلاق دیدی تو اُن دونوں پر کچھ گناہ نہیں ہے پھر کر نکاح کر لینے میں اگر گمان کریں کہ دونوں قایم رکھیں گے حدیں اللہ کی اور یہ اللہ کی حدیں ہیں (۲۳۰)

ہو کہ قتل کر دینیکے قابل ہی پھر ان ہدایتوں اور تہدیدوں ہی پر طلاق کے روکنے میں بس نہیں کیا، بلکہ نکاح اور ملاپ کے قایم رکھنے کی اور بھی تدبیریں فرمائیں، یعنی پوری تفرقی واقع ہونیکو تین دفعہ طلاق دینا معتبر رکھا ہی اور یہ اجازت دی کہ پہلی طلاق کے بعد اگر آپس میں صلح ہو جاوی اور رنجش مٹ جاوی اور دونوکی محبت تازہ ہو جاوے تو پھر بدستور جورو خصم رہیں، دوسری طلاق کے بعد بھی اِسی طرح وہ آپس میں بدستور جورو خصم ہو سکتے ہیں لیکن اگر پھر تیسری دفعہ طلاق دیجاوے تو ثابت ہو گیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں بہتر ہے کہ پوری تفرقی ہو جاوے۔ ایسی حالت میں کہ عورت کو مرد سے کنارہ کش رہنا پڑتا ہے طلاق دینے کو منع فرمایا اِس اُمید پر کہ شاید زمانہ مقاربت میں محبت والفت کی ایسی تحریک ہو کہ خیال طلاق کا دل سے جاتا رہے، پس یہ تمام احکام نہایت خوبی و عمدگی و اعتدال سے فطرت انسانی کی مطابق ہیں خدانے ان احکام کی نسبت فرمایا کہ یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں اُنکو توڑنا نہیں چاہیئے، ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ حدیں کچھ دیواریں یا خندقیں نہیں ہیں بلکہ یہ حدیں فطرت انسانی کی حدیں ہیں جنکو توڑنا انسانیت کی حد سے خارج ہونا ہے پس جو لوگ مسئلہ طلاق پر معترض ہیں جب وہ اُسکو بخوبی سمجھیں گے اور فطرت انسانی پر غور کرینگے تو

يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ
فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّلَا تُمْسِكُوْ
هُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ وَلَا
تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ
عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا
اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ
فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ
ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ وَ
الْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ
الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ
لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا
مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ فَاِنْ اَرَادَا
فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا

بیان کرتا ہی اُنکو اُس گروہ کے لئے کہ جانتے ہیں (یعنی اُس گروہ کیلئے جو جاننے کے قابل ہیں نہ غیر مکلفین کے لئے جو مجنون یا نابالغ ہیں) (۲۳۰) اور جبکہ تم نے عورتوں کو طلاق دی پھر وہ پہنچ گئیں اپنی میعاد کو پھر یا تو روک لو اُنکو ساتھ نیکی کے یا چھوڑ دو اُنکو ساتھ نیکی کے اور مت روکو اُنکو ضرر پہنچانے کو تاکہ اُنپر زیادتی کرو اور جو کوئی ایسا کریگا تو بیشک اُسنے اپنے اوپر ظلم کیا اور مت ٹھیراؤ اللہ کی نشانیاں کو تمسخر اور یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو جو تمپر ہیں اور اُس چیز کو (یاد کرو) جو اُتاری ہے تمپر کتاب اور حکمت سے اور نصیحت کرتا ہے تم کو اُس سے اور ڈرو اللہ سے اور جان لو کہ بیشک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے (۲۳۱) اور جب تمنے عورتوں کو طلاق دیدی اور اُنھوں نے اپنی مدت پوری کر دی تو اُنکو اپنے خاوندوں سے جبکہ وہ نیکی سے آپس میں راضی ہو جاویں نکاح کرنے سے منع مت کرو اِس بات سے اُس شخص کو کہ جو تم میں سے خدا پر اور اخیر دن پر ایمان لایا ہے نصیحت کیجاتی ہے، یہ بات تمہارے لئے پاکیزہ اور پاک ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے (۲۳۲) اور بچے والیاں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلاویں، یہ اُسکے لئے ہی جو دودھ پلانیکی مدت کو پورا کرنا چاہے اور جس شخص کا بچا ہے اُسپر نیکی کے ساتھ اُنکا کھانا اور اُنکا کپڑا دینا ہی کوئی شخص تکلیف نہیں دیا جاتا مگر بقدر اُسکی طاقت کے، نہ ضرر میں ڈالی جاوے کوئی ماں بسبب اُسکی بچے کے اور نہ وہ جسکا بچا ہے بسبب اُسکے بچے کے اور وارث پر بھی اُسکی مانند ہے، پھر اگر دونوں دودھ چھوڑانیکا آپس کی رضامندی و مشورہ سے ارادہ کریں تو اُنپر کچھ گناہ نہیں ہے،

وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا
سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ
اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ
اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا فَاِذَا بَلَغْنَ
اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ
مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ
سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا
قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۲۳۵﴾ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ
اَجَلَهٗ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ وَاعْلَمُوْٓا
اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۶﴾ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ
مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً وَّمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ
قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۷﴾
وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ

اور اگر تم اپنی اولاد کو دائیون سے دودھ پلوالینا چاہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں ہے جبکہ حوالہ کردو جو کچھ دینا کیا ہے نیکی سے اور ڈرو اللہ سے اور جان لو کہ بیشک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اسکو دیکھتا ہے (۲۳۳) اور جو لوگ تم میں سے مرجاویں اور بیویاں چھوڑیں تو انکو خود چار مہینے اور دس دن انتظار کرنا چاہیئے پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہونچ جائیں تو تم پر کچھ گناہ نہیں ہے اُس بات میں جو وہ اپنے لیئے نیکی سے کرنا چاہیں اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اُس سے خبردار ہے (۲۳۴) اور تم پر گناہ نہیں ہے اِس بات میں کہ اشارتًا تمنے عورتون سے پیغام نکاح کیا ہو یا تمنے اپنے دل میں اُسکو پوشیدہ رکھا ہو اللہ جانتا ہے کہ بیشک تم اُنکو یاد کروگے ولیکن اُن سے خفیہ وعدہ مت کرلو بجز اسکے کہ کہو کوئی بات نیک (۲۳۵) اور مت قصد کرو عقد نکاح کا جبتک کہ پہونچے میعاد معینہ اپنی مدت کو اور جان لو کہ بیشک اللہ جانتا ہے جو کچھ کہ تمہارے دلونمیں ہے پس اُس سے ڈرو اور جان لو کہ بیشک اللہ بخشنے والا ہے بردبار (۲۳۶) تم پر کچھ گناہ نہیں ہے اگر تم عورتونکو طلاق دو اُسوقت کہ اُنکو چھوا ابھی نہیں ہے یا اُنکے لئے تمنے کوئی مقدار (یعنی مقدار مہر) مقرر نہیں کی ہے اور اُنکو کچھ دو مقدور والے پر نیکی سے دینا ہے اپنے مقدور کے موافق اور تنگ دست پر اپنے مقدور کے موافق (یہ ایک طرح کا) حق ہے نیک لوگوں پر (۲۳۷)

اور اگر تمنے اُن کو طلاق دی ہے قبل اِس سے کہ اُنکو چھوا ہو

وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَا الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۲۳۸) حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَوٰةِ الْوُسْطَى وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ (۲۳۹) فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (۲۴۰) وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَعْرُوفٍ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۲۴۱) وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (۲۴۲) كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۲۴۳) أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ

بالیقین جانینگے کہ بلاشبہہ یہ حکم اُسی کا ہے جسنے فطرت انسانی کو بنایا ہے۔

(۲۴۴) (الم تر الی الذین خرجوا) اس آیت سے نہیں معلوم ہوتا کہ اس میں کن لوگوں کا ذکر ہے مفسرین نے لفظ "موتوا" اور لفظ "احیاہم" سے یہ قیاس کیا کہ یہ لوگ حزقیل نبی کے وقت میں تھے، حزقیل نبی کا ایک قصہ مُردونکی ہڈیوں کے دیکھنے اور پھر اُنکے زندہ ہونیکا حزقیل نبی کی کتاب میں مندرج ہے ہمارے ہاں کی مفسرین نے صرف اُن دو لفظوں سے ایک قصہ مثل قصہ حزقیل بنالیا ہے جو محض غلط ہے اور جو خیالات

اور تمنے اُنکے لئے مقدار (یعنی مقدار مہر) مقرر کی ہے تو جو تمنے مقرر کیا ہے اُسکا نصف (دینا چاہیئے) مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں یا وہ شخص معاف کرے جسکے اختیار میں نکاح باندہنا تھا اور تمہارا معاف کرنا زیادہ تر قریب ہی پرہیزگاری کیلئے اور مت بھولو آپس کے احسان کو بیشک اللہ تعالیٰ اُس چیز کو جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے (۲۳۸) حفاظت کرو نمازوں کی اور بیچ کی نماز کی اور خدا کیلئے کھڑے ہو عاجزی کرنیوالی (۲۳۹) پھر اگر تمکو ڈر ہو تو پیادہ پا چلتے ہوئے یا سواری پر چلتے ہوئے (نماز پڑھ لو) پھر جب تمکو امن ہو تو یاد کرو اللہ کو جسطرح کہ تم کو سکھائی ہے وہ چیز کہ تم نہیں جانتے تھے (۲۴۰) اور جو لوگ تم میں سے مر جاویں اور بیویاں چھوڑیں وصیت کریں اپنی بیویوں کیلئے ایک برس تک کچھ دینے کی بغیر نکال دینے کے پھر اگر وہ نکل جاویں تو تم پر کچھ گناہ نہیں ہے اس بات میں کہ وہ کریں جو کچھ کہ اُنکے دل میں ہو نیکی سے اور اللہ زبردست ہے حکمت والا (۲۴۱) اور طلاق دی ہوئی عورتوں کیلئے نیکی سے کچھ دینا حق ہے پرہیزگاروں پر (۲۴۲) اسیطرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لئے اپنی نشانیاں تاکہ تم سمجھو (۲۴۳) کیا تو نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا (یعنی اُنکا حال نہیں جانا) جو نکل بھاگے

کے لفظ سے اُنہوں نے وبا سے اُن لوگوں کا اپنا ملک چھوڑ کر چلا جانا قرار دیا ہے مگر اس تفسیر کی کوئی سند نہیں ہے صرف اُنہی غلط خیال پر یہہ تفسیر بیان کی ہے۔

حذر الموت کے لفظ سے بسبب وبا کے اُن لوگوں کا ملک سے چلا جانا ایک نہایت غلط قیاس ہے کیونکہ اسی مقام پر خدا نے مسلمانوں کو اپنے دشمنوں سے لڑنے کی ترغیب دی ہے اور اسلئے لڑائی میں مارے جانیکے خوف سے اُن لوگوں کا ملک کو چھوڑ کر چلا جانا مراد ہو سکتا ہے نہ کہ وبا کے ڈر سے۔

دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۲۴۵﴾

موت اور احیا کے حقیقی معنی بھی یہاں مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ آیت میں کوئی اشارہ اسبات کا کہ یہ امر معجزہ سے ہوا تھا اور کیا محل معجزہ دکھانیکا تھا اور کس پیغمبر نے دکھایا تھا اور کسکو دکھایا تھا مذکور نہیں ہے، اور جو کہ یہ الفاظ موقع جنگ میں واقع ہیں اسلئے موت سے اُن لوگوں کی نامردی اور بزدلاپن مراد ہے جو لڑائی میں موت کے ڈر سے ملک چھوڑ گئے تھے جیسے کہ عام محاورہ میں کہتے ہیں کہ اگر یہ بات نہیں کرتے تو اچھا مرو یعنی مصیبت میں پڑے رہو، خدا نے اور جگہ بھی موت کے لفظ کو انہی معنوں میں استعمال کیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ قل موتوا بغیظکم، یعنی اپنے غصہ میں مرو یعنی تباہ و خستہ دل رہو، اور احیا کے لفظ سے اُنکے دل میں قوت آنا اور لڑنے پر آمادہ ہونا اور دشمن کو شکست دینے پر قادر ہونا مراد ہے، اور اسی تمثیل پر مسلمانوں کو دوسری آیت میں دشمنوں سے لڑنا اور دل کو مضبوط رکھنے کی ترغیب دی ہے، پس موت واحیا سے حقیقی موت و زندگی سمجھنا اور تمام قصہ کو حزقیل نبی کے فرضی قصہ پر جو حزقیل کی کتاب میں ہے محمول کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔

بلاشبہ جبکہ قرآن مجید میں اُن لوگوں کا زیادہ حال بیان نہیں ہوا ہے تو مفسر کا صرف یہ کام ہے کہ تاریخی گذشتہ واقعات پر خیال کرے اور دیکھے کہ کونسے تاریخی واقعہ سے زیادہ مناسبت معلوم ہوتی ہے

اپنے گھرون سے موت کے ڈر سے اور وہ ہزارون تھے پہر اُن سے کہا اللہ نے* مر و تم (یعنی بسبب موت کے ڈر کے یا اپنی نامردی کی اور لڑنے کے ڈر سے) پہر جلایا اُنکو (یعنی اُنکے دل مین شجاعت اور ارادہ جنگ پیدا کیا) بیشک اللہ تعالیٰ لوگون پر البتہ فضل کرنیوالا ہے ولیکن اکثر لوگ شکر نہین کرتے (۲۴۴) اور لڑو (اے ایمان والو) اللہ کی راہ مین اور جان لو کہ بیشک اللہ سننے والا ہے جاننے والا (۲۴۵) کون وہ شخص ہے جو قرض دے اللہ کو قرض نیک پھر دو گنا کر دے اُسکو اُسکے لئے دو گنا کر تا بہت دفعہ اور اللہ تنگی کرتا ہے اور فراخی کرتا ہے اور اُسی کیطرف رجوع کئے جاؤ گے (۲۴۶)

اور کوئی قرینہ اُس واقعہ سے آیت کے متعلق کرنیکا ہے یا نہیں اور اس طرح آیت کا تعلق اُس واقعہ سے قرار دیکر اس مقام پر قرآن مجید میں اُن واقعات کا ذکر ہے جو بنی اسرائیل اور مدیانیون اور فلسطینیون میں واقع ہوئے تھے اور اسلئے قیاس کرنیکو صریح موقع ہے کہ اس آیت میں بھی اُنہی واقعات میں سے کسی واقعہ کا ذکر ہے۔

مدیانیون کے‡ ہاتھ سے بنی اسرائیل نے سخت شکست پائی تھی اور اپنا گھر چھوڑ چھوڑ کر پہاڑون اور جنگلون میں بھاگ گئے تھے اور سات برس تک اُنپر یہ مصیبت رہی پھر جدعون نبی اُن میں مبعوث ہوئے اور اُنھون نے اُنکو لڑائی پر ترغیب دی اور اُنکا دل مضبوط کیا اور مدیانیون پر اُنھوں نے فتح پائی۔ پس خدا تعالیٰ نے مسلمانون کو بتایا کہ جو لوگ لڑائی میں موت کے ڈر سے بھاگے وہ ایسی بدتر حالت کو جو مرنے کے برابر ہے پہونچ گئے تھے پھر اللہ نے اُنکو ہمت و جرأت سے زندہ کیا اور فتحمند و خوشحال ہوئے تا اسیطرح مسلمانوں کو بھی موت کے ڈر سے بزدلی و نامردی جو موت کے برابر ہے اختیار کرنی نہیں چاہیئے بلکہ اپنے دشمنون سے لڑنا اور بہادری و دلیری و استقلال کو کام میں لانا چاہیئے۔

---

* موتوا بحذرکم الموت او موتوا بجبنکم وحذرکم من الحرب کما قال اللہ تعالیٰ فی سورۃ آل عمران قل موتوا بغیظکم۔ سید احمد۔

‡ دیکھو توریت میں کتاب قضاۃ باب ششم۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا ۖ قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ (۲۴۷)

(۲۴۷) (الم تر الی الملأ) اس آیت سے لغایت آیت ۲۵۲ طالوت وجالوت کی لڑائیون کا ذکر ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جبکہ بنی اسرائیل مین شموئیل نبی تھے اور ان آیتون میں پانچ واقعون کا بیان ہے۔

(۱) بنی اسرائیل کا اپنے نبی سے درخواست کرنا کہ اُن پر کوئی بادشاہ مقرر کرے۔

(۲) شموئیل نبی کا بنی اسرائیل پر طالوت کو بادشاہ مقرر کرنا۔

(۳) تابوت سکینہ کا طالوت کے عہد میں بنی اسرائیل کے پاس آجانا۔

(۴) طالوت کے لشکر کو دریا کے پانی سے منع ہونا۔

(۵) فلسطینیوں کا شکست پانا اور جالوت کا داؤد کے ہاتھ سے مارا جانا۔

یہہ تمام واقعات توریت کی کتاب شموئیل مین مندرج ہیں مگر تیسرے اور چوتھے واقعہ میں کسیقدر اختلاف ہے یعنی کتاب شموئیل میں تابوت سکینہ کا طالوت کے عہد سے پہلے آجانا لکھا ہے اور قرآن مجید میں طالوت کے عہد میں اور اُسپر عیسائی مورخون نے اعتراض کیا ہی کہ غلطی سے ماقبل کے واقعے کو مابعد کے واقعے میں شامل کردیا ہے۔

کتاب شموئیل سے پایا جاتا ہے کہ تابوت سکینہ بمقام شیلوہ تھا جہان عیلی بنی اسرائیل پر حاکم تھا اُسکے عہد میں بنی اسرائیل اور فلسطینیوں میں بمقام ابن غیزر لڑائی ہوئی اور بنی اسرائیل کی شکست ہوئی (دیکھو کتاب شموئیل اباب ۴ ورس ۲) تب بنی اسرائیل نے تابوت سکینہ کو شیلوہ سے لشکرگاہ میں منگایا اور دوبارہ لڑے اور شکست عظیم ہوئی اور عیلی کے دونون بیٹے مارے گئے اور تابوت سکینہ کو فلسطینی چھین لے گئے (دیکھو کتاب

کیا تو نے بنی اسرائیل کے اس گروہ کو نہیں دیکھا جو موسیٰ کے بعد ہوئے (یعنی اُمت شموئیل پیغمبر) جبکہ اُنھوں نے اپنے نبی کو کہا کہ ہمارے لیئے ایک بادشاہ مقرر کر تاکہ ہم خدا کی راہ میں لڑیں (یعنی جالوت سے) نبی نے کہا کہ کیا تم ایسے نہیں معلوم ہوتے کہ اگر تم پر لڑائی لکھی جاوے تو تم نہ لڑو گے اُنھوں نے کہا کیوں نہ ہم لڑینگے اللہ کی راہ میں حالانکہ بیشک ہم خارج کیئے گئے ہیں اپنے گھروں سے اور اپنے بیٹوں سے پھر جب اُن پر لڑائی لکھی گئی تو پھر گئے بجز تھوڑوں کے اُن میں سے اور اللہ جانتا ہے ظالموں کو (۲۴۷)

شموئیل ا باب ۴ ورس ۱۰ و ۱۱) عیلی یہی یہ خبر سُنکر کرسی پر سے گر پڑا اور مرگیا اُس زمانہ میں شموئیل نبی ہو چکے تھے مگر اُن کی عمر چھوٹی تھی۔ فلسطینی تابوت سکینہ کو مقام ابن عیزر سے جہاں سے اُنھوں نے فتح کیا تھا بمقام اشدود لیگئے اور داگون بت کے مندر میں رکھا (دیکھو کتاب شموئیل ا باب ۵ ورس ۱ لغایت ۵) پھر وہاں سے بمقام گٹ لیگئے (دیکھو کتاب مذکور ورس ۸) پھر وہاں سے بمقام عقرون لیگئے (دیکھو کتاب مذکور ورس ۱۰) اُسکے بعد فلسطینیوں نے ایک گاڑی میں دو گایوں کو جوت کر اور تابوت سکینہ کو اُسپر رکھکر جنگل میں چھوڑ دیا اور وہ گائیں اُسکو لیکر بمقام بیت الشمس چلی آئیں اور یوشع کے کھیت میں جا کھڑی ہوئیں اُسنے تابوت اُتار لیا اور اپنے یہاں رکھا (دیکھو کتاب شموئیل ا باب ششم) کتاب شموئیل میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ بنی اسرائیل کی شکست ہونے اور تابوت چھین لیجانے کے سات مہینے بعد ہوا۔

اسکے بعد تابوت سکینہ قریات یعاریم میں آیا اور ابینا داب کے گھر میں بمقام گبعاہ رکھا گیا (دیکھو کتاب ا شموئیل باب ۷ ورس ۱) مگر کتاب شموئیل میں نہیں لکھا کہ بیت الشمس میں کسقدر مدت تک رہا۔ عیسائی مورخون کے نزدیک ۱۱۴۱ قبل مسیح کے تابوت سکینہ فلسطینیوں نے چھین لیا تھا اور ۱۱۴۰ میں قریات یعاریم میں آگیا وہاں آنیکے بیس برس بعد یہودیوں نے بتوں کی عبادت شموئیل نبی کی فہمایش سے موقوف کی اور خدا کی پرستش اختیار کی (دیکھو کتاب شموئیل ا باب ۷ ورس ۱ و ۲) اور بنی اسرائیل سے شموئیل کی سرداری میں ایک لڑائی فلسطینیوں سے ہوئی اور فلسطینیوں نے شکست کھائی جب شموئیل ضعیف ہوئے تب بنی اسرائیل نے کسی بادشاہ کی

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (۲۴۸)

مقرر کرنیکو کہا اور طالوت کو ۱۰۹۵ سنہ قبل مسیح میں بادشاہ کیا۔

کتاب شموئیل میں طالوت یعنی شاؤل اور جالوت کی لڑائی اور اُسکے مارے جانیکا ذکر ہے مگر طالوت کی لشکر کو دریا کے پانی پینے سے منع کرنیکا ذکر نہیں ہے بلکہ توریت کی کتاب قضاۃ باب ہفتم میں جدعون کے لشکر کو ایک چشمہ کے پانی پینے سے منع کیا گیا تھا اور یہ واقعہ ۱۲۴۹ سنہ قبل مسیح کے ہوا تھا اسلئے عیسائی مورخ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں غلطی سے جدعون کے لشکر کے واقعہ کو طالوت کے لشکر کے واقعے سے ملا دیا ہے اِن دونوں اعتراضوں کے تسلیم کرنیکے لئے جو مخالفت کتاب شموئیل پر مبنی ہیں ضرور ہے کہ کتاب شموئیل میں جو واقعات اور جو ترتیب اُن واقعات کی ہے اُسکو صحیح تسلیم کر لیا جاوے اور یہ بات بھی مان لی جاوے کہ کوئی واقعہ طالوت کے لشکر کا ایسا نہیں ہے جو کتاب شموئیل میں لکھنے سے رہ گیا ہو حالانکہ خود عیسائی مورخ ان باتوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ شموئیل کی کتابوں کے مضامین میں باہم اختلاف ہے۔ کتاب اول شموئیل باب ۱۶ درس ۲۱ و ۲۲ سے ظاہر ہے کہ طالوت داؤد سے اور اُسکے باپ یشی سے بخوبی واقف تھا داؤد کو اُسکے باپ کے پاس سے بلایا تھا اور اپنا سلح دار کیا تھا، اُسی کتاب کے باب ہفتدہم درس ۱۵ اسے ظاہر ہے کہ داؤد طالوت سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ لڑائی کے ہنگامہ میں جب داؤد اپنے بھائیوں کی خبر لینے آیا تو داؤد نے کہا کہ جالوت سے میں لڑونگا یہ خبر سنکر طالوت نے داؤد کو بلایا اور گفتگو کے بعد لڑنے کی اجازت دی اور اپنی زرہ و خود و تلوار بھی دی جسکو داؤد نے لیکر پھر دیدیا (دیکھو کتاب اول شموئیل باب ۱۷ درس ۳۱ لغایت ۳۹) مگر اُسی باب کے درس ۵۵ میں لکھا ہے کہ

اور اُن سے کہا اُنکے نبی نے کہ بیشک اللہ نے ٹھیک تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے، اُنھوں نے کہا کہ کیونکر اُسکو ہمپر بادشاہی ہوگی حالانکہ ہم اُس سی بادشاہی کے زیادہ مستحق ہیں اور نہ اُسکو کچھہ دولت کی فراخی دیگئی ہے، اُنکے نبی نے کہا کہ بیشک اللہ نے اُسی کو تمپر منتخب کیا ہے، اور اُسکو علم اور جسم میں فراخی دی ہی اور اللہ دیتا ہی اپنا ملک جسکو چاہتا ہے اور اللہ وسعت دینے والا ہے جاننے والا (۲۴۸)

جب داؤد کو دیکھا تو طالوت نے اپنے لشکر کے سردار سے پوچھا کہ یہ جوان کسکا بیٹا ہے، اور ورس ۵۸ میں لکھا ہے کہ جب داؤد نے جالوت کا سر کاٹ لیا اور طالوت کے پاس لے آیا تو طالوت نے پوچھا کہ تو کسکا بیٹا ہے - پس اِن آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسوقت تک طالوت داؤد سے مطلق واقف نہ تھا -

اِس اختلاف کے سبب خود عیسائی مورخوں کی یہ راے ہے کہ کتاب شموئیل میں قصہ اُلٹ پلٹ ہو گیا ہے جالوت کی لڑائی کے بعد داؤد طالوت کا مصاحب اور سلح بردار رہا ہے - اِسپر بھی اختلاف رفع نہیں ہوتا کیونکہ سولھوین باب سے داؤد کی پہلی دفعہ بطور مطرب بربط نواز کے طالوت سے ملاقات ہونی پائی جاتی ہے -

متقدمین علماے عیسائی نے خیال کیا ہے کہ باب ہفتدہم کتاب اول شموئیل کے ورس ۱۲ - لغایت ۳۱ و ورس ۵۵ لغایت ۵۸ و باب ہیجدہم کے ورس ۱ - لغایت ۵ صحیح نہیں ہیں اور اُنکو خارج کر دیا ہے چنانچہ سپٹوا جنٹ کے قلمی نسخہ وٹیکن میں وہ آیتیں نہیں ہیں اگر وہ آیتین نکال ڈالی جاویں تب بھی اور آیتون میں جیسے کہ باب ۱۶ کے ورس ۱۸ - لغایت ۲۱ و باب ۱۷ کے ورس ۳۳ - لغایت ۴۰ کی مطابقت ہی نہین ہو سکتی - انہی اختلافات کے سبب بعض عیسائی عالمون کی یہ راے ہے کہ سارے کا سارا سترھواں باب الحاقی و نامعتبر ہے - جان کیٹو نے اپنی کتاب سیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ "یہی کافی نہیں ہی کہ جس مقام کو ہم غلط سمجھیں اُسے الحاقی سمجھکر خارج کر دین اور باقی کو بلا کم و کاست صحیح جانیں کیونکہ ممکن ہے کہ جنہوں نے الحاق کیا تھا اُنھوں نے باقی حصو نمیں بھی تصرف کیا ہو"

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۲۴۹﴾

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو اللَّهِ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۲۵۰﴾

علاوہ اسکے یہ بھی تحقیق نہیں ہے کہ شموئیل کی کتابیں کب لکھی گئیں اور کسنے لکھی ہیں یہودی اور بڑے بڑے عیسائی عالم خیال کرتے ہیں کہ شموئیل کی کتاب کا بڑا حصہ یا پہلے چوبیس باب شموئیل کے لکھے ہوئے ہیں اور باقی ناثان نبی و گید نبی کے لکھے ہوئے ہیں۔ ابربانیل اور کروشیس خیال کرتے ہیں کہ یہ سب کتابیں یرمیاہ نبی نے لکھی ہیں ہاجان کی یہ رائے ہے کہ یہ کتابیں شموئیل کے بہت زمانہ بعد یعنی قید بابل کے تیسویں سال میں لکھی گئی ہیں۔ اگر درحقیقت ایسا ہی ہو کہ تین ہاتھوں نے ان کتابوں کو لکھا ہو تو واقعات کا الٹ پلٹ ہو جانا یا بعض واقعات کا تحریر سے رہ جانا ایک ایسا امر ہے جو آسانی سے خیال میں آسکتا ہے۔

ہماری غرض اس بحث سے شموئیل کی کتابوں پر جرح و قدح کی نہیں ہے بلکہ صرف یہ بات ثابت

اور اُنکو اُنکے نبی نے کہا کہ بیشک اُسکی بادشاہی کی نشانی یہ ہی کہ تمہارے پاس
صندوق جسمیں ایک تسکین ہے تمہارے پروردگار سے اور جسمیں) اُس میں کا
بقیہ ہے جو آل موسیٰ اور آل ہارون نے چھوڑا ہے آجاویگا اوٹھالاوینگے اُسکو
فرشتے بیشک اسمیں البتہ نشانی ہی تمہارے لئے اگر تم ایمان والے ہو (۲۴۹) پھر جب آگے بڑھ گیا
طالوت اپنے لشکر سمیت تو اُسنے کہا کہ بیشک اللہ تمکو مبتلا کریگا ساتھ ایک نہر کے پھر جو کہ پیئے
اُس سے تو وہ مجھ سے (یعنی میرے گروہ سے) نہیں ہے اور جو کوئی اُسکو نہ چکھے تو بیشک وہ
مجھ سے (یعنی میرے گروہ سے) ہی مگر (پینے والوں میں سے) جسنے بھرلیا ایک چلو اپنے ہاتھ
سے (وہ پہلے حکم میں داخل نہیں ہی) پھر پیلیا لوگوں نے اُس میں سے مگر اُنمیں سے
تھوڑوں نے (نہیں پیا) پھر جبکہ وہ اور وہ لوگ جو اُس پر ایمان لائے تھے اُسکے پار
ہوئے تو بولے کہ ہمکو آج کے دن جالوت اور اُسکے لشکروں کی (مقابلہ کی) طاقت
نہیں ہی اُن لوگوں نے کہا جو جانتے تھے کہ بیشک وہ خدا سے ملیں گے، بہت ہوا ہی
چھوٹا گروہ غالب ہوا ہی بڑی گروہ پر خدا کی مرضی سے اور اللہ صبر کرنیوالوں کی ساتھ ہے (۲۵۰)

کرنی ہے کہ قرآن مجید پر اس وجہہ سے کہ شموئیل کی کتابوں سے بیان میں مختلف ہے اعتراض نہیں
ہوسکتا جب تک کہ اور طرح پر اُسکی غلطی ثابت نہ کی جاوے۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ قرآن مجید میں جو کچھ لکھا ہے اُسکی صحت پر کسیکو اس وجہ پر مجبور کروں کہ قرآن میں
لکھا ہے، بلکہ میں دونوں واقعوں پر جو قرآن و کتاب شموئیل میں مندرج ہیں بطور ایک نکتہ چین مورخ
کے غور کرنا اور اُس نکتہ چینی سے دونوں قولوں میں سے ایک کو ترجیح دینا چاہتا ہوں۔

تابوت سکینہ کو فلسطینی فتح کرکے چھین لے گئے تھے، کتاب شموئیل میں اُسکا واپس بھیجدینا
ایسی عجیب اور کراماتی واقعوں پر مبنی کیا ہے جسکو کوئی آزاد رائے کا مورخ جو واقعات کو انسانوں کی
حالات اور افعال کا نتیجہ سمجھتا ہے تسلیم نہیں کرسکتا۔ لڑائی کے شکست ہونے کے بعد بنی اسرائیل

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۲۵۱﴾ فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۲۵۲﴾ تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۲۵۳﴾

نہایت ضعیف ہوگئے تھے اور رفتہ رفتہ اُنھوں نے پھر قوت حاصل کی تھی، تابوت سکینہ کا دشمنوں کے ہاتھ میں چلا جانا بلاشبہ اُنکو نہایت رنج دیتا ہوگا اور اُنکی نہایت آرزو یہ ہوگی کہ وہ اُسکو پھر اپنے دشمنوں سے واپس لیں۔

اِس شکست کے بیس برس بعد وہ فلسطینیوں سے پھر لڑے اور فلسطینیوں نے شکست پائی جس سے معلوم ہوتا ہے فلسطینی کمزور ہوگئے تھے۔ فلسطینی خوب جانتے ہونگے کہ بنی اسرائیل جب تک کہ تابوت سکینہ اُنکے نہ ہاتھ لگے لڑائی سے باز نہیں آنیکے۔ اِس عرصہ میں بنی اسرائیل کو زیادہ قوت ہوگئی اور شموئیل نبی نے تمام فرقوں کو جو عیلی کے مرنے کے بعد متفرق ہوگئے تھے اکٹھا کرلیا اور طالوت کو بادشاہ مقرر کیا اور یہ امر بنی اسرائیل کی زیادہ قوت کا اور فلسطینیوں کو جو کمزور ہوتے جاتے تھے زیادہ خوف کا باعث ہوا ہوگا اُنھوں نے سمجھا ہوگا کہ اگر تابوت سکینہ واپس کردیا جاوے تو شاید مصیبت جنگ سے حفاظت ہوجاوے اُنھوں نے جابجا اُسکو منتقل کیا اور آخر کار ایک گاڑی میں لادکر معہ زر و تحائف کے بیت الشمس کی سرحد میں جو بنی اسرائیل کا ایک شہر فلسطینیوں کی سرحد سے ملا ہوا تھا چھوڑ آئے، اور اس تمام اصلی واقعہ پر خیال کرنے سے اِس بات کو کہ تابوت سکینہ طالوت کے عہد میں آیا ہوگا جیسا کہ قرآن میں مندرج ہے زیادہ ترجیح ہوتی ہے۔

اور جب سامنے ہوا جالوت اور اُسکے لشکر تو اُنہوں نے کہا اے ہمارے پروردگار ہم پر (یعنی ہماری دلونمیں) صبر ڈال اور قایم رکھ ہمارے قدم اور مدد کر ہماری کافر قوم پر (۲۵۱) پھر اُنہوں (ان) نے اُنکو اللہ کی مرضی سے شکست دی اور داؤد نے جالوت کو مار ڈالا اور اللہ نے اُسکو بادشاہی اور حکمت عطا کی اور اُسکو جو کچھ وہ چاہتا تھا سکھایا اور اگر اللہ کا دفع کرنا آدمیونکو بعض آدمیونکا بعض سے نہوتا تو تباہ ہو جاتی زمین (یعنی ملک) ولیکن اللہ فضل کرنیوالا ہو دنیا پر (۲۵۲) یہ نشانیاں ہیں اللہ کی ہم انہیں تجھکو پڑھ سناتے ہیں برحق اور بیشک تو رسولونمیں سے ہے (۲۵۳)

دریا کے پانی پینے سے منع کرنیکی نسبت اول ہمکو خیال کرنا چاہیئے کہ جہاں طالوت و جالوت میں لڑائی ہوئی تھی وہ کیا مقام تھا، فلسطینی بمقام سوکوہ و عزلقیاہ و آفس دمیم میں جمع ہوئے تھے اور بنی اسرائیل وادی ایلاہ میں، دونوں لشکروں کے درمیان دریائے شورق واقع تھا فلسطینی اُسکے بائیں کنارہ پر یعنی جانب جنوب تھے اور بنی اسرائیل اُسکے داہنے کنارہ پر یعنی جانب شمال تھے اور بنی اسرائیل نے دریا کو عبور کر کے فلسطینیوں پر حملہ کیا تھا پس قرآن مجید کے ان لفظوں کی کہ "ان اللہ مبتلیکم بنھر" جغرافیہ اور تواریخ سے بخوبی تصدیق ہوتی ہے۔

باقی رہا اسکے پانی پینے سے منع کرنا۔ ہر شخص جو لڑائیوں کے حالات سے واقف ہے اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم پر فوج کشی کرتی ہے تو ہر ایک شخص اُسکی قوم کا بہادر اور غیر بہادر دل چلا اور دل کا بودا قومی لحاظ سے اُسکے ساتھ ہو لیتا ہے۔ لیکن جب وقت حملہ کرنیکا آتا ہے تو سپہ سالار ایک طریقہ ایسے لوگوں کے انتخاب کرنیکا مقرر کرتا ہے جسکے سبب حملہ میں وہی لوگ شریک رہیں جو نہایت بہادر اور دل چلے ہوں اور درحقیقت اپنے دلی جوش سے لڑائی میں شریک ہوئے ہوں۔

جب جدعون نے مدیانیوں پر فوج کشی کی تھی تو اُسنے حملہ کے وقت یہ قرار دیا تھا کہ جو شخص اُس چشمہ سے جو اُسکے لشکر کے پاس تھا پانی پی لے وہ حملہ میں شریک نہ ہو اور جو نہ پیئے بلکہ صرف ہاتھ بھگو کے زبان کو

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِّنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ
وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ
وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ
بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ
مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ
يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ
اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ
هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ
سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ
عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ

تر کر لے وہ حملہ میں شریک رہے۔ اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ جن لوگوں کو لڑنے اور جان دینے میں تذبذب ہو
وہ چھٹ جائیں اور جو بالکل لڑنے اور مرنے پر آمادہ ہوں وہ حملہ میں شریک رہیں۔

اگرچہ شبہہ ہے کہ جہاں جدعون کی مدیانیوں سے لڑائی ہوئی تھی وہاں کوئی چشمہ نہیں تھا اور اسلئے
کتاب قضات میں طالوت کا واقعہ جدعون کے قصہ سے ملا دیا ہے لیکن اگر اسکو جدعون ہی
کے وقت کا واقعہ تسلیم کر لیا جاوے تو طالوت کو یہ واقعہ ضرور معلوم ہوگا اور اتفاق سے طالوت کا لشکر بھی دریا
کے کنارہ پر پڑا تھا اور دریا کے پار اتر کر حملہ کرنا قرار پایا تھا ہر طرح یقین کرنیکا موقع ہے کہ طالوت نے بھی اُسی طریقہ

یہ رسول ہیں فضیلت دی ہمنے اُن میں بعض کو بعض پر اُن میں سے وہ ہے جس سے

خدا نے کلام کیا اور اُن میں بعضوں کے درجے بلند کئے اور دیں ہمنے عیسیٰ مریم کے

بیٹے کو نشانیاں اور ہمنے اُسکی مدد کی ساتھ روح قدس کے اور اگر اللہ چاہتا تو نہ

لڑمرتے وہ لوگ جو اُنکے بعد ہوئے بعد اُسکے کہ اُنکے پاس نشانیاں بھی آئیں ولیکن

اُنھوں نے اختلاف کیا پھر اُن میں سے بعض وہ ہے جو ایمان لایا اور اُنمیں سے

(۲۵۴) بعض وہ ہے جو کافر ہوا اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑمرتے ولیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے

اے لوگو جو ایمان لائے ہو خرچ کرو اُس چیز میں سے جو ہمنے تم کو دی ہے قبل اسکے کہ

(۲۵۵) آوے وہ دن کہ اُس میں نہ بیچنا ہے اور نہ دوستی اور نہ سفارش اور کافر وہی ظالم ہیں

اللہ نہیں ہے کوئی معبود بجز اُسکے زندہ ہے ہمیشہ قایم رہنے والا ما نہ گھیرتی ہے اُسکو

اونگھ اور نہ نیند اُسی کا ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے کون ہے وہ شخص

جو شفاعت کرے اُسکے پاس مگر اُسکی مرضی سے جانتا ہے جو کچھ اُنکے آگے ہے

اور جو کچھ اُنکے پیچھے ہے اور وہ نہیں پا سکتے

اُن لوگوں کا جو حملہ میں دل سے شریک ہونیکو تھے انتخاب کرنا چاہا ہوگا اور وہی طریقہ انتخاب کا اختیار کیا ہوگا جو جدعون نے اختیار کیا تھا۔ ہاں کتاب شموئیل میں اس انتخاب کا ذکر نہیں ہے لیکن جیسا کہ ہمنے اوپر بیان کیا ہے کتاب شموئیل میں اُسکا ذکر نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ واقعہ نہوا ہو عیسائی مورخوں نے کج بحثی سے یہ اعتراض کیا ہے کہ قرآن مجید میں جدعون کے قصہ کو طالوت کے قصہ میں ملا دیا ہے پس یہ اعتراض کرنیوالونکی غلطی ہے کیونکہ تمام واقعات کو خیال کرنے سے اسبات کا یقین ہوتا ہے کہ جدعون کے عہد میں جو واقعہ ہوا ہو وہ علیحدہ ہے اور طالوت کے عہد میں جو واقعہ ہوا اور جسکا ذکر

بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ ۚ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (۲۵۶) لَآ اِكْرَاهَ
فِی الدِّیْنِ ۙ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ۚ فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ
یُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۚ وَ
اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (۲۵۷) اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۙ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ
اِلَی النُّوْرِ ۬ؕ (۲۵۸) وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ
النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۵۹)
اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ
اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ؕ قَالَ
اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ

قرآن مجید میں ہے وہ علانیہ ہے ۔ اور کم سے کم اس میں تو کچھ شبہہ نہیں ہو سکتا کہ اُس زمانہ کے یہود جب قرآن مجید نازل ہوا اِس واقعہ کا طالوت کے عہد میں بھی واقع ہونیکا یقین رکھتے تھے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو اُنہی کے مقابلہ میں قرآن مجید میں علانیہ ایسا بیان نہیں ہو سکتا تھا۔

آیتیں جن میں یہ قصہ مذکور ہے نہایت صاف ہیں صرف ایک مقام تفسیر کے قابل ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ "طالوت کے عہد سلطنت میں تابوت سکینہ کو فرشتے اُٹھا لاوینگے" تحملہ الملائکۃ، جالوت نے جب لڑائی میں مغلوب ہونیکے ڈر سے تابوت سکینہ کو بنی اسرائیل کے ملک میں بھیجدینا چاہا تو اُسکو بیلوں کی گاڑی پر لادکر

کچھ بھی اُسکے علم سے بجز اُسکے جو وہ چاہے گھیر لیا اُسکی بادشاہت نے آسمانوں کو اور زمین کو اور تھکاتی نہیں اُسکو اُنکی نگہبانی اور وہ اعلیٰ ہے بہت بڑا (۲۵۶) کچھ زبردستی نہیں ہے دین میں بلاشبہہ ظاہر ہوگئی ہے ہدایت گمراہی سے پھر جو کوئی منکر ہو غیر خدا کی پرستش کا اور ایمان لاوے اللہ پر تو بیشک اُسنے پکڑ لیا مضبوط ذریعہ جسکے لئے ٹوٹنا نہیں ہے اور اللہ سننے والا ہے جاننے والا (۲۵۷) اللہ دوست ہے اُنکا جو ایمان لائے ہیں اُنکو نکالتا ہے اندھیرے سے اُجالے میں (۲۵۸) اور جو لوگ کافر ہیں اُنکے دوست خدا کے سوا وہ ہیں جنکی وہ پرستش کرتے ہیں وہ اُنکو نکالتے ہیں اوجالے سے اندھیرے میں وہی لوگ آگ میں پڑنے والے ہیں وہی اُسمیں ہمیشہ رہینگے (۲۵۹) کیا تونے اُس شخص کو نہیں دیکھا (یعنی اُسکا حال نہیں جانا) جسنے جھگڑا کیا ابراہیم سے اُسکے پروردگار میں کیونکہ اللہ نے اُسکو بادشاہت دی تھی جبکہ ابراہیم نے کہا کہ میرا پروردگار وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے اُسنے (یعنی نمرود نے) کہا کہ میں جلاتا ہوں اور مارتا ہوں ابراہیم نے کہا کہ بیشک اللہ نکالتا ہے سورج کو مشرق سے

بنی اسرائیل کے ملک کی سرحد میں چھوڑ دیا تھا یہ قصہ شموئیل کی کتاب میں ہے ہمارے علما مفسرین نے کہدیا کہ اُن بیلوں کو جنپر کوئی ہانکنے والا نہ تھا فرشتے ہنکالائے تھے اور یہی معنی "تحملہ الملائکۃ" کے قرار دیدیئے بعض عالموں نے سمجھا کہ یہ معنی تو ٹھیک تحملہ کے لفظ کے چسپاں نہیں ہوتے اُنہوں نے یہ قیاس لگایا کہ موسیٰ کے بعد سے تابوت سکینہ کو دنیا سے اور فرشتہ اوپر اُٹھائے ہوئے تھے پھر طالوت کو لاکر دیدیا یہ سب غلط قیاس ہیں آیت کا مطلب صاف ہے کہ بنی اسرائیل کو تابوت سکینہ کے ہاتھ آنیکی بڑی خواہش تھی شموئیل پیغمبر نے جب طالوت کو بادشاہ مقرر کیا تو فرمایا کہ اُسکی بادشاہت میں تابوت سکینہ آجاوے گا" اور جو کہ اُسکا ہاتھ

فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۲۶۰﴾ أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا

آنا نہایت مشکل معلوم ہوتا تھا اسلئے اُنہوں نے کہا کہ اُسکو فرشتے اُٹھا دینگے جیسے کہ ایسے موقع پر بطور تقویت قلب کے بولا جاتا ہے۔

﴿۲۶۱﴾ (او کالذی مر علیٰ قریہ) قبل اسکو کہ اس آیت کی تفسیر بیان کیجاوے لفظ "کالذی" میں جو حرف کاف ہے اُس پر جو بحث ہے وہ بیان کرنی چاہیئے۔ علمائے نحویں سے کسائی اور فرا، اور ابو علی فارسی کا یہ قول ہے کہ اس سے پہلی آیت میں جہاں فرمایا ہے کہ "الم تر الی الذی حاج ابراھیم" وہاں بھی "الذی" کی جگہ "کالذی" مراد ہے اور پھر اس آیت میں جو "او کالذی" آیا ہے اُسکا عطف پہلی آیت کے معنوں پر ہے نہ لفظ پر۔ یہ بحث تو صرف سیاق عبارت سے اور ایک نحوی قاعدہ سے متعلق ہے، اس بحث سے یہ مطلب حل نہیں ہوتا کہ الذی پر کاف تشبیہہ لانے سے جو یہ معنی ہو گئے ہیں کہ "اُس شخص کی مانند" تو مانند کے کہنے سے کیا مطلب ہے۔ اخفش نے اس بحث کو نہایت مختصر کر دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہاں کاف زائد ہے مگر کاف زاید لانے کی اور اُسکے زاید ہونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی صاف بات تھی کہ پہلی آیت میں بتایا تھا کہ "کیا تو نے نہیں دیکھا اُس شخص کو جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا" اور دوسری آیت میں فرمایا کہ "کیا تو نے نہیں دیکھا اُس شخص کو جو ایک قریہ میں گذرا" پھر دوسری جگہ کاف زاید لانے کی اور "مانند اُس شخص کے جو ایک قریہ میں گذرا" کہنے کی کیا حاجت تھی۔ مبرد نحوی دوسری آیت میں چند لفظ محذوف مانتا ہے اور اُسکا قول ہے کہ تقدیر آیت کی یوں ہے "والم تر الی من کان کالذی مر علیٰ قریۃ" یعنی تو نے کیا نہیں دیکھا اُس شخص کو جو تھا مثل اُس شخص کے جو ایک قریہ پر گذرا، مگر اس سے بھی آیت کا مطلب نہیں کھلتا اور یہی سوال باقی رہتا ہے کہ مثل اُس شخص سے کیا مطلب ہے۔

صاحب بیضاوی نے غالباً ان مشکلات کو خیال کیا ہے اور ایک اور قول بیان کرنے سے اپنی دانست میں اُن مشکلات کو حل کیا ہے اور لکھا ہے کہ "او کالذی مر علیٰ قریۃ" حضرت ابراہیم کا قول ہے اور سوال مقدر کا

پھر تو اُسکو مغرب سے نکال پھر دنگ رہگیا وہ شخص جو کافر تھا اور اللہ نہین ہدایت کرتا ظالم لوگون کو (۲۶۰) یا ر تو نے اُس شخص کو نہیں دیکھا یعنی اُسکا حال نہیں جانا جسنے رویا میں دیکھا) کہ گویا وہ گذرا ایک شہر پر ایسی حالت میں کہ وہ سر کے بل گرا ہوا تھا

جواب ہے یعنی جب نمرود نے حضرت ابراہیم سے کہا کہ "میں زندہ کرتا ہوں" تو حضرت ابراہیم نے کہا کہ اگر تو زندہ کرتا ہے تو اسطرح زندہ کر جسطرح کہ خدا نے اُس شخص کو زندہ کیا تھا جو ایک قریہ پر گذرا تھا اس تفسیر کے مطابق تقدیر آیت کی یہ ہوتی ہے کہ "ان کنت تحیی فاحی کاحیاء اللہ الذی مر علی قریۃ" نتیجہ اسکا یہ ہوا کہ لفظ کاف سے اُس شخص کی مانند مراد نہیں بلکہ جسطرح وہ زندہ ہوا تھا اُس طرح زندہ کرنے کی مانند مراد ہے۔ اور پھر قاضی بیضاوی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ شخص جو زندہ ہوا تھا یا تو عزیر تھے یا خضر تھے یا کوئی کافر منکر بعث تھا۔ عزیر تو ہو نہیں سکتے کیونکہ وہ حضرت ابراہیم کے زمانہ کے بہت بعد ہوئے ہیں۔ اور یہ معلوم نہیں کہ قاضی صاحب نے خضر سے مراد کس سے لی ہے اور یہ واقعہ خضر پر کب گذرا تھا۔ اور نہ یہ معلوم کہ وہ کافر منکر بعث کون تھا رجماً بالغیب جو کچھ جی میں آیا یا سُنا لکھدیا۔ راوی کی روایت اگر وہ کیسی ہی صریح البطلان ہو اتفسیر و نمیں قصوں کے لکھدینے کو کافی ہے پس یہ قول حضرت ابراہیم کا کسیطرح نہیں ہو سکتا۔ اگر قرآن مجید کا ٹھیک ٹھیک ادب کیا جاوے اور اُسکو دیو و پری کا قصہ نہ قرار دیا جاوے جیسے کہ عجب پسند مسلمان قرار دیتے ہیں تو آیت کے معنی نہایت صاف ہیں۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ کاف حرف تشبیہ کا ہے اور "کانّ" بھی اُسی کاف تشبیہ سے بنا ہے اور کاف تشبیہ کو بسبب کسی ضرورت کے مثلاً بغرض اہتمام تشبیہ یا تبدیل سیاق کلام یا کسی اور ضرورت کے مشبہ بہ سے جدا کر کے مقدم کر دینا جائز ہے مثلاً "زید کالاسد" ہے جب کاف تشبیہ کو کسی سبب سے جدا کر کے مقدم کریں تو یوں کہیں گے "کانّ زیداً الاسد" اس مقام پر بھی الذی مشبہ بہ نہیں ہے بلکہ اُس سے اُس شخص کے مرور کی تشبیہ یا تمثیل مراد ہے پس تقدیر آیت کی یہ ہے کہ "الم تر الی الذی کانہ مر علی قریۃ" یعنی کیا نہیں دیکھا تو نے اُس شخص کو جو گویا کہ گذرا تھا ایک قریہ پر، درحقیقت وہ شخص گذرا نہیں تھا بلکہ اُسنے رویا میں دیکھا تھا کہ میں ایک قریہ پر گذرا ہوں جو ویران پڑا ہے اور جو تقدیر آیت کی ہمنے بیان کی اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اُس شخص کا حال بیان کیا جاتا ہے جو یہ سمجھا تھا کہ گویا میں ایک قریہ

قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ

میں گیا ہوں اور اسطرح کا بیان صریح دلالت کرتا ہے کہ وہ رویا کا واقعہ ہو۔ مگر نحوی قاعدے کے موافق ،، کانّ ،، کا لفظ الذی موصول کے صلہ میں واقعہ نہیں ہو سکتا اس ضرورت سے حرف تشبیہ یعنی لفظ کانّ کو مقدم لانا پڑتا تھا اور وہ مقدم نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اُسکی اسم و خبر صلہ کے جزو تھے اس لئے حرف کاف جو اصل لفظ تشبیہ کا تھا وہ اُسکی جگہ مقدم کیا گیا۔

قرآن مجید میں اُس شخص کا جسکا رویا بیان ہوا ہے ذکر نہیں ہے اور نہ اُس قریہ کا ذکر ہے جسمیں گذرنا اُس شخص نے رویا میں دیکھا تھا، غالبًا اُس قریہ کے تعین کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ اُس شخص نے رویا میں دیکھا ہوگا کہ میں ایک قریہ میں گذرا ہوں جو ویران پڑا ہے البتہ اُس شخص کی جس نے یہ رویا دیکھا اُسکی تعین کرنی چاہیئے۔ غالبًا آنحضرت کے زمانہ میں اُس شخص کے نام کو ہر کوئی جانتا ہوگا مگر اب ہمارے پاس اُس شخص کا نام متعین کرنیکو بجز روایات اور تاریخی واقعات کے اور کچھ نہیں ہے۔ تاریخی واقعات سے جہانتک کہ تحقیق ہو سکتے ہیں اور جن پر اعتماد ہو سکتا ہے اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ شخص حضرت نحمیا نبی تھے۔

توریت میں جو واقعات بیت المقدس کی ویرانی کے لکھے ہیں اور جو زمانہ اُسکا قرار دیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بخت نصر نے ۵۹۰ سنہ قبل مسیح میں بیت المقدس کا محاصرہ کیا اور ۵۸۸ سنہ قبل مسیح میں بیت المقدس کو فتح کر لیا اور معبد کو جلا دیا اور بیت المقدس کو ویران کر دیا مگر کیخسرو بادشاہ ایران نے غلبہ پا کر یہودیوں کو قید بابل سے آزاد کیا اور ۵۴۶ سنہ قبل مسیح کے اُنہوں نے بیت المقدس میں واپس آکر قربانیاں کیں اُسکے بعد کسی بادشاہ نے یہودیوں کو بیت المقدس کی تعمیر کی اجازت دی اور کسی نے پھر منع کر دیا پھر ۵۱۸ سنہ قبل مسیح میں دارا نے بیت المقدس کی تعمیر کی اجازت دیدی مگر یا مان کی دشمنی سے ہرج پڑتا رہا۔

۴۶۷ سنہ قبل مسیح کے عزیر پیغمبر بیت المقدس میں گئے اور یہودیوں کی بھلائی کا زمانہ شروع ہوا مگر بیت المقدس اُسیطرح جلا ہوا اور ڈھیا ہوا پڑا تھا حضرت نحمیا نبی کو اسکا نہایت رنج تھا اُنہوں نے خدا سے بہت التجا اور دعا کی کہ وہ کسیطرح پھر تعمیر ہو، ایک دفعہ ارتخشستا کی بادشاہ

اُسنے کہا کہ کیونکر زندہ کریگا (یعنی آباد کریگا) اللہ اُسکو اُسکے مرجانے کے (یعنی ویران ہونیکے) بعد پھر اللہ نے اُسکو سو برس تک مرا ہوا رکھا پھر اُسکو اُٹھایا خدا نے کہا کہ کتنی دیر تک تو پڑا رہا اُسنے کہا کہ میں پڑا رہا ایک دن یا کچھ کم ایک دن

کے حضور میں حاضر تھے بادشاہ نے پوچھا کہ تم کیوں رنجیدہ ہو اُنہوں نے کہا کہ میں کیونکر رنجیدہ نہوں کہ وہ شہر جس میں ہمارے بزرگوں کے مزار ہیں ویران پڑا ہے اور اُسکے دروازے آگ سے جلے پڑے ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا کہ پھر تو کیا چاہتا ہے حضرت نحمیا نے کہا کہ آپ مجھکو وہاں جانے دیں تاکہ میں اُسکو پھر تعمیر کروں۔ بادشاہ نے اجازت دی اور ایک میعاد مقرر کی کہ اس عرصہ میں تعمیر کرکے واپس آجانا۔

جب حضرت نحمیا بیت المقدس کی تعمیر میں مصروف تھے تو لوگ اُن پر ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ کیا وہ بیت المقدس کو بنالیں گے اور اُسکے پتھروں کو جو جلے ہوئے اور خاک کے ڈھیروں کے تلے جمع ہیں نکال لیں گے۔ کتاب نحمیا سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نحمیا کو بیت المقدس کی تعمیر کی بڑی فکر تھی اور خدا کے سامنے ہمیشہ التجا اور دعا کیا کرتے تھے۔ بلاشبہ اُنکے دل میں یہہ بات گذری ہوگی کہ اس شہر کے مرجانے یعنی ویران ہو جانے کے بعد کسطرح اللہ تعالیٰ اُسکو زندہ یعنی آباد کریگا اُنہیں تردوات اور خدا سے التجا کرنے کے زمانہ میں جیسا کہ مقتضائے فطرت انسانی ہے حضرت نحمیا نے رویا میں دیکھا اور اُنکو تسلی ہوئی کہ بیت المقدس آباد اور تعمیر ہو جائیگا اُسی رویا کا ذکر اس آیت میں ہے اور وہ رویا یہہ ہے کہ اُنہوں نے دیکھا کہ میں ایک قریہ میں گیا ہوں جو بالکل ڈھہا ہوا اور ویران پڑا ہے رویا ہی میں اُنہوں نے کہا کہ اس قریہ کے اسطرح مرجانے یعنی ویران ہو جانیکے بعد کسطرح خدا اُسکو زندہ یعنی آباد کریگا اُسی حالت میں اُنہوں نے دیکھا کہ میں مرگیا ہوں اور پھر جی اُٹھا ہوں رویا میں اُنسے کسی نے کہا کہ کتنی دیر تک تم پڑے رہے اُنہوں نے کہا کہ ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم اُس نے کہا کہ تم سو برس تک پڑے رہے اپنے کھانے اور اپنے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ وہ تو نہیں بگڑیں اور اپنے گدھے کو دیکھو کہ اُسکا کیا حال ہو گیا ہے اور دیکھو کہ پھر اصلی ہڈیاں کسطرح ہلتی ہیں اور کسطرح اُنکے اوپر گوشت چڑہتا ہے اس عجیب رویا سے اُنکو تسلی ہوئی کہ

قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۶۱) وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ

بیت المقدس ضرور تعمیر ہو جاویگا۔ پس یہی قصہ جو خدا کی قدرت اور حکمت اور عظمت کو جتاتا ہے اس آیت میں بیان ہوا ہے۔

ہمارے مفسرین کی عادت ہے کہ سیدھی بات کو بھی ایک عجوبہ بات بنا کر بیان کرتے ہیں اور سنی سنائی باتیں نا تحقیق اور قصے اور کہانیاں اُسمیں شامل کر دیتے ہیں اسیطرح اسمیں بھی کیا ہے، باایں‌ہمہ جب اُن تمام باتوں پر غور کیا جاتا ہے تو جو اصل بات ہے وہ بھی اُسمیں سے نکل سکتی ہے، چنانچہ اس مقام پر بھی جو روایت ابن عباسؓ کے نام سے تفسیر کبیر میں بیان کی ہے اُس سے پایا جاتا ہے کہ یہ تمام واقعہ جو اِس آیت میں بیان کیا گیا ہے وہ ایک رویا تھا اُس روایت میں بجائے حضرت نحمیا کے حضرت عزیر کا نام لکھا ہے ممکن ہے کہ وہ خواب دیکھنے والے حضرت عزیر ہی ہوں مگر تاریخ سے مطابقت کرنے سے حضرت نحمیا کا ہونا زیادہ تر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اُسی روایت میں لکھا ہے کہ جب وہ بیت المقدس میں پہونچے تو وہاں انجیر اور انگور پھل رہے تھے اُنھوں نے انجیر اور انگور کھائے اور انگوروں کو نچوڑ کر اُنکا شیرہ پیا اور سو رہے اور سوتے ہی کی حالت میں خدا تعالیٰ نے اُنکو مردہ کر دیا اور سو برس تک مرے پڑے رہے۔ ان لفظوں سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ علمائے متقدمین کی بھی یہ رائے تھی کہ یہ واقعہ حالت نوم میں گذرا تھا جسکو ہمنے سیدھی طرح رویا سے تعبیر کیا ہے باقی قصہ جو اِس روایت میں لکھا ہے محض بے اصل ہے جسکے لئے کوئی سند نہیں ہے۔

کھا بلکہ تو پڑا رہا سو برس پھر دیکھ اپنے کھانے کو اور اپنے پینے کو (کیا) وہ نہیں بگڑا ہے اور دیکھ اپنے گدہے کو (کیا وہ نہیں گل گیا ہے) اور میں چاہتا ہوں کہ تجھکو ایک نشانی آدمیون کے لئیے بناؤں اور دیکھ ہڈیوں کو کسطرح ہم اُنکو حرکت میں لاتے ہیں پھر اُنکو گوشت پہناتے ہیں پھر جب اُسکو (یہ بات) ظاہر ہوئی اُسنے کھا (حالت بیداری میں) میں جانتا ہوں کہ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے (۲۶۱) اور جب کھا ابراہیم نے (خواب میں) اے پروردگار مجھکو دکھا کہ کس طرح تو زندہ کریگا مردوں کو خدا نے کھا کیا تو یقین نہیں کرتا ابراہیم نے کھا کیوں نہیں ولیکن میں چاہتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہو جاوے خدا نے کھا کہ لے چار پرندون کو پھر اُنکے ٹکڑے

قرآن مجید کا سیاق کلام اسطرح پر واقع ہوا ہے کہ جو قصے اُس میں بیان کئے گئے ہیں اُنکا مقصد بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے، چنانچہ حضرت یوسف کے خواب کا جہان ذکر ہے وہان بھی اسیطرح بیان ہے کہ حضرت یوسف نے اپنے باپ سے کھا کہ میں نے گیارہ ستارون اور چاند اور سورج کو اپنے تئیں سجدہ کرتے دیکھا، اور یون نہیں بیان کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ چاند اور سورج مجکو سجدہ کرتے ہیں، کیونکہ خواب میں دکھنا قرینہ مقام سے علانیہ روشن تھا اسیطرح اس مقام پر بھی حضرت نحمیا کے خواب کا مقصد بیان کیا گیا ہے اور قلما تبین لہ کے لفظ سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ تمام واقعات جو اس ایت میں بیان ہوئے ہیں رویا میں واقع ہوئے تھے۔

(۲۶۲) (واذ قال ابراھیم) جسطرح کہ پہلی آیت کے سیاق کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا قصہ ایک رویا کا واقعہ تھا اسیطرح اس قصہ کا بھی رویا میں واقع ہونا پایا جاتا ہے۔ اول تو اس وجہ سے کہ سب سے اول جو قصہ ابراہیم کا نمرود کے ساتھ بیان ہوا اور واقعی قصہ تھا اُس سے ابراہیم کے اس قصہ کو علیحدہ کر کے اُس قصہ کے بعد بیان کیا ہے جو رویا میں واقع ہوا تھا دوسرے یہ کہ کیفیت احیاء موتیٰ امر مشاہد بالعین نہیں ہے اگر کوئی شخص کسی مردہ کو زندہ کر دے یا بیمار کو اچھا کر دے تو اسقدر مشاہدہ ہو سکتا ہے کہ مردہ زندہ یا بیمار اچھا ہو گیا مگر اسکی کیفیت احیاء و کیفیت صحت امر مشاہد نہیں ہے اور اسلئے لفظ ارنی سے

إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۶۲﴾ مَّثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۶۳﴾ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

کسی ایسے امر سے مراد نہیں ہے جو وقوع فی المشاہدہ ہو بلکہ ارائت قلبی مراد ہے پس گویا حضرت ابراہیم کا یہ کہنا ہے کہ اے رب میرے دلکو بتادے کہ مردے کسطرح زندہ ہونگے۔ تیسرے یہ کہ اس قسم کے ترددات جو بزرگوں کو اور اہل علم کو واقع ہوتے ہیں اُنکا رفع اور تسلی اُسی طریق سے ہوتی ہے جسکو مشاہدات یا مکاشفات یا رویا سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو فطرت انسانی کے بالکلیہ مطابق ہے۔ حضرت ابراہیم نے اور نہ اُنسے پیشتر کسی نے اِس دنیا میں مردوں کا زندہ ہونا دیکھا تھا اور اسلئے کوئی ذیعقل خدا سے ایسا سوال نہیں کر سکتا تھا۔ پس صاف پایا جاتا ہے کہ جو تعجب احیاء اموات کی نسبت حضرت ابراہیم کے دل میں پیدا ہوا تھا اُسی کا رفع ہونا چاہیے تھا اور اُس کا رفع ہونا نہ دنیاوی مشاہدہ اور نہ ان ظاہری آنکھوں کے دیکھنے سے علاقہ رکھتا تھا پس اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قصہ جو یہاں مذکور ہوا ہے وہ ایک رویا حضرت ابراہیم کا ہے۔ اُنھوں نے رویا میں خدا سے کہا کہ مجھکو دکھلا یا بتا کہ تو کسطرح مردی زندہ کریگا پھر خواب ہی میں خدا کے بتلانے سے اُنھوں نے چار پرند جانور لئے اور اُنکا قیمہ کر کے ملا دیا اور پہاڑوں پر رکھدیا پھر بُلایا تو وہ سب جانور الگ الگ زندہ ہو کر چلے آئے اور اُنکے دلکو مردوں کے زندہ ہونے سے جنکے اجزا بعد مرنے کے عالم میں مخلوط و منتشر ہو جاتے ہیں طمانیت ہو گئی۔

کل مسلمان عالموں اور قدیم مفسروں کو بھی اس بات پر یقین نہیں تھا کہ حضرت ابراہیم نے سچ مچ جانوروں کا قیمہ کر کے پہاڑ پر رکھدیا تھا اور اسلئے اِس آیت کی نسبت مفسرین کی تین رائیں قایم ہوئی ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جنکی یہ رائے ہے کہ در حقیقت حضرت ابراہیم نے جانوروں کا قیمہ کر کے پہاڑوں پر رکھدیا اور پھر جب بُلایا تو

اپنے پاس کر ڈال پھر رکھدے ہر پہاڑ پر اُنمیں سے ایک ٹکڑا پھر اُنکو بلا تیرے پاس چلے آئینگے دوڑتے ہوئے اور جان لے کہ بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا (۲۶۲) مثال اُن لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنا مال خدا کی راہ میں مانند مثال ایک دانہ کے ہے جو نکالے سات بالیں ہر بال میں سو دانے اور اللہ دو چند کر دیتا ہے جسکے لئے چاہتا ہے اور اللہ وسعت والا ہے جاننے والا (۲۶۳) جو لوگ کہ خرچ کرتے ہیں اپنا مال اللہ کی راہ میں

زندہ ہو کر چلے آئے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو صرہن کے معنی قیمہ کرنے کے نہیں لیتے بلکہ اپنے سے ملا لینے کے لیتے ہیں اور جزء کے معنی ہر ایک جانور کے جزء کے نہیں لیتے بلکہ مجموعہ جانوروں میں سے بعض مراد لیتے ہیں جس سے آیت کا مطلب صرف یہ رہ جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے چند جانور اپنے سے ہلائے اور پھر کوئی جانور کسی پہاڑ پر اور کوئی کسی پہاڑ پر چھوڑ دیا اور پھر جب بلایا تو سب چلے آئے۔ لیکن اگر ایسا کیا ہو تو یہ تو لڑکوں کا کھیل ہوا اس سے احیاء اموات سے کیونکر طمانیت ہو سکتی ہے۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ جانوروں کا قیمہ کرنا اور پہاڑوں پر رکھنا واقع نہیں ہوا بلکہ جب خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو ایسا کرنیکا حکم دیا تو اس حکم سے حضرت ابراہیم کے دلکو طمانیت ہو گئی پھر اُنھوں نے نہ جانور پکڑے نہ انکا قیمہ کیا نہ پہاڑوں پر رکھا۔ گو یہ پچھلے گروہ مفسرین کے بھی اُس اَمر کے واقع ہونے سے یعنی جانوروں کے قیمہ کرنے اور پھر اُنکے زندہ ہونے سے انکار کرتے ہیں مگر ہماری سمجھ میں اِن تینوں گروہ نے رویا کے واقعات کو ظاہری واقعات سمجھنے میں غلطی کی ہے۔

عیسائی بحث کرنیوالوں نے ہمارے مفسرین کے لغو اقوال کو غنیمت سمجھا اور بلا تحقیق اصل مطلب کے قرآن مجید پر اعتراض کرنیکو موجود ہوئے۔ کتاب حزقیل میں حضرت حزقیل کے رویا کا ذکر ہے کہ وہ ایک جنگل میں جسمیں آدمیوں کی بہت سی ہڈیاں پڑی تھیں پہونچے خدا نے کہا کہ کیا یہ ہڈیاں زندہ ہو سکتی ہیں پھر حزقیل نے اُن ہڈیوں سے خدا کے حکم سے کہا کہ تم زندہ ہو گی تم پر رگ اور گوشت آجاویگا اور جان پڑ جاویگی

ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ
مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۵﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى
كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا
لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۶﴾
وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا
مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ
فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۷﴾ اَيَوَدُّ
اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ

اور تم زندہ ہو جاؤگی چنانچہ وہ ہڈیاں ہلیں اور گوشت وغیرہ پیدا ہوا پھر وہ سب اسیطرح زندہ ہو گئیں
اور توریت کتاب پیدائش باب پندرھویں میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم کو بیٹا پیدا ہونیکی بشارت
کے وقت خدا نے کہا تھا کہ چار جانور لے اور اُنکے دو دو ٹکڑے کرکے ہر ایک ٹکڑے کو اُسکے
مقابل رکھدے۔ حضرت ابراہیم نے چارپایوں کے تو ٹکڑے کئے مگر پرندوں کے ٹکڑے نہیں کیے
اور پھر اُسکو نیند آگئی اور وہ سو گیا۔ پس عیسائیوں نے مفسرین کی بغو نا تحقیق روایتوں کو دیکھ کر کہدیا
کہ یہ دو نو قصے جو قرآن مجید میں موجود ہیں اور جنکے ساتھ مفسرین نے روایتیں ملائی ہیں وہ

پھر جو کچھ کہ اُنھوں نے خرچ کیا ہے اُسکا پیچھا نہیں کرتے احسان جتاکر اور نہ ایذا رسانی
سے رنج دیکر اُنکے لئے اُنکا بدلا ہے اُنکے پروردگار کے پاس اور نہ اُن پر کچھ خوف ہی
اور نہ وہ غمگین ہونگے (٢٦٣) بات اچھی کہنی اور معاف کرنا بہتر ہے ایسی خیرات سے
جسکے پیچھے رنج دینا ہو اور اللہ غنی ہے بردبار (٢٦٥) اے لوگو جو ایمان لائے ہو نہ ٹیا میل
کرو اپنی خیراتون کو احسان جتانے سے اور رنج دینے سے اُس شخص کی مانند
جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگون کے دکھلاوے کو اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر
اور اخیر دن پر تو اُسکی مثال ایسی ہے جیسے پتھر جسپر کچھ مٹی ہو پھر پڑے اُس پر زور
کا مینہہ اور چھوڑ جاوے اُسکو صفاچٹ، وہ کسی چیز پر جو اُنھوں نے کمائی ہی
قدرت نہین رکھتے اور اللہ ہدایت نہیں کرتا کافرونکی قوم کو (٢٦٦) اور مثال اُن لوگونکی
جو خرچ کرتے ہیں اپنا مال اللہ کی رضامندی چاہنے کو اور اپنے دلی اعتقاد سے
مانند مثال ایک باغ کے ہی جو بلندی پر ہو پڑی اُسپر زور کا مینہہ پھر وہ اپنے پھل دوچند لاوے اور اگر
اُسپر زور کا مینہہ نہ پڑی تو شبنم ہی اُسکو کافی ہی اور اللہ اُس چیز کو جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے (٢٦٧)
کیا تم میں سے کوئی چاہتا ہے کہ اُسکا ایک باغ ہو کھجورون

اِن دونوں قصوں سے جو توریت میں مذکور ہیں بنائی گئی ہیں - مگر ہم اُسوقت اُن ناقابل فہم قصوں
پر جو توریت میں اور کتاب حزقیل میں مذکور ہیں بحث نہیں کرتے بلکہ صرف اسقدر بتانا چاہتے
ہیں کہ قرآن مجید میں جو یہ دونوں قصے مذکور ہیں اُن سے اور توریت و کتاب حزقیل کے
مندرجہ قصوں سے کچھ تعلق نہیں ہے -

وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ
وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ
فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۸﴾ يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ
وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ ﴿۲۶۹﴾ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا
فِيْهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۷۰﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ
بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۱﴾ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ
مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا وَمَا يَذَّكَّرُ
اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۷۲﴾ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ
اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ
وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ
سَيِّاٰتِكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۳﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ

اور انگوروں کا بہتی ہوں اُنکے نیچے نہریں اور اُس شخص کے لئے اُس باغ میں ہر طرح کی میوی
ہوں اور اُس شخص پر بڑھاپا آگیا ہو اور اُس کی اولاد ناتواں ہو پھر اوس باغ پر لو کا جھوکا
آیا جس میں آگ تھی پس اُس نے جلادیا، اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمھارے
لئے نشانیاں تاکہ تم فکر کرو (۲۶۸) اے لوگو جو ایمان لائے ہو خرچ کرو پاک کمائی
میں سے جو تمنے کمایا ہے اور اُس میں سے جو ہمنے تمھارے لئے زمین میں سے
نکالا ہے اور مت ارادہ کرو کہ اُس میں سے خراب کو خرچ کرو (۲۶۹) اور تم بھی تو اُس
خراب کو نہیں لیتے مگر یہ کہ چشم پوشی کرو اُس میں اور جان لو کہ بیشک اللہ
غنی ہے تعریف کیا گیا (۲۷۰) شیطان تم کو وعدہ دیتا ہے محتاجی کا اور تم کو حکم
کرتا ہے بے حیائی کا اور اللہ تم کو وعدہ دیتا ہے اپنی بخشش کا اور فضل کا
اور اللہ وسعت والا ہے جاننے والا (۲۷۱) حکمت عطا کرتا ہے جسکو چاہتا ہی
اور جسکو حکمت عطا کی گئی تو بیشک اُسکو بہت سی بھلائیاں عطا ہوئیں اور نصیحت
نہیں پکڑتے مگر عقل والے (۲۷۲) اور جو کچھ خرچ کیا تمنے خرچ میں سے یا نذر مانی
تمنے نذر ماننے سے تو بیشک اللہ اُسکو جانتا ہی اور ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں ہے
اگر تم اپنی خیراتوں کو ظاہر کردو تو یہ بھی اچھا ہے اگر تم اُنکو چھپاؤ اور اُنکو فقیروں کو دیدو تو وہ بھی تمھارے
لئے اچھا ہے اور دور کریگا تمسے تمھاری گناہوں میں سے اور اللہ اُس چیز کو جو تم کرتے ہو جانتا ہی (۲۷۳)
(ای محمدؐ) اُنکی ہدایت کا تیرا ذمہ نہیں ہے ولیکن اللہ ہدایت کرتا ہے جسکو چاہتا ہے

وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ (۲۷۴) الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲۷۵) الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا

(۲۷۶) "واحل اللہ البیع و حرم الربوا" حضرت عمر نے کہا کہ رسول خدا صلعم نے انتقال فرمایا اور ربا کی تفسیر ہم سے نہیں فرمائی۔ یعنی ہمکو اس بات کے دریافت کرنیکا موقع نہیں ملا کہ ربا جسکو خدا نے حرام فرمایا ہے وہ کیا ہی اور کونسا ربا ہے جو حرام ہوا ہے اور جسپر ایسی سخت وعید نازل ہوئی ہے، پس جبکہ اتنے بڑے خلیفہ رسول اللہ صلعم کو ربا کی حقیقت پر تشفی نہ تھی تو ضرور تھا کہ صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین اور علماے امت میں اختلاف راے ہو اور ہر ایک اپنے اجتہاد کے موافق اسکی نسبت مسائل قرار دے، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہوتا ہی اور ہوگا اور اس چودھویں صدی نبوی میں جسکا یہ دسواں برس ہے میں بھی بقدر اپنے فہم کے علماے امت سے اس مسئلہ میں مختلف راے رکھتا ہوں۔

اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو خیرات سی تو تمھارے ہی لئے ہے اور تم نہ خرچ کروگے مگر اللہ کی خاص
رضامندی چاہنے میں اور جو کچھ کہ خرچ کروگے تم خیرات سے پورا پہونچایا جائیگا تمھارے
پاس اور تم مظلوم نہ ہوگے خیرات اُن فقیروں کیلئے ہے جو روکے ہوئے ہیں (یعنی سوال کرنے
سے اللہ کی راہ میں نہیں استطاعت رکھتے چلنے کی زمین میں (یعنی سفر کرنے کی) گمان کرتا
ہے نادان اُنکو دولت مند سوال سی باز رہنے کے سبب سی تو اُنکو پہچانتا ہے اُنکے چہرہ سے
نہیں سوال کرتے لوگوں سے لپٹ کر اور جو کچھ کہ تم خرچ کروگے خیرات سے تو بیشک اللہ اُسکا
جاننے والا ہی (۲۷۴) جو لوگ کہ خرچ کرتے ہیں اپنا مال رات کو اور دن کو چھپے ہوا اور ظاہر اتو
اُنکے لئے اُنکا بدلا ہی اُنکے پروردگار پاس اور نہ خوف ہے اُنپر اور نہ وہ غمگین ہونگے (۲۷۵) جو لوگ کہ سود
کھاتے ہیں نہیں کھڑے ہونگے مگر جسطرح کہ کھڑا ہو وہ شخص جسکو مخبوط کردیا ہو شیطان نے چھونے
سے یہ اسلئے ہی (یعنی اُنکا خبط یہی) کہ وہ کہتے ہیں کہ بیچنا بھی تو مثل سود ہی لینے کے ہے
اور اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام

علمای امت اور فقہاے اسلام نے ربا کی دو قسمیں کی ہیں ایک ربا الفضل دوسری ربا النسیئہ۔ ربا الفضل سی ایسی بڑھوتری
مراد ہے کہ ہم جنس چیز کے دست بدست مبادلہ کرنے میں لی دی جاوے۔ اس قسم کے ربا کی حرمت زیادہ تر حدیثوں پر
مبنی ہے اور اس باب میں کہ کونسی ہمجنس چیزوں کے مبادلہ میں بڑھوتری لینا ربا ہے ائمہ مجتہدین میں اختلاف ہے
امام ابو حنیفہ کے نزدیک اُس ہمجنس مال کے مبادلہ میں بڑھوتری ربا ہے جو پیمانہ سے بکتا یا وزن سے تلتا ہو
امام شافعی کے نزدیک وہ مال یا خود قیمتی ہو جیسے چاندی سونا یا شے خوردنی ہو۔
امام مالک کے نزدیک وہ مال یا خود چاندی و سونا ہو یا ایسا ہو جس سے انسان کا قوت ہوتا ہو یا جو اُسکی

فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِى الصَّدَقٰتِ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ

اصلاح کرتا ہو جیسے کہ نمک۔

اِن اختلافات کا نتیجہ یہ ہے کہ امام شافعی کے نزدیک چاندی اور سونے کے سوا باقی ایسی چیزوں کے مبادلہ کی بڑھتی پر جو کھانے میں نہیں آتیں جیسے لوہا اور چونا وغیرہ ربا کا حکم نہیں ہے اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک ربا کا حکم ہے۔

اور جب کہ قلیل مقدار کا غلہ جو ایک صاع سے کم ہو مبادلہ کیا جاوے تو اُسکی بڑھوتری پر امام ابو حنیفہ کے نزدیک ربا کا حکم نہیں ہے اور امام شافعی کے نزدیک ربا کا حکم ہے۔

اور جو پھل وغیرہ اشیاء خوردنی پیمانے یا وزن سے نہیں بکتی تھیں اُنکی بڑھوتری پر بھی امام ابو حنیفہ کے نزدیک ربا کا حکم نہیں ہے اور امام شافعی کے نزدیک ربا کا حکم ہے۔

امام مالک کے نزدیک جیسا کہ اُنکی کتاب مؤطا میں مذکور ہے چاندی اور سونے کے سوا اور چیزوں پر جو وزن سے بکتی ہیں جیسے تانبا سیسہ چونہ لوہا کسم وغیرہ یا ایسا میوہ جو تازہ کھانے میں آتا ہے اور سکھلا کر ذخیرہ نہیں کیا جاتا اُسکے مبادلہ میں بڑھوتری پر ربا کا حکم نہیں ہے۔

ہم جنس ہونے میں اچھے اور بُرے یا کھرے اور کھوٹے ہونے میں کچھ فرق نہیں ہے کھرا سونا کھوٹے سونے سے اور کھری چاندی کھوٹی چاندی سے اور اچھی کھجوریں بُری کھجوروں سے یا سفید گیہوں لال گیہوں سے اگر بدلے جاویں تو ضرور ہے کہ برابر کے برابر بدلے جاویں اگر اُنکے مبادلہ میں بڑھوتری لیجاوے تو وہ بھی ربا میں داخل ہے۔

مجھکو جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس قسم کے مبادلہ کو جو اُس ربا میں داخل کیا ہے جسکا ذکر اس آیت میں ہے یہ علانیہ غلطی ہے اِس قسم کے مبادلوں کی بڑھوتری سے اِس آیت کو کچھ تعلق نہیں ہے بلاشبہ حدیثوں میں اِس قسم کے مبادلوں کی بڑھوتری پر بھی ربا کا اطلاق کیا گیا ہے مگر اُس ربا سے یہ ربا جسکا ذکر اس آیت میں ہے مراد نہیں ہے۔ ربا کا اطلاق اُس فائدہ پر بھی ہوتا ہے جو بیع فاسد کے ذریعہ سے کوئی شخص

پس جس کے پاس کہ اُس کے پروردگار سے کوئی نصیحت آوے تو وہ باز رہے پھر اُسکے لئے ہے جو کچھ کہ گذرا اور اُسکا کام خدا کے حوالہ ہے اور جسنے کہ پھر کیا تو وہ آگ میں پڑنیوالے ہیں وہ اُسی میں ہمیشہ رہیں گے (۲۷۶) مٹاتا ہے اللہ سود کو اور بڑہاتا ہے خیراتوں کو اور اللہ نہیں دوست رکھتا کسی کفر کرنے والے گنہگار کو،

حاصل کرے جیسے کہ حدیث میں آیا ہے،، من اجبی فقد اربی،، اجبا کے معنی کسی درخت کے پھل کو پھل کے آنے سے پیشتر بیچ ڈالنے کے ہیں جیسے کہ ہندوستان میں آم کے درختوں کا پھل صرف مور آنے پر قبل اُسکے کہ آم پیدا ہوں بیچ ڈالا جاتا ہے ایسی خرید فروخت میں یا تو بایع ایسا فائدہ اُٹھاتا ہے جسکے مقابلہ میں درحقیقت اُس نے کوئی جنس نہیں دی یا مشتری ایسا فائدہ اُٹھاتا ہے جسکے مقابلہ میں درحقیقت اُسنے کوئی مال نہیں دیا اور اسی لئے اُس معاملہ پر ربا کا اطلاق کیا گیا ہے مگر درحقیقت یہ معاملہ بیع فاسد کا ہے اور اُس ربا کی تفسیر میں داخل نہیں جسکا ذکر اِس آیت میں ہے۔

بخاری و مسلم نے اسامہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ،، الربوا فی النسیئة،، یعنی ربا اُدہار میں ہے اور ایک روایت میں ہے کہ،، لا ربوا فیما کان یدا بید،، یعنی جو چیز کہ دست بدست لی دی جاوے اُس میں ربا نہیں ہے، یعنی وہ ربا جو اُس آیت کی رو سے حرام ہوا ہے، اس حدیث میں اس بات کی بڑی دلیل ہے کہ دست بدست معاملہ میں جو ربا ہے وہ ربا بیع فاسد کا ہے نہ وہ ربا جو اس آیت میں حرام ہوا ہے۔

امام مالک نے اپنی کتاب مؤطا میں اِس قسم کے معاملہ کو ربا سے تعبیر ہی نہیں کیا بلکہ ہر جگہ بیع سے تعبیر کیا ہے اور درحقیقت یہ معاملہ بیع کا ہے اور جو کہ اِس قسم کے معاملہ میں اکثر یا بایع مغبون ہوتا ہے یا مشتری اور اسلئے بیع فاسد میں شمار ہو سکتا ہے۔

رسول خدا صلعم نے اِس بات سے منع فرمایا کہ زیادہ مقدار کی ناقص کھجوروں کے بدلے کم مقدار کی اچھی کھجوروں کا مبادلہ مت کرو کیونکہ وہ ربا ہے یعنی بیع فاسد کا فائدہ ہے اسلئے کہ دونوں قسم کی کھجوروں کی واقعی قیمت درحقیقت تنقیح نہیں ہوئی پس یا مشتری کا نقصان ہے یا بایع کا نقصان اور اس لئے

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾

یہ فرمایا کہ اگر ایسا کرنا منظور ہے تو بُری کھجوروں کی قیمت مقرر کرکے علٰحدہ بیچ ڈالو اور اچھی کھجوروں کی قیمت مقرر کرکے علٰحدہ خرید لو۔

یہی حال اچھی یا بُری کھری یا کھوٹی چاندی اور سونے کے مبادلہ میں ہے کہ اسطرح کا مبادلہ کرنے میں دونوں قسم میں کسی قسم کی صحیح قیمت منقح نہیں ہوتی لیکن اگر یہ قاعدہ قرار دیا جاوے کہ دو ہمجنس چیزوں کا مبادلہ برابر برابر ہی کیا جاوے تو اس میں کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ نہیں رہتا کیونکہ اگر درحقیقت وہ دونوں ایک سی ہیں تو اُسوقت مبادلہ میں کسی کا نقصان نہیں اور اگر وہ اچھی اور بُری ہیں تو کوئی شخص برابر برابر پر مبادلہ کرنا پسند نہیں کریگا اور ناقص چیز والے کو ضرور ہوگا کہ وہ اپنی چیز واجبی قیمت پر فروخت کردے اور اچھی چیز کو واجبی قیمت پر خرید لے۔

ابن عباس اس قسم کے معاملہ کو اُس ربا میں جسکا ذکر اس آیت میں ہے اور جو اس آیت کی رو سے حرام ہوا ہے داخل نہیں سمجھتے تھے بلکہ اُن کا قول تھا "الاربا الا فی النسیئة وکان یجوز ربا النقد" یعنی وہ کہتے تھے کہ ربا اُدھار کے سوا اور کسی میں نہیں ہے اور دست بدست مبادلہ میں جو ربا ہوتا تھا اُسکو وہ جائز سمجھتے تھے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ اُنکی دلیل یہ تھی کہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اُس میں ایک درہم کو دو درہموں کے بدلے دست بدست بیچنا بھی داخل ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ربا کو حرام کیا ہے اُسمیں اُسطرح کا بیچنا داخل نہیں ہے کیونکہ ربا کے معنی بڑھوتری کے ہیں اور ہر ایک بڑھوتری حرام نہیں ہے بلکہ وہی خاص بڑھوتری حرام ہے جو آپس میں عرب کے لوگوں میں ربا کے نام سے موسوم تھی اور وہ بڑھوتری اُدھار کے معاملہ میں ہوتی تھی پس خدا نے جو یہ فرمایا "وحرم الربا" اُس سے وہی اُدھار والی بڑھوتری حرام ہوئی اور بیع کے حلال کرنے سے وہ بڑھوتری جو نقداً دست بدست ہو حرام نہیں ہوئی اور نہ ربا کے حرام ہونے میں داخل ہوئی اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُسکی حرمت

بیشک جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اچھے کام کیے ہیں اور پڑھتے رہے ہیں نماز اور دیتے رہے ہیں زکوٰۃ انکے لئے انکا بدلا ہے انکے پروردگار کے پاس اور نہ ڈر ہے انپر اور نہ وہ غمگین ہونگے (۲۷۷)

ای لوگو جو ایمان لائے ہو ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو کچھ کہ باقی رہا ہے سود سے اگر تم ایمان والے ہو (۲۷۸)

حدیث کی رو سے ہوئی ہے کیونکہ ایسا کہنے میں ظاہر قرآن کی تخصیص خبر واحد سے ہو جاویگی اور یہ جائز نہیں۔

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ابن عباس نے اپنے اس قول سے رجوع کی ہے مگر میں کہتا ہوں کہ عکرمہ جو انکے خاص شاگرد رشید تھے اور انھیں کے پاس رہتے تھے اور انہیں سے تربیت پائی تھی انکو ابن عباس کے رجوع کی خبر نہ تھی اور اس سبب سے وہ روایت جسمیں ابن عباس کا رجوع کرنا بیان کیا گیا ہے نہایت مشتبہ ہو جاتی ہے بہرحال اگر ابن عباس کا رجوع کرنا بھی تسلیم کیا جاوے تو اسکا صرف یہ نتیجہ ہوگا کہ بیع فاسد سے جو ربا ہوا اسکو ابن عباس پہلے جائز سمجھتے ہونگے پھر انہوں نے اسکو ناجائز سمجھا نہ یہ کہ انھوں نے اس معاملہ کو اس ربا میں داخل کیا جسکا ذکر اس آیت میں ہے۔

ربا النسئۃ وہ ہے جو عرب کے لوگوں میں زمانہ جاہلیت میں مشہور اور معروف تھا اور وہ یہ تھا کہ ایک شخص دوسرے شخص کو کچھ مال دیتا تھا اس اقرار پر کہ مدیون ہر مہینہ ایک مقدار معین اسکو دے اور راس المال بدستور مدیون کے ذمہ باقی رہے جب وعدہ ادائے راس المال کا گذر جاتا تھا تو دائن پورا روپیہ اپنا طلب کرتا تھا اور اگر وہ نہ دے سکتا تھا تو میعاد بڑھا دیتا تھا اور راس المال کو بھی بڑھا دیتا تھا اور اس پر ہر مہینے ایک مقدار معین لیتا تھا پس جو مقدار کہ ماہواری لیجاتی تھی یا جو اضافہ کہ راس المال میں کیا جاتا تھا اسی پر عرب جاہلیت ربا کا اطلاق کرتے تھے اور اسی کی حرمت اس آیت میں آئی ہے اور لفظ "حرم الربا" سے یہی خاص ربا حرام ہوا ہے۔

یہ طریقہ ربا کا جو عرب جاہلیت میں جاری تھا بعینہ ہندوستان کے سود خواروں میں جاری ہے کہ وہ ایک شخص کو روپیہ قرض دیتے ہیں اور اس پر ماہواری یا ششماہی سود لیتے ہیں اور اگر وہ میعاد پر ادا نہیں ہوتا تو اس سود کو بھی اصل میں داخل کر دیتے ہیں اور مجموع اصل و سود پر پھر سود لیتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میعاد ادا منقضی ہونے پر دوسری میعاد بڑھا دیتے ہیں اسطرح پر کہ میعاد

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۚ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾

بڑہانے کی عوض کبھی کچھ نقد روپیہ لے لیتے ہیں اور کبھی مقدار اصل کو زیادہ کر دیتے ہیں اور ایسا بھی کرتے ہیں کہ تمامہ ایک میعاد معین کے لئے قرض دیتے ہیں اور یہ اقرار کرتے ہیں کہ جتنا دیا ہے اُسکا ڈیوڑہا یا دگنا لینگے اور جب میعاد پر ادا نہیں ہوتا ہے تو اُس اضافہ کو بھی اصل میں شامل کر کے میعاد بڑہا دیتے ہیں اور اُس مجموعہ پر ڈیوڑہا یا دوگنا لینے کا اقرار کرتے ہیں یہ سب صورتیں اُس ربا کی ہیں جسکا ذکر اِس آیت میں ہے اور بلاشبہ یہ ربا حرام ہے۔

ربا النسیئة کے اب یہہ معنی ٹھیرے کہ مدیون سے علاوہ زر اصل کے کچھ روپیہ یا مال بطور فائدہ کی لینا مگر ایک بحث اور باقی رہ جاتی ہے کہ عموماً ایسا کرنا حرام اور ممنوع ہے اور اُسکا کرنے والا ہر حالت میں اُنہیں وعیدوں کا مستحق ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہیں یا کسی اور قسم کی بھی قید یا تخصیص قرآن مجید سے پائی جاتی ہے علماے اسلام کی یہ راے ہے کہ اسمیں کسی قسم کی قید یا تخصیص نہیں ہے مگر میں قرآن مجید کی رو سے ایسا نہیں سمجھتا بلکہ میری یہہ سمجھ ہے کہ قرآن مجید کی رو سے اس قسم کے ربا کے حرام ہونے میں بھی ایک تخصیص پائی جاتی ہے جو آیندہ بیان ہوگی۔

ربا درحقیقت ایک نہایت بُری چیز ہے اور انسانی اخلاق اور تمدن کے لئے بعضی حالتوں میں نہایت مضر ہے۔ ربا جبکہ ایک پیشہ کر لیا جاتا ہے جیسے کہ سود خوار ہٹیئ اور مہاجن بطور پیشہ کے اُسکو برتتے ہیں تو تمدن کے لئے نہایت مضر ہوتا ہے، ذی مقدور شخص اُس روپیہ کو ملک کی ترقی اور تجارت کی افزونی میں صرف نہیں کرتا بلکہ خود اپنے ہی ملک کے لوگون سے اُنکا مال لے لینے میں صرف کرتا ہے، وہ اپنی محنت اور مشقت سے معیشت پیدا کرنے میں بالکل سُست ہو جاتا ہے اور لوگوں نے جو محنت اور مشقت سے کمایا ہے

پھر اگر تم نہیں کرتے تو اجازت دو لڑائی کرنے کی اللہ سے اور اسکے رسول سے اور اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے تمہارا راس المال ہے (یعنی زر اصل) نہ تم ظلم کروگے اور نہ تم پر ظلم کیا جائیگا (۲۷۹) اور اگر کوئی (یعنی مقروض) تنگ دست ہو تو انتظار کرنا چاہیئے فراخی تک اور تمہارا خیرات کر دینا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو (۲۸۰)

ہے اُسکے لے لینے پر راغب ہوتا ہے، اُسکے مال و دولت سے کوئی صنعت یا کوئی ایسا کارخانہ جس سے لوگونکو معیشت میں مدد پہونچے اور ملک کی دولت کو ترقی ہو نہیں قایم ہوتا بجز اسکے کہ غریبون سے اُنکی محنت و مشقت کے حاصلات کے چھین لینے کا اُسکو قابو ملتا ہے، اور کچھ شبہہ نہیں کہ ایسا ربا اخلاق و معاشرت و تمدن کے برخلاف ہے۔

ایک اور صورت ربا کی ہے جو اس سے بھی زیادہ اخلاق انسانی اور روحانی نیکی کے برخلاف ہے اور بلاشبہہ حرب من اللہ و رسولہ کی برابر ہے اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ غریب و محتاج و مفلس ہیں اور نہ کسی عیش و آرام کے لئے بلکہ صرف اپنی زندگی کے لئے قوت لایموت بہم پہونچانے کو روپیہ یا غلہ قرض لیتے ہیں اور ذی مقدور سودی قرض اُن کو دیتے ہیں اور سود لیتے ہیں۔ ایسا کرنا انسانی ہمدردی اور غریبوں کے ساتھ سلوک کرنے کے بالکل برخلاف ہے حالانکہ قرآن مجید میں اُنکے ساتھ سلوک کرنیکا جابجا حکم ہے۔ ایسے لوگوں سے سود لینا شقاوت قلبی اور بدترین اخلاق ہونیکے سوا قرآن مجید کی مستحکم ہدایتون کے بھی برخلاف ہے اور کوئی شخص شبہہ نہیں کرسکتا کہ ایسا ربا نہایت بد اور ناپاک ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ ایسے ہی ربا کا اس آیت میں ذکر ہے جسکو خدا نے منع فرمایا ہے اور حرام کیا ہے اور کوئی انسانی دل جو ذرا بھی روحانی اخلاق کی طرف مائل ہوگا ایسا نہ ہوگا جو اس قسم کے ربا کو حرام و ناپاک نہ سمجھتا ہو۔

میری اس سمجھ پر جو کچھ شبہہ ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ "حرم اللہ الربا" جو ایک عام حکم تھا اُسکو میں نے خاص کر دیا ہے اور اُسی ربا پر منحصر کر دیا ہے جو ایسے لوگوں سے لیا جاوے

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۲۸۱)

جن کے ساتھ سلوک کرنے اور اُن کے ساتھ ہمدردی کرنے کی قرآن مجید میں ہدایت ہوئی ہے مگر ہم بے دلکو یقین ہے کہ قرآن مجید کے تمام سیاق و سباق کلام سے یہی ہدایت پائی جاتی ہے۔

ربا کی آیت سے پہلی آیتوں میں خدا تعالیٰ نے خدا کی راہ میں مال خرچ کرنیوالوں کی خوبیوں کو بیان کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اُسکی مثال ایک ایسے دانہ کی ہے جو اُگے اور اُس میں سات خوشے لگیں اور ہر خوشے میں سو سو دانے ہوں۔ پھر اُنکو نصیحت کی کہ غریب و محتاجوں کے ساتھ جو تم سلوک کرتے ہو اُسکو احسان جتانے سے اور اُن کا دل دکھانے سے برباد مت کرو اور اُسکی مثال ایسے شخص کی تباہی جسکا ہرا بھرا باغ آگ سے جل گیا ہو۔ پھر اُنکو سمجھایا کہ غریبوں اور مسکینوں کو جو خدا کے لیئے دیتے ہو وہ اپنے ہی لیئے دیتے ہو اور وہ تمھیں پہونچے گا۔

اِسکے بعد خدا تعالیٰ نے اُن لوگوں کا ذکر کیا ہے جو غریب اور مسکین لوگوں پر مال خرچ کرتے ہیں اور اُنکے ثواب کا بیان کیا اور اُسی کے ساتھ اُن لوگوں کا ذکر کیا جو بعوض سلوک و ہمدردی کرنے کے سود لیتے ہیں۔ پس قرینہ مقام و طرز کلام سے صاف پایا جاتا ہے کہ اس آیت میں انہی لوگوں کا ذکر ہے جو غریب مسکین لوگوں سے سود لیتے تھے اور اُسی سود کو جو ایسے لوگوں سے لیا جاتا تھا جو قابل رحم اور ہمدردی اور سلوک کرنے کے تھے خدا نے حرام کیا اور فرمایا کہ "حرم الربوا"، اور پھر فرمایا کہ "یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقات" اور پھر فرمایا کہ اے ایمان والو جو کچھ سود کا لینا باقی رہ گیا ہے اُسکو چھوڑ دو اور اگر نہیں چھوڑتے تو خدا و رسول سے لڑنے کو طیار رہو کیونکہ خدا و رسول نے تو اُنکے ساتھ سلوک کرنے کی ہدایت کی ہے اور تم اُسکے برعکس اُنسے سود لیتے ہو، خدا کے حکم کے برخلاف کرنا خدا سے لڑائی کرنی ہے پس تم کو چاہیے کہ

اور ڈرو اُس دن سے جس میں خدا کی طرف ... گے پھر پورا دیا جائیگا ہر
شخص کو جو کچھ اُسنے کمایا ہے اور وہ مظلوم نہ ہونگے (۲۸۱)

اُنسے اپنا اصل مال لیلو اور اگر کوئی ایسا محتاج ہو کہ اصل دینے کا بھی مقدور نہ رکھتا ہو تو اُسکو مہلت دو تاکہ جب اُسکو فراغت ہو ادا کرے اور اگر اصل بھی چھوڑ دو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ پس جسقدر آیتیں کہ قبل آیت ربا کے ہیں اور جسقدر کہ اُسکے بعد ہیں اُن سب کو ملانے اور سیاق و سباق کلام پر نظر کرنے سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہی ربا حرام کیا گیا ہے جو ایسے غریب و محتاج آدمیوں سے لیا جاتا تھا جو کھانے کو محتاج تھے اور غلہ یا کھجوریں یا اور کچھ قرض لیکر قوت لایموت بہم پہونچاتے تھے اور جنکی نسبت قرآن مجید میں جابجا سلوک و ہمدردی کرنیکی ہدایت تھی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی شخص گو کہ وہ کوئی مذہب رکھتا ہو ایسے ربا کو ناپاک و حرام نہ سمجھتا ہو۔

اِنکے سوا وہ لوگ ہیں جو ذی مقدور اور صاحب دولت و جاہ و حشمت ہیں اور اپنے عیش اور آرام کے لئے روپیہ قرض لیتے ہیں جائداد مول لیتے ہیں مکان بناتے ہیں اور قرض روپیہ لیکر چین اڑاتے ہیں گو اُنکو قرض دینا بعض حالتوں میں خلاف اخلاق ہو مگر اُنسے سود لینے کی حرمت کی کوئی وجہ قرآن مجید کی رو سے مجھکو نہیں معلوم ہوتی۔

اسیطرح بہت سے معاملات قرضہ کے ہیں جو تجارت کے کاروبار میں پیش آتے ہیں اور اُن بنکوں کے قایم ہونے سے جو سود پر تجارت کے مقاصد کے لئے روپیہ قرض دیتے ہیں اور ایک جگہہ سے دوسری جگہہ روپیہ پہونچا دیتے ہیں اور ہر قسم کی آڑتون کا کام کرتے ہیں اور جنسے تجارت کو اور ترقی ملک کو اور فزونی آبادی کو نہایت امداد پہونچتی ہے اُن معاملات میں جو سود کہ لیا و دیا جاتا ہے مجھکو قرآن مجید کی رو سے اُسکے ایسے ربا ہونیکی جسکو اس آیت میں حرام کیا ہے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی پس حکم ربا کا جو قرآن مجید میں ہے وہ نہایت اخلاق و نیکی پر مبنی ہے اور کسی طرح ترقی تجارت و ترقی ملک و دولت کا مانع نہیں ہے فقہا نے بلاشبہ اپنے اجتہاد اور قیاس سے ایسی قیدیں بڑہا دی ہیں جنسے ربا کا حکم تجارت کی ترقی کا مانع قوی ہو گیا ہے مگر قرآن مجید سے ایسا نہیں پایا جاتا مفتی شرف الدین رامپوری

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ

اور مولوی برہان الدین صاحب نے اپنے رسالوں میں ربا کو صرف جنس کے دست بدست مبادلہ میں منحصر کیا تھا جسکو ربا الفضل کہتے ہیں اور نسیہ یعنی قرضہ میں ربا نہیں قرار دیا تھا مگر میری رائے اسکے برخلاف ہے جیسے کہ اوپر بیان ہوا۔

اب میں اپنی رائے سے قطع نظر کرتا ہوں اور کتب فقہ اور مسائل مسلمہ فقہہ کو تسلیم کر کے مندرجہ ذیل معاملات پر جو اس زمانہ میں اکثر پیش آتے ہیں نظر ڈالتا ہوں کہ اگر فقہ ہی کی روایتوں پر عمل کیا جاوے تو فقہ کی رو سے بھی معاملات مندرجہ ذیل کے سود پر ربائے ناجائز کا اطلاق ہو سکتا ہی یا نہیں

اول گورنمنٹ پرامیسری نوٹ۔ اگرچہ مولانا شاہ عبد العزیز صاحب نے گورنمنٹ پرامیسری نوٹ کے سود کے مباح ہونیکا فتویٰ دیا ہے مگر جس اصول پر وہ فتویٰ دیا گیا ہے میری رائے میں وہ اصول صحیح نہیں ہیں بلکہ فقہ مسلمہ کی رو سے پرامیسری نوٹ کے سود کے جائز ہونے کی اور وجہ ہے۔

فقہ کے اِس مسئلہ کو کہ "کل قرض جرّ نفعًا فھو ربوٰا" تسلیم کرو تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جس قرضہ میں بڑھوتری ملے وہ ربا ہے۔ قرضہ کے متحقق ہونے کو تین رکن ضروری ہیں اگر ایک رکن بھی اُس میں موجود نہو تو اُس پر قرضہ کا اطلاق نہوگا اور اُسکی بڑھوتری ربائے ناجائز نہ ہوگی اور وہ رکن یہ ہیں ۔اول۔ دائن یا دائنان کا محقق و مشخص ہونا۔ دوم۔ مدیون کا محقق و مشخص ہونا۔ سوم۔ دائن کو حق طلب باقی ہونا گورنمنٹ پرامیسری نوٹ میں جس میں زمانہ ادا موعود نہیں ہے اُن ارکان ثلاثہ میں سے دو رکن مفقود ہیں ایک مدیون کیونکہ اُس میں کوئی شخص معین و مشخص مدیون نہیں ہے بلکہ صرف ایک مفہوم جسکو گورنمنٹ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں مدیون ہے جو فقہ کی رو سے صلاحیت مدیون قرار پانے کی نہیں رکھتی۔ دوسرے حق طلب اسلئے کہ دائن کو اُس قرضہ کے طلب کا حق نہیں ہے اور جن پرامیسری نوٹوں میں میعاد ادا موعود ہے اُنمیں حق طلب ساقط نہیں ہے الا مدیون بدستور غیر متعین و غیر مشخص ہے پس جو بڑھوتری کہ اُن پرامیسری نوٹوں کے ذریعہ سے حاصل ہو وہ فقہ کی رو سے

اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم لین دین کرو قرض کا کسی مقررہ میعاد تک تو اُسکو لکھ لو اور چاہیئے کہ تمھارے بیچ میں کوئی لکھنے والا انصاف سے لکھ لے

ربا نہیں قرار پاسکتی۔

ہمارے زمانہ کے علماء پرامیسری نوٹونکی بڑھوتری پر ربا ہونے یا نہ ہونے کا حکم دیں یا نہ دیں مگر ہمارے زمانہ میں دہلی میں بعینہ مثل پرامیسری نوٹ کے ایک معاملہ پیش آیا تھا اور تمام علمائے دہلی نے جو اُس زمانہ تک بڑے بڑے مقدس لوگ موجود تھے اُسکے جواز کا فتویٰ دیا تھا اور وہ واقعہ یہ تھا کہ بہادر شاہ بادشاہ نے یہ قاعدہ نکالا تھا کہ جو کوئی شخص بادشاہ کو کچھ روپیہ بطور نذرانہ کے دے تو اُس شخص کی تنخواہ اُس روپیہ کے سود کی برابر مقرر ہو جاوے جس شخص نے روپیہ دیا اُسکو روپیہ کو واپس مانگنے کا اختیار نہ رہتا تھا اور نہ بادشاہ کو تنخواہ معینہ کے بند کر دینے کا، ہاں یہ بات بادشاہ کی مرضی پر منحصر تھی کہ اگر وہ تنخواہ معینہ بند کرنی چاہیں تو وہ روپیہ جو بنام نہاد نذرانہ لیا ہے اُس شخص کو واپس کر دیں اکثر ایسا اتفاق ہوا ہے کہ مثلاً ایک شخص نے بادشاہ کو ہزار روپیہ نذرانہ اِس شرط پر دیا کہ دس روپیہ مہینے کی تنخواہ اُسکی مقرر ہو جاوے بادشاہ نے منظور کیا اور تنخواہ مقرر کر دی۔ دوسرا ایسا شخص آن موجود ہوا کہ ہزار روپیہ نذرانہ اس شرط پر دینے کو راضی تھا کہ بادشاہ پانچ روپیہ ماہواری اُسکا مقرر کر دیں بادشاہ نے ہزار روپیہ اُس سے لیا اور پہلے شخص کا روپیہ واپس کر دیا اور دس روپیہ تنخواہ اُسکی بند کر دی اور اُس میں سے پانچ روپیہ اس دوسرے شخص کی تنخواہ مقرر کر دی اور پانچ روپیہ جو بچے اُسکی بھی کسی تیسرے شخص سے نذرانہ لے کر اُسکی تنخواہ میں مقرر کر دئے۔

یہ معاملہ پرامیسری نوٹ کے معاملہ سے بھی زیادہ مشتبہ ہے کیونکہ جو حالت بادشاہ کی مثل ایک پنشن دار شخص کے تھی اُسکے لحاظ سے بادشاہ بذات خود مدیون متصور ہوتے تھے اور اسلئے اس معاملہ میں دو رکن موجود تھے یعنی دائن و مدیون البتہ صرف تیسرا رکن حق طلب معدوم تھا پس اس معاملہ کی بڑھوتری کو تمام علمائے دہلی ربا نہیں سمجھتے تھے اور اگر میری یاد میں غلطی نہو تو بڑے بڑے مقدس مولویوں نے اس قسم کا نذرانہ دیکر تنخواہیں اپنی اور اپنے قرابت مندونکی مقرر کرائی تھیں پس میں نہیں سمجھ سکتا کہ اگر یہ بڑھوتری سود ناجائز نہ تھی تو پرامیسری نوٹ کی بڑھوتری کیوں سود ناجائز قرار پاسکتی ہے۔

وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ
الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا فَاِنْ
كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ
فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ
فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ
اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى وَلَا يَاْبَ
الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا وَلَا تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ
كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ
اَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ
عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا
شَهِيْدٌ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ بِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ بِكُلِّ
شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲۸۲)

دوئیم معاملات ترقی ملک۔ مثلاً گورنمنٹ یا کوئی جماعت محدود اس غرض سے روپیہ قرض لے کہ اُس روپیہ سے ایک نہر آبپاشی کے لئے یا آہنی سڑک آمدورفت کے لئے جاری کرے اور وائن کو اُس قرضہ کی بابت سود دینا قبول کرے تو وہ بھی ربا ممنوع میں جسکا ذکر اس آیت میں ہے داخل نہیں ہے کیونکہ وہ اس قسم کا قرضہ نہیں ہے جسپر ربا ممنوع ہے۔

اور انکار نہ کرے لکھنے والا یہ کہ لکھے جیسا کہ سکھایا ہے اُسکو اللہ نے پس چاہیئے کہ لکھے وہ شخص جسکے اوپر حق (یعنی قرض) ہو اور چاہیئے کہ ڈری اپنے پروردگار اللہ سے اور نہ نقصان کری اُس میں سے کچھ پس اگر وہ شخص جس پر حق (یعنی قرض) ہی بیوقوف ہو یا ضعیف ہو یا خود تحریر نہ کرسکتا ہو پس چاہیئے کہ لکھے اُسکا ولی انصاف سے اور گواہ کرلو دو گواہوں کو مردوں میں سے پس اگر دو مرد نہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں اُن لوگوں میں سے جن پر تم راضی ہو گواہوں میں سے (تاکہ) اگر بھول جاوی ایک اُن دونوں میں کا تو اُن دونوں میں کا ایک دوسرے کو یاد دلادی اور انکار نہ کرنا چاہیئے گواہوں کو جبکہ وہ طلب کئے جاویں اور نہ کاہلی کرو اُسکے لکھنے میں اُسکی میعاد تک چھوٹی ہو یا بڑی یہ تمہارے لئے زیادہ انصاف ہے اللہ کے نزدیک اور زیادہ قوی ہے گواہی کیلئے اور قریب تر ہے کہ شک میں نہ پڑو مگر جبکہ تجارت کا لین دین ہو اور باہم دست بدست اُسکو پھیراتے ہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں ہی کہ اُسکو نہ لکھو اور گواہ کر لو جبکہ تم خرید فروخت کرو اور نہ ضرر پہنچایا جاوے لکھنے والا اور نہ گواہ اور اگر تم کرو تو بیشک وہ تمہاری بداعمالی ہی اور ڈرو اللہ سی اور سکھاتا ہی تمکو اللہ اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہی (۲۸۲)

سوم معاملات رفاہ عام۔ فرض کرو کہ کسی شخص یا جماعت نے ایک سرمایہ اس غرض سے جمع کیا ہے کہ اُسکے محاصل سے عام رفاہ کے کام کئے جاوینگے وہ سرمایہ فقہ کی رو سے وقف ہے اور وہ شخص یا جماعت صرف امین یا متولی وقف ہے اُس سرمایہ کی ملکیت نہیں رکھتی پس اگر وہ سرمایہ بالفرض کسی کو سودی قرض دیا جاوے تو وہ بھی ربائے ممنوع میں داخل نہیں ہو سکتا۔

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَإِنْ أَمِنَ
بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا
تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَإِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْأَرْضِ ؕ وَإِنْ تُبْدُوْا مَا فِىٓ أَنْفُسِكُمْ
أَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ
وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ
وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ
بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۟ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا
وَإِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ
وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِنْ نَّسِيْنَآ أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ رَبَّنَا
وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا
تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟
أَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

سبب اسکا یہ ہے کہ جو اصول و قواعد جماعت محدود کے لئے اس زمانہ میں مروج ہیں انکی رو سے وہ جماعت محدود
اپنی ذات سے اس قرضکی مدیون نہیں ہوتی اور نہ انکی ذات دائن ہوتی ہے اور یہی حال اس شخص یا جماعت کا ہے

اور اگر تم سفر پر ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا گرو ہی ہے (مرتہن کے) قبضہ میں دی ہوئی پھر اگر امین جانیں بعض تم میں کے بعض کو پس چاہیئے کہ ادا کرے اُس شخص کو اُسکی امانت جسکو امین جانا ہے اور چاہیئے کہ ڈرے اپنے پروردگار اللہ سے اور مت چھپاؤ گواہی کو اور جو کوئی چھپاویگا اُسکو تو بیشک اُسکا دل گنہگار ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو جانتا ہی (۲۸۳) خدا کیلئے ہی جو کچھ آسمانوں میں ہی اور جو کچھ زمین میں اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ کہ تمہاری دلوں میں ہی یا اُسکو چھپاؤ تم سے اللہ اُسکا حساب لیگا پس بخشے گا جسکو چاہیگا اور عذاب دیگا جسکو چاہیگا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہی (۲۸۴) ایمان لایا پیغمبر جو اتاری گئی ہے اُس پر اُسکے پروردگار سے اور سب ایمان لانیوالے ہیں ہر ایک ایمان لایا اللہ اور فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں پر نہیں فرق کرتے ہم درمیان کسی ایک کے اُسکے رسولوں میں سی اور اُنھوں نے کہا ہمنے سُنا اور ہمنے اطاعت کی اے ہمارے پروردگار تیری بخشش چاہتے ہیں اور تیری پاس پھر جانا ہے (۲۸۵) نہیں تکلیف دیتا اللہ کسی کو مگر بقدر اُسکی طاقت کے اُسکے لئے ہے وہ جو اُسنے کمایا اے پروردگار ہمارے ہمکو مت پکڑ اگر ہمنے بھول یا ہمنے چوک کی ہے ای پروردگار ہماری اور مت رکھ ہم پر بھاری بوجھ جسطرح کہ تونے اُسکو اُن لوگوں پر رکھا جو ہم سے پہلے تھے ای پروردگار ہماری اور مت رکھ ہم پر وہ چیز جسکی برداشت کی ہمکو طاقت نہیں اور بخش دی ہمکو اور مہربانی کر ہم پر تو ہی ہمارا مولیٰ ہے پھر مدد کر ہماری کافروں کی قوم پر (۲۸۶)

جو کسی سرمایہ وقف کا متولی یا امین ہے پس اِن دونوں صورتوں میں یا دائن مشخص و معین نہیں ہی یا مدیون مشخص و معین نہیں ہی اور اسلئے اُسپر ایسے قرضہ کا ہونا جسپر سود لینا ممنوع ہی صادق نہیں آتا اور اِسلئے اُسپر ربا بھی ممنوع نہیں ہے

ت م ت

اشتہار چھپائی مطبع مفید عام آگرہ
خدا کے فضل و کرم سے اس مطبع مین ہر قسم و ہر زبان کی کتابین اُردو و ہندی
فارسی۔ عربی۔ نہایت خوشخط صحیح و عمدہ جلدار ارزان نرخ پر عمدہ سیاہی مصالحہ
سے لیتھو مین طبع ہوتی ہین۔ عدالتون و محکمہ بندوبست اور جنگی وغیرہ
کے جملہ کاغذات بہی چہپتے ہین یہ نامی مطبع ۳۵ پینتیس برس سے اپنے
فرائض منصبی کو نہایت ایمانداری اور خوش معاملگی سے ادا کر رہا ہے اور
اسکی شہرت و نیک نامی روز افزون ہے اور اس مطبع مین کتب بہ نسبت
اور مطابع کے بہت خوشخط و صاف و عمدہ چہاپی جاتی ہین جن صاحبون کو
کچھ چہپوانا ہو انکو کیفیت نرخ وغیرہ کی خط و کتابت سے معلوم ہو سکتی ہے
نمونہ کے لئے ہمارے مطبع کی چہپی ہوئی کتابین کافی و وافی ہین فقط۔
المشتہر
محمد قادر علیخان صوفی مالک و مہتمم مطبع مفید عام آگرہ